عرب ممالک

اور

صوبۂ گجرات کے تعلقات

﴿ معاون ﴾

مولانا رشید احمد منوبری صاحب

استاذ دارالعلوم اسلامیہ عربیہ ماٹلی والا، بھروچ

﴿ مؤلف ﴾

(حضرت مولانا) اقبال محمد ٹنکاروی (صاحب دامت برکاتہم)

مہتمم دارالعلوم اسلامیہ عربیہ ماٹلی والا، بھروچ

گجرات، الہند-۳۹۲۰۰۱



نام کتاب : عرب ممالک اور صوبۂ گجرات کے تعلقات

تالیف : حضرت مولانا اقبال بن محمد ٹنکاروی صاحب

ناشر : مکتبہ أبوبکر ربیع بن الصبیح البصری (البروصی)
دار العلوم اسلامیہ عربیہ ماٹلی والا
عیدگاہ روڈ، بھروچ، گجرات، الہند

تعداد صفحات : ۴۸۴

کمپیوٹر کتابت : مولوی محمد یٰسین بن ابراہیم کرماڈی
خادم دار العلوم ہذا

سن طباعت : ۱۴۳۳ھ، مطابق ۲۰۱۲ء

ایڈیشن : پہلا

قیمت : ۲۰۰



مکتبہ أبوبکر ربیع بن الصبیح البصری (البروصی)

دار العلوم اسلامیہ عربیہ ماٹلی والا، عیدگاہ روڈ، بھروچ

گجرات، الہند-۳۹۲۰۰۱

از: مفکر ملت، رئیس فلاح دارین ترکیسر

حضرت مولانا عبداللہ صاحب کاپودروی دامت برکاتہم

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

محترم المقام مولانا محمد اقبال ٹنکاروی صاحب زید مجدکم

(استاذ حدیث، مدیر مجلّہ پیغام رحمت ومہتمم دارالعلوم اسلامیہ عربیہ ماٹلی والاحفظہ اللہ تعالیٰ ورعاہ)

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آپ کا الطاف نامہ، تاریخ گجرات کا مقدمہ اور رسالہ پیغام رحمت موصول ہوکر باعث مسرت اور معلومات میں اضافہ کا ذریعہ بنا۔ فجزاکم اللّٰہ احسن الجزاء.

آپ نے گجرات کی علمی تاریخ کا مقدمہ اور فہرست ارسال فرمائی ہے، اس کو دیکھ کر بہت خوشی ہوئی، اگر یہ کتاب تیار ہوکر طبع ہوجائے گی تو گجرات کی علمی حیثیت پر قدیماً وحدیثاً جو مواد اس میں ملے گا وہ شاید بہت سی کتابوں کی ورق گردانی کے بعد بھی ملنا آسان نہیں ہوگا، اللہ تعالیٰ آپ کی محنت کو شرفِ قبولیت عطا فرماوے۔ (آمین) یہ کتاب اردو اور گجراتی دونوں زبانوں میں طبع ہونی چاہیئے۔

بندہ نے بہت سال پہلے ایک مضمون مجلّہ ''معارف اعظم گڑھ''میں بھیجا تھا، ''شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ سے پہلے گجرات میں علم حدیث'' وہ بھی نظر سے گزرا ہوگا، شاید''افکار پریشاں''میں مل جائے گا؛ ملاحظہ فرمالیں۔

آپ دارالعلوم کی انتظامی اور درسی ذمہ داریوں کے ساتھ یہ علمی کام بھی کررہے ہیں، یہ اللہ تعالیٰ کی توفیق خاص ہے، اللہ تعالیٰ مزید توفیق عطا فرماوے اور ہم سب کے لئے مغفرت کا ذریعہ بناوے۔ آمین ثم آمین!

"زجاجة المصابيح" کا کام بھی برابر جاری ہوگا، اللہ تعالیٰ بحسن وخوبی اس کی تکمیل کرادے۔

بس اس دورافتادہ کے لئے دعا فرما کر احسان فرماویں۔ آپ کی یاد آتی رہتی ہے، اپنی خصوصی دعاؤں میں فراموش نہ فرماویں۔

جملہ احباب ومتعلقین کی خدمت میں سلام مسنون عرض ہے۔

والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

اخوکم فی اللہ عبداللہ غفرلہ کاپودروی

حال مقیم ٹورنٹو، کینیڈا ۲۱/ شعبان المعظم ۱۴۳۳ھ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نمبر	مضامین	صفحہ نمبر

===========================

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للّٰہ رب العالمین، والصلاۃ والسلام علی سید الانبیاء والمرسلین ،

وعلی آلہ وصحبہ اجمعین . اما بعد!

انگریزوں نے اپنے دوراقتدار میں جس طرح ہندوستان کولوٹااور تباہ کیا وہ محتاج بیان نہیں اوراسی کے ساتھ انہوں نے نفرت اور منافقت کی جو تخم ریزی کی اس سے بھی چشم پوشی نہیں کی جاسکتی ،اس گھناؤنی سازش کا ایک پہلو مسلمانان ہند کی صحیح تاریخ سے کھلواڑ بھی ہے، انگریزوں نے اپنے مخصوص مقاصد کے پیش نظر ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد محمد بن قاسم کی فتح سندھ یا محمود غزنوی کے حملوں کے ساتھ جوڑی ہے،جس سے ان کا منشا یہ تھا کہ ہندوستان سے مسلمانوں کا تعلق محض حملہ آورانہ اور فاتحانہ ثابت ہو،اس سے قبل کی تاریخ پر انہوں نے تعصب کا نقاب ڈال دیا،جس کی نقل دیگر مؤرخین نے بھی کی ،نتیجۃً آج تک عوام اورنئی نسل اس تاریخ کواسی پس منظر میں دیکھتی ہے جوانگریزوں نے گھڑی تھی ، جب کہ حقیقت یہ ہے کہ سندھ ملتان کی فتح سے بہت پہلے ہندوستان سے مسلمانوں کے علمی ، مذہبی ،تہذیبی ،ثقافتی اورتجارتی روابط قائم تھے۔

عرب سیاح ورواد نے اپنے سفرناموں میں مجموعی طور پر ہندوستان کی تمام چیزوں سے دل چسپی کا اظہار کرتے ہوئے ان کا تذکرہ کیاہےاوراسی ضمن میں گجرات کا تذکرہ بھی طبعی طور پرآنالازمی تھا،لہذا گجرات کے سلسلہ میں بھی کافی معلومات فراہم کی ہے۔

گجرات چوں کہ ہندوستان کا ایک اہم جغرافیائی صوبہ ہے لہذا اس کا مستقلا بھی ذکرکیاہے،اس کے راجہ مہاراجاؤں ،شہروں ،لوگوں کا رہن سہن ،غذائیات ،رواجات ،تہوار، جانوروں ،پرندوں ، مذہبی عقائدورسومات اورمختلف فرقوں کے تذکرے عرب مؤرخوں نے

بڑی فراخ دلی سے دلچسپی کا ثبوت پیش کرتے ہوئے کئے ہیں، ہندوستان کے سلسلہ کی عمومی معلومات میں بھی گجرات کے احوال کا ذکر ضمناً کیا گیا ہے، کچھ واقعات واحوال کا ذکر کرتے ہوئے گجرات کا صراحۃً تذکرہ نہیں کیا گیا؛ لیکن سیاق وسباق اور دیگر تاریخی شواہد کی روشنی میں اس کا گجرات سے متعلق ہونا ثابت ہوتا ہے۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان وزارت ترقی انسانی وسائل حکومت ہند نے اردو زبان کے دائرہ کو وسیع کرنے کے لئے مختلف موضوعات پر کتابیں شائع کرائی ہیں، تاریخ ہند کے موضوع پر بھی بہت سی کتابیں منظر عام پر آئی جن میں ہندوستانی مصنفین کے ساتھ یورپین مصنفین کی بھی کتابیں شامل ہیں، ان میں بہت سی نئے انداز اور فنی مہارت کا ثبوت دینے والی کتابیں بھی شامل ہیں، جنہوں نے تاریخ کے بہت بڑے خلا کو پر کیا ہے؛ لیکن ان کتابوں میں سے کچھ کتابوں میں تمدن ہند پر گفتگو کرتے ہوئے مسلمانوں کے متعلق وہی پرانی کہانی دوہرائی گئی اور ملک کی تعمیر میں ان کا نام بر سبیل تذکرہ ہی کیا گیا۔

تاریخ کا وہ حصہ جس کا تعلق مسلمانوں سے تھا اور جن موضوعات پر مسلمان قدیم مؤرخین نے بہت تفصیل سے لکھا ہے ان میں کچھ مؤرخین تو ان واقعات واحوال کے چشم دید گواہ بھی ہیں، ان کے بیان کے بجائے ماضی قریب کے یورپین مؤرخین کی باتوں کو قابل قبول سمجھ کر اردو زبان میں بھی انگریزی وہندی والا تعصب داخل کیا جارہا ہے؛ تاکہ اردو پڑھنے والی ہماری نوجوان نسل بھی صحیح تاریخ کے بجائے انگریزوں کی لکھی ہوئی تاریخ کو ہی معتبر سمجھے اور مسلم بادشاہوں، علماء اور دانشوروں کے بارے میں وہی خیالات رکھیں، جو اردو سے ناواقف حضرات رکھتے ہیں۔

رابطۂ ادب اسلامی (گجرات) نے اپنے اس سال کے اجلاس کے لئے ''عرب

ممالک اور گجرات کے روابط'' موضوع پر اہل قلم کو دعوت دی تھی، اس عاجز نے بھی اس عنوان پر کچھ خامہ فرسائی کی تھی، مضمون طویل ہوگیا تو اس کو کتابی شکل میں شائع کرنے کا ارادہ کیا، علمی روابط شامل کرنے کی غرض سے عزیز مکرم مولانا رشید منوبری صاحب کو مواد کی فراہمی ونشاندہی کی گئی، مولانا محترم نے الحمدللہ سلیقہ مندی سے ان کو باحسن وجوہ ترتیب دیا، وہ کتاب کا ایک اہم وخصوصی موضوع ہے۔

گجرات وعرب ممالک کے تعلقات کو مختلف عنوانات سے واضح کیا ہے:

عرب وہند کے مختصر تعلقات، گجرات کی مختصر سیاسی تاریخ، گجرات کی مختصر تجارتی حیثیت، گجرات کی مختصر جغرافی حیثیت، عرب کا جغرافیہ، عرب وگجرات کے تجارتی تعلقات، عرب وگجرات کے دعوتی وسیاسی تعلقات، حرمین شریفین سے گجرات کے والہانہ تعلقات، گجرات عربوں کی نظر میں، گجرات اور عربوں کے دعوتی واصلاحی تعلقات، سندھ اور گجرات میں شیعیت کی اشاعت میں یمنی داعیوں کا کردار، عرب وگجرات کے ثقافتی تعلقات، عرب وگجرات کے علمی روابط، قبائل عرب کی گجرات آمد، عرب وہند کا باہمی علمی استفادہ اور مدارس وکتب خانوں وغیرہ کا اجمالی ذکر ہے۔

گجرات وعرب ممالک کے تعلقات کے سلسلہ میں تاریخ کی ورق گردانی کے بعد یہ محسوس ہوا کہ اس موضوع کو واضح کرنے کے لئے تاریخ گجرات کو مختلف سیاسی ودعوتی ادوار میں تقسیم کرنا ضروری ہے، لہذا استقرائی طریقہ پر میں نے تاریخ کو چند ادوار میں تقسیم کیا ہے:

(۱) ماقبل الاسلام دور (۲) ۱۵ھ سے لے کر ۱۶۰ھ تک کا دور (۳) ۱۶۰ھ سے لے کر سلطان محمود غزنوی کے حملوں تک کا دور (۴) سلطان محمود غزنوی سے لے کر خود مختار سلطنت کے قیام تک کا دور (۵) خود مختار سلطنت کا مجموعی ۱۸۴ سالہ دور (۶) دور اکبری سے لے کر انگریز کے قبضہ تک کا دور۔

ان چھ ادوار میں خودمختار سلطنت کا دورتمام ادوار میں واضح اور نمایاں ہے؛ کیوں کہ اس دور کی تاریخی کتابیں ہمارے پاس محفوظ ہیں ،اسی طرح اکبر کے گجرات پر حملہ کر کے گجرات کومرکزی سلطنت میں شامل کرنے سے لے کر انگریزی دور تک کے حالات کا بھی کچھ مواد مل جاتا ہے۔

ان ادوار میں دوسرا دور سرزمین گجرات کے لئے سب سے سنہرا اور بابرکت دور ہے، اس ۱۴۵ سالہ دور میں صحابۂ کرام ، تابعین عظام اور تبع تابعین حضرات کا بکثرت ورود ہوا ہے، قال اللہ اور قال الرسول صلی اللہ علیہ وسلم کی صدائیں بلند کرنے والے حضرات تنہا مجاہد ہی نہیں بلکہ کتاب وسنت کے علوم کے ماہر بھی تھے،یہی وجہ ہے کہ خطۂ گجرات ایک روحانی وعلمی مرکز ،تجارتی منڈی اور پرسکون زندگی کے لئے مناسب آشیانہ کی شکل اختیار کرتا چلا گیا۔ پروفیسر خلیق احمد نظامی اسی حقیقت کی جانب اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

اورنگزیب عالمگیر نے اپنے فرزند شاہزادہ محمد اعظم کو جوان دنوں گجرات کا گورنر تھا، ایک خط میں لکھا تھا: ’’گجرات کہ زیب وزینت ہندوستان است ،اہل کسب وارباب ہنر ہمہ جہت می باشند۔‘‘

> ’’اور اس میں کوئی مبالغہ نہ تھا ، شاہ جہاں کی نظر میں اگر جونپور ’’شیراز ہند‘‘ تھا،تو عالمگیر گجرات کو ہندوستان کی حسن وزیبائش سمجھتا تھا،ابوالفضل کے بقول اس کی حیثیت ایک گلستان کی تھی ،جس میں ہر رنگ وبو کے پھول مہکتے تھے، گجرات صدیوں تک علم وفن کا مرکز ،ارباب ہنر کا گہوارہ ،ارشاد وتلقین کا سرچشمہ، اقتصادی زندگی کی شہ رگ اور ایک سرگرم تجارتی منڈی رہا تھا، روحانی اور مادی زندگی کی ساری نعمتیں یہاں جمع ہوگئی تھیں ،بعض اعتبار سے تو ہندوستان کے قرون وسطی کی تاریخ میں اس کو پورے ملک میں ایک امتیازی حیثیت حاصل تھی۔‘‘ (یادایام،ص:۱۱)

اسی کتاب میں سید مولانا عبدالحی لکھنوی رحمۃ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں:

''سب سے پہلے مسلمانوں کی نگاہ دوربیں گجرات کے سرسبز پہاڑوں پر پڑی تھی، اوران کا یہ مطمح نظراس وقت تک قائم رہا جب تک کہ وہ گجرات پر قابض ومتصرف نہیں ہوگئے۔'' (یادایام،ص:۴۴)

مشہور سیرت نگار علامہ سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ اسی بات کا اعتراف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ سے سواحل ہند پر عربوں کی تاخت شروع ہوتی ہے، اور یہ وہ زمانہ تھا جب ہر کلمہ گو کے لب ودہن ''أخبرنا اور حدثنا'' کی خوشبو سے معطر تھے، یعنی صحابۂ کرام کا عہد تھا، اسلام کا یہ پہلا مجاہدانہ قافلہ'' تھانہ'' پر حملہ آور ہوا تھا، جو ان دنوں (بمبئی کے بجائے) بحر ہند کا آباد بندرگاہ تھا، اوراس کے بعد بھروچ (واقع گجرات) اس مقدس بحری عسکر کی دوسری منزل گاہ تھی، اس میں کوئی شک نہیں کہ ان دونوں فوجوں میں دیدار نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے مشرف ہستیوں کی کچھ تعداد یقیناً شامل ہوگی، اوراس لحاظ سے ہندوستان بھی ان خوش قسمت ملکوں میں ہے جن کی خاک صحبت یافتگاں نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاؤں سے لگ کر ہماری آنکھوں کا کحل الجواہر بن چکی ہے۔''

(مقالات سلیمانی:۲/۲)

گجرات وعرب کی سیاسی تاریخ:

عہد قدیم سے صوبۂ گجرات کوکئی حیثیتوں سے اہمیت حاصل رہی ہے، اس خطہ کے نام اور حکام ضرور بدلتے رہے؛ مگراس کی اہمیت اور شہرت ہمیشہ برقرار رہی، یہ اپنی تجارت،

تمول، شادابی، بندرگاہوں وغیرہ کی وجہ سے ہمیشہ بیرونی واندرونی اقوام واصحاب سیف وقلم کے لئے باعث کشش رہا ہے، تقریباً ۲۰۰۰ء ق م بلکہ اس سے بھی قبل سے ۱۶۰۰ء تک دنیا کی مختلف قومیں یہاں آئیں، جن میں سیاسی فاتح ہیں اور روحانی پیشوا بھی، تاجر بھی، ہندوستان کے آخری حکمران انگریز بھی سب سے پہلے گجرات ہی کی بندرگاہ پر لنگر انداز ہوئے تھے اور اہل ہند کی کمزوریوں سے فائدہ اٹھا کر رفتہ رفتہ پورے ملک پر تسلط پا کر تاجر سے تاج دار بن گئے، اس کی سلطنت کا مدار ''برلؤلؤ ومرجان'' رہا ہے اور آج بھی اس کا مدار ''برگندم جو'' نہیں ہے، یہ صوبہ مختلف مذاہب کے مرکز کی حیثیت سے اور اپنی زیارت گاہوں نیز ندیوں کی وجہ سے بھی دوسرے علاقوں کے مقابلہ میں کسی طرح کم شہرت کا مالک نہیں ہے، سرور کائنات حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بعض صحابہ وتابعین اور تبع تابعین نے بھی سب سے پہلے اسی سرزمین پر مبارک قدم رکھے، اسماعیلیوں نے بھی تبلیغ کا کام سب سے پہلے گجرات ہی میں شروع کیا تھا۔

گجرات کی قدرتی جائے وقوع ملک عرب کے سامنے ہے، بیچ میں بحر عرب کا ایک حصہ واقع ہے، اسی سمندری راستہ سے عرب قبل مسیح سے آمد ورفت رکھتے تھے اور تجارتی کاروبار کے ذریعہ انہوں نے کافی فروغ پایا، یہی سبب ہے کہ عربی زبان میں بہت سے نام آج بھی بطور یادگار موجود ہیں، اسی طرح گجراتی زبان میں بھی عربی نام بکثرت ملیں گے، پھر جب عرب سے لے کر ترکستان تک اسلامی حکومت قائم ہوگئی تو اس وقت گجرات سے لے کر لنکا تک تجارتی جہازوں کی آمد ورفت بہت بڑھ گئی، اور جب کبھی ان تاجروں کو کوئی تکلیف پہنچی تو ان کی امداد کے لئے بصرہ اور سیراف وغیرہ سے جنگی بیڑہ فورا آجاتا، چنانچہ تھانہ، بھروچ، دیول وغیرہ میں متعدد بار آیا، کبھی کامیاب اور کبھی ناکام واپس گیا۔

عرب ممالک سے گجرات کے تعلقات کی ابتداء بہت قدیم ہے، کیوں کہ جزیرۃ

العرب تین طرف سے سمندر سے گھرا ہوا ہے اور ریگستانی علاقہ زیادہ ہونے کی وجہ سے ذرائع آمدنی کے لئے تجارت ناگزیر ہے، پھر عرب کے مشرق ومغرب میں بڑے بڑے تمدنی ممالک آباد ہیں، جن کے باہمی تجارتی روابط کے لئے جزیرۃ العرب اور اطراف کے عرب ممالک شہ رگ کی حیثیت رکھتے تھے اور بڑی تجارتی منڈی بنے ہوئے تھے اور گجرات بھی طبعی طور پر سمندر سے گھرا ہوا ہے، لہذا اس طبعی ہم آہنگی نے دونوں کو ایک دوسرے سے قریب کر دیا اور گجرات بھی تجارتی منڈی ہونے کی وجہ سے مشرقی اور مغربی دونوں طرف کے ممالک کی اشیاء کی درآمد و برآمد کا واسطہ ہونے میں ایران، عراق، جزیرۃ العرب، یمن اور مصر کا شریک بن گیا۔

قدیم تاریخ میں عرب اقوام کے ہندوستان میں قیام کا کوئی نام ونشان نہیں ملتا اور نہ ان کے زیادہ وقت ٹھہرنے کا ثبوت ملتا ہے، اس کے برعکس ہندوستان کے باشندوں کے عرب میں کثرت سے آباد ہونے کا ثبوت ملتا ہے، جو وہاں مستقل طور پر آباد ہو گئے تھے۔
(عرب اور ہند عہد رسالت میں: ص: ۱۰۷)

عرب میں آباد سات ہندوستانی قوموں میں سے مید، اساورہ، احامرہ اور بیاسرہ وغیرہ کا تعلق سندھ اور گجرات سے تھا۔

ہندوستانیوں کے ساتھ عربوں کا حسن سلوک، رواداری اور مہمان نوازی بدستور قائم تھی، اس کی وجہ یہ بھی تھی کہ عربوں کو گھر بیٹھے ضروریات کی چیزیں ہندوستانیوں کے ذریعہ مل جایا کرتی تھیں، کئی عرب قبائل نے ہندوستانیوں کو اپنی ولاء میں لے رکھا تھا، اس کے علاوہ ہندوستان کے لوگ بت پرستی میں جاہل عربوں کے ہم مشرب تھے، اس لئے دونوں ملکوں میں تعلقات اور بھی مضبوط ہوئے، مذہبی یک رنگی، عادات وخصائل اور رسم ورواج یکساں تھے، اس لئے ہندوستانی باشندے عرب میں اپنے قدم جمانے میں کامیاب ہو گئے، عرب اور ہندوؤں کے درمیان تعلقات کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ ایران کے شہنشاہ کا قبضہ بلوچستان

اور سندھ کے اوپر رہا، اس قبضہ کی وجہ سے بعض فوجی دستے ایرانی فوج میں داخل ہوگئے، ان جنگجو قبیلوں میں دو کا ذکر عربوں نے کیا ہے، اور وہ ''جاٹ'' اور ''میڈ'' ہیں، یہ دونوں سندھ کی مشہور قومیں تھیں۔ (ہندوستان اسلام کے سایہ میں، ص:۱۹، ۹۸)

اسی طرح بحرین، عمان، یمامہ، نجران، مکہ مکرمہ، مدینہ منورہ اور تبوک کے اطراف میں ہندوستانی باشندوں کی بستیوں کا پتہ چلتا ہے۔

جب سے دنیا کے تجارتی حالات کا پتہ چلتا ہے تب سے ہم عربوں کو مصروف تجارت پاتے ہیں، بقول علامہ سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ ''اس وقت ہمارے پاس دنیا کی بین الاقوامی تاریخ کی سب سے پرانی کتاب تورات ہے، اس میں حضرت یوسف علیہ السلام کو مصر پہنچانے والے قافلہ کا ذکر ہے، الغرض حضرت یوسف علیہ السلام کے مصر سے لے کر مارکو وپولو اور واسکوڈی گاما کے زمانہ تک ہندوستان کی تجارت کے مالک عرب ہی رہے۔ (عرب و ہند کے تعلقات: ۳۵)

عرب و ہند کے درمیان دوسرا راستہ جو خلیج فارس کے ذریعہ تھا، وہ ہمیشہ کھلا رہا اور عربوں کے ہی قبضہ میں رہا اور سواحل کے پارسی اور عرب خشکی وتری سے ہمیشہ اپنا سامان لاتے اور لے جاتے رہے، وہ ہندوستان کے تمام ساحلی مقامات اور بحر ہند کے ایک ایک جزیرہ کو دیکھتے بھالتے بنگال اور آسام ہو کر چین کو چلے جاتے تھے، اس راستہ میں بھی کئی جہاز گجرات کے ساحلی علاقوں سے گزر کر ہی جاتے تھے۔

بحر ہند کی تجارت سے ہندوستان اور عرب دونوں کو جو فائدے پہنچتے تھے، ان کا اندازہ بعض واقعات سے ہوتا ہے، ولبھ رائے کا پایۂ تخت مہانگر ''سونے کا شہر'' کہلاتا تھا، مہراج کے پایۂ تخت (جزیرہ جاوہ) کے بازار میں دکانوں کا شمار نہ تھا، فقط صرافی کی دکانیں اس بازار میں ۸۰۰ تھیں۔

دوسری طرف ان عرب تاجروں سے ہندوستانی سواحل کے راجاؤں کو بھی بڑی آمدنی ہوتی تھی، اسی لئے وہ ان کی بڑی قدر کرتے تھے، ابن بطوطہ نے جنوبی ہند کے ساحلی شہروں کا سفر کرتے ہوئے جابجا لکھا ہے کہ یہ ہندو راجہ ان عرب جہاز رانوں کو اس لئے ناخوش نہیں ہونے دیتے تھے کہ ان کے ملک کی آمدنی انہیں کی آمدورفت سے ہے، کالی کٹ اور کارومنڈل کے راجہ اس بحری تجارت کی بدولت لاتعداد دولت کے مالک تھے، کارومنڈل کے ایک راجہ کے مرنے پر اس کے ایک مسلمان کارکن کو جو سونا اور جواہرات ہاتھ آئے، ان کے اٹھانے کے لئے سات ہزار بیلوں کی ضرورت محسوس ہوئی۔

ساتویں صدی کے ختم ہوتے ہوتے عربوں کی بحری تجارت اس قدر بڑھ گئی اور اس کو اتنا فروغ ہوا کہ گجرات کا کوئی بندر ان کے مال تجارت سے محروم نہیں رہا، اس سے خود ملک کا راجہ اور اہل ملک بھی فائدہ اٹھاتے تھے، لیکن یہ عجیب بات ہے کہ اس سلسلہ میں خود گجراتی بیڑوں کا ذکر کتابوں میں نہیں ملتا، شاید عربوں کی جہاز رانی اور عربی جہازوں کی کثرت نے اس کو بیکار کر دیا ہو۔

سلیمان بصری، ابوالحسن زید سیرافی اور مسعودی کے سفرناموں سے پتہ چلتا ہے کہ یہاں کے راجہ عرب تاجروں کی بڑی قدر کرتے تھے، ان کے مال تجارت کی درآمد پر جو محصول لیا جاتا تھا، اس سے ان راجاؤں کی بڑی معقول آمدنی ہوتی تھی، ساتویں صدی کے آخر میں سولنکی اور باگھیلا خاندان نے جہازوں کی جانب توجہ کی اور انہوں نے عربوں کی مدد سے ایک بیڑا تیار کرلیا، چنانچہ ارجن باگھیلا کے بیڑے کا امیر البحر ایک عرب تھا، خلجی اور تغلق خاندانوں کے عہد میں ان تجارتی جہازوں کی آمدورفت اس وجہ سے زیادہ بڑھ گئی کہ مسلمان عرب اور ایرانی بڑی تعداد میں راشٹ کٹ کے عہد سے تمام گجراتی بندرگاہوں میں آباد ہو گئے تھے۔

مسعودی نے لکھا ہے کہ چیمور میں عربوں اور ایرانیوں کے دس ہزار گھر ہیں، جو تقریباً

سب کے سب تاجر ہیں یا تجارت سے وابستہ ہیں، یہی حال دوسری بندرگاہوں کھنبایت، بھروچ، سومناتھ، جوناگڑھ وغیرہ کا تھا۔

کھنبایت سے سونٹھ، کپاس، گوگھل، خوشبودار اشیاء، شکر، تیل، لاکھ، باریک کپڑا، آملہ جوتا، ریشمی کپڑا، عرب، ایران اور افریقہ جاتے تھے، بھروچ سے تل، روئی، شکر، لاکھ، عمل اور دوسرے اعلی درجہ کے کپڑے عرب اور مصر جاتے تھے، پیتل، سنگھ، صندل اور دوسری قسم کی لکڑی ایران جاتی تھی، لاکھ بھی بہت زیادہ برآمد ہوتی تھی، کھنبایت سے اعلی درجے کے جوتے اور ہاتھی دانت جاتا تھا، تھانہ کے کپڑے مشہور تھے جن کو عرب بکثرت لے جاتے تھے، کھنبایت اور بھروچ سے ساگوان کی لکڑی بصرہ بھیجی جاتی تھی، تاجر فلسطین تک بندر، طوطا اور مور لے جاتے تھے، کاغذ اس ملک کا خاص تحفہ تھا جو عرب، شام، مصر تک جاتا اور لوگ اس کو بہت پسند کرتے تھے۔ (مقدمۂ مرأۃ احمدی، بمبئی) سولہویں صدی سے اٹھارہویں صدی تک ابریشم، زری، زربفت، مخمل، کمخواب، مشروع، تلوار، جمدھر، تیروکمان، مروارید، مرجان، گجرات سے باہر جاتے تھے، البتہ چاندی ایران اور روم سے آتی تھی۔

بروص (بھروچ) سے بھروچی نیزے، ان کے بانس اور کھنبایت اور سندان سے ناریل، اسی طرح تھانہ سے عمدہ کپڑا اور دیگر مختلف مقامات سے مختلف چیزیں عرب جایا کرتی تھیں۔ (عرب و ہند عہد رسالت میں، ص:۲۹)

ہندی تلواروں کی طرح نیزے بھی عرب میں زیادہ مشہور تھے، اگرچہ یہ نیزے ''عمان'' سے لے کر ''بحرین'' تک کے علاقہ میں تیار کئے جاتے تھے، لیکن چونکہ ان کی بناوٹ میں جو بانس استعمال ہوتا تھا، وہ گجرات، سندھ اور بھروچ سے جایا کرتا تھا اور خالص اسی لکڑی سے نیزے بنائے جاتے تھے۔ اس کے بارے میں ''لسان العرب'' میں ہے: ''و قد کثر مجیئها فی اشعارها.'' عرب میں اس کا ذکر بہت کثرت سے آیا ہے۔

مشہور شاعر فضل بن عبدالصمد نے کہا ہے:

انعت قوسا ذی انتقاء جاء بها جالب بروصاء

میں نے اس صاف ستھری کمان کی تعریف کی ہے، جسے بھروچ سے منگانے والے نے منگایا ہے۔

من شفق اخضر بروا صیات صفر الحاء والخلوقیات

زرد، سبز بھروچی بانس، جن کے چھلکے بھی زرد ہیں۔

بحر روم سے ہندوستان کا دوسرا بحری راستہ :

پرتگالی جہاز رانوں نے بحر روم کو چھوڑ کر افریقہ کی پشت پر سے ہندوستان کا راستہ پایا اور یہ سمجھا جاتا ہے کہ یہ دریافت انہیں جہاز رانوں کی کوششوں کی ممنون ہے؛ لیکن یہ سن کر تعجب ہوگا کہ اس دریافت کی عزت ان سے سینکڑوں برس پہلے ان عرب تاجروں کو حاصل ہے، جو بحر ہند میں اپنا جہاز چلایا کرتے تھے، ہندوستانی سمندر اور رومی سمندر کے جہازوں کی ساخت میں بڑا فرق یہ تھا کہ بحر روم کے جہازوں کے تختے لوہے کی کیلوں سے جڑے جاتے تھے اور ہندوستانی سمندر کے جہازات مضبوط رسی سے جو کھجور یا ناریل کی چھال سے تیار ہوتی تھی، سی جاتی تھی۔ سلیمان تاجر اپنے سفر نامہ میں ایک جگہ لکھتا ہے:

> ان باتوں میں جو ہمارے زمانہ میں نئی معلوم ہوئیں اور ہم سے پہلے لوگوں کو ان کا علم نہ تھا، ایک یہ ہے کہ کسی کو اس کا پہلے وہم وگمان بھی نہ تھا کہ وہ سمندر جس پر ہندوستان اور چین واقع ہیں، وہ کس طرح سے بحر شام (بحر روم یعنی میڈیٹیرین سی) سے ملا ہوا ہے اور اس پر کوئی دلیل بھی ان کے پاس نہ تھی، مگر ہمارے زمانہ میں یہ ہوا کہ عربوں کے کچھ سئے ہوئے جہازوں کے تختے جو بحر ہند میں ٹوٹ گئے تھے اور جن کے مسافر ڈوب گئے تھے، وہ بحر اخضر ہو کر بحر روم

میں پائے گئے، اس سے یہ بات بخوبی ثابت ہوگئی کہ بحر ہند چین پر
چکر کھا کر بحر روم میں جا کر مل گیا ہے، کیوں کہ سئے ہوئے جہاز
صرف سیراف میں بنتے تھے اور روم وشام کے جہاز کیلوں سے
جڑے جاتے تھے۔

واسکو ڈی گاما کو ہندوستان کس نے پہنچایا؟

اس میں شک نہیں کہ افریقہ کی پشت پر سے ہوکر پرتگالی جہاز ران آخر کار بحر ہند میں داخل ہوگئے، تاہم انہوں نے ہندوستان کا پتہ نہ پایا، اس کو پرتگالی مانتے ہیں اور خود بدقسمت اہل عرب بھی کہتے ہیں کہ ان پرتگالیوں کو ہندوستان تک ایک عربی ہی جہاز ران نے پہچایا، اس کا نام ابن ماجد اور اسد البحر یعنی ''دریا کا شیر'' اس کا خطاب تھا۔ علامہ سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب ''عربوں کی جہاز رانی'' میں ابن ماجد کا گجراتی ہونے کا تذکرہ کیا ہے،، بحر ہند کی جہاز رانی کے فن پر اس کی متعدد عربی کتابیں کتب خانۂ پیرس میں موجود ہیں، پیرس کے مشرقی کتابوں کے پبلیشر بال گاتھر نے دو جلدوں میں ان کو شائع کر دیا ہے، تیسری جلد میں عربوں کے فن جہاز رانی اور آلات جہاز رانی پر پوری بحث ہے، علامہ قطب الدین نہروالی (گجراتی) کی کتاب ''البرق الیمانی فی الفتح العثمانی'' میں جو اسی زمانہ کی یمن کی تاریخ ہے، پرتگالیوں کے آنے اور ہندوستان کی تلاش میں ان کی سرگردانی اور ابن ماجد شیر دریا کا ان پرتگالی لومڑیوں کے پھندے میں پھنس کر نشہ کی حالت میں ان کو ہندوستان پہنچا دینا وغیرہ تفصیل کے ساتھ مذکور ہے۔

مجاہدینِ اسلام کے جہادی اسفار اور کامیابی کے اسباب:

ابتداء میں اس ملک کو اسلام سے روشناس کرانے کے اصل تین ذرائع تھے۔
(۱) عرب تُجّار: عرب تاجروں اور ان کے ساتھ آنے والے مبلّغین کے ذریعہ سب

سے پہلے ہمارے ملک تک اسلام کی روشنی پہنچی ، انہی کی کوششوں سے ساحلی علاقوں کے باشندے اسلام اوراس کی تعلیمات سے روشناس ہوئے۔

(۲) مسلمان حملہ آور: یہ لوگ فوجی قوت سے اندرونی ملک میں داخل ہوئے، اگرچہ انہوں نے اپنے طرزِ عمل سے اسلام کی پوری پوری نمائندگی نہیں کی، پھر بھی ان کے حملوں کا یہ نتیجہ ضرور ہوا کہ مسلمان ممالک کا اندرونِ ملک سے رابطہ قائم ہوگیا، اور دینِ حق کی دعوت کے لئے راستے کھل گئے۔

(۳) مبلغین اور بزرگانِ دین: بہت سے بزرگ اپنے مخلص عقیدت مندوں کے ساتھ ملک کے گوشے گوشے میں پھیل گئے اور منظّم طور پر دین کی اشاعت کا کام کرنے لگے، ان کا تقویٰ، خلوص اور انتھک کوششوں سے ہزاروں ہندوستانی مشرف باسلام ہوئے، متعدد افراد کے قلوب نرم اور اخلاق پسندیدہ ہوگئے، یہاں کے باشندوں کی ایک خاصی تعداد کے مسلمان ہوجانے کی وجہ سے اس ملک میں مسلمانوں کی حکومت کے قیام اور بقاء کے لئے زمین ہموار ہوگئی۔

جہاں تک عرب تجار، مبلغین اور فقیر منش بزرگوں کی مساعی کا تعلق ہے تقریبا تمام لوگ انہیں سراہتے اور ان کی خدمات کا اعتراف کرتے ہیں، چنانچہ آج بھی مسلمانوں کے علاوہ کتنے غیر مسلم بھی ان بزرگوں کے مزار پر عقیدت کے پھول چڑھاتے ہیں، لیکن مسلمان حملہ آوروں کو اچھی نگاہ سے نہیں دیکھا جاتا؛ بلکہ ان پر لوٹ مار، قتل وغارت گری، بے جا تشدد، ملک گیری کی بڑھتی ہوئی ہوس اور جبری تبدیلی مذہب کا الزام لگایا جاتا ہے، اس میں شک نہیں کہ بعض الزامات کسی نہ کسی درجہ میں صحیح ہیں، لیکن جب ہم ان اسباب پر غور کرتے ہیں جو ان حملوں کے محرک ہوئے تو ان حملہ آوروں ہی کی طرح وہ لوگ بھی موردِ الزام ٹھہرتے ہیں جن پر یہ حملے ہوئے مثلاً:

حملوں کے اسباب:

(۱) ہندوستانی راجہ ان باغی گروہوں کو اپنے یہاں پناہ دیتے تھے جو مسلمانوں کی مملکت میں بڑے بڑے جرائم کا ارتکاب کرنے کے بعد یہاں بھاگ آتے تھے، ان باغیوں میں باطنیہ بھی تھے اور قرامطہ اور ملاحدہ بھی، یہ اور اس قسم کے دیگر متعدد گروہ عموماً مسلمان مملکتوں کا تختہ اُلٹنے کی سازش کرتے رہتے تھے، ظاہر ہے اتنے بڑے جرم کو کوئی مملکت برداشت نہیں کرسکتی، مسلمان حکمران جب ان مجرموں کی واپسی کا مطالبہ کرتے تو پناہ دینے والوں کی طرف سے انہیں کوئی معقول جواب نہ ملتا اور بحالت مجبوری جب وہ ان کی سرکوبی کے لئے خود آگے بڑھتے تو ان باغیوں کی حمایت میں یہاں کے راجہ ان سے جنگ کرتے، اس طرح گویا حملہ کرنے کے لئے خود انہیں کی طرف سے مواقع فراہم کئے جاتے۔

(۲) مسلمان ممالک کی سرحدیں ہندوستان سے مل چکی تھیں، پڑوسی ممالک میں سرحدی تنازعات چلتے ہی رہتے ہیں، ان تنازعات کا تصفیہ کرنے کے لئے سمجھوتے ہوتے تھے، تاریخ شاہد ہے کہ ایسے بیش تر سمجھوتوں کی شرائط توڑنے اور چھیڑ چھاڑ کرنے میں پہل عموماً ہندوستان کے راجاؤں کی طرف سے ہوتی تھی، چنانچہ اکثر حملے اس سبب سے بھی ہوئے۔

پہلا جہادی سفر: آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات مبارکہ ہی میں مسلمان بحرین کے اس علاقہ پر قابض ہو چکے تھے جس سے ہندوستان وچین کا قدیم زمانہ سے تجارتی تعلق چلا آرہا تھا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت باسعادت سے قبل ہی بہت سارے ہندوستانی عرب کے جنوبی اور مشرقی سواحل پر جمع ہو گئے تھے، غزوۃ الہند کی روایات بھی حضرات صحابۂ کرام کے پیش نظر تھیں، لہذا سب سے پہلے حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں

حضرت عثمان بن ابی العاص رضی اللہ عنہ نے اپنے بھائی حضرت حکم بن ابی العاص رضی اللہ عنہ کو ہندوستان روانہ کیا، حضرت حکم رضی اللہ عنہ نے تھانہ اور بھروچ پر حملہ کیا اور فتح یاب ہوئے۔

دوسرا جہادی سفر: حضرت عباد بن زیاد اموی (تابعی) کی سرکردگی میں ہوا، حضرت عباد نے حدود سجستان اور حدود ہند کے کئی مقامات میں سلسلۂ جہاد جاری رکھا، ایک مرتبہ وہ دریائے سندھ عبور کرکے ہندوستان کے بعض علاقوں میں داخل ہوئے اور ''رن کچھ'' تک پہنچے، اس نواح میں کچھ عرصہ ان کا قیام رہا، وہاں سے کندھار کا عزم کیا۔

تیسرا جہادی سفر: محمد بن قاسم نے جب دیبل پر حملہ کرکے اس کو فتح کرلیا تو راجہ داہر وہاں سے بھاگ گیا تھا اور حدود سندھ سے نکل کر راجہ راسل کی راجدھانی ''کچھ'' کے مقام پر پہنچ گیا تھا، اس کے ساتھ کچھ کے ہی علاقہ میں فیصلہ کن جنگ ہوئی اور راجہ داہر مارا گیا، اس کے بعد محمد بن قاسم نے ہندوستان (گجرات) کے باقی علاقوں اور شہروں کو فتح کرنے کا عزم کرلیا تھا لہذا ابھیلمان پر فوج کشی کی، وہاں والوں نے مقابلہ نہیں کیا اور شرائط کے مطابق صلح کرلی، اس کے بعد محمد بن قاسم کی فوج سورٹھ (کاٹھیاواڑ) کی طرف بڑھی، سورٹھ والوں (یا اس کے کسی ٹھاکرے) نے بھی بغیر مزاحمت کے مسلمانوں کی اعانت گذاری کا اعلان کردیا۔

محمد بن قاسم نے پورے سندھ کو مسخر کیا، ملتان پر تسلط جمایا اور راجستھان اور گجرات کاٹھیاواڑ کے بہت سے شہروں کو زیر کیا، مفتوحہ علاقوں میں مسجدیں تعمیر کرائیں، مدرسے قائم کئے اور قرآن وحدیث کی تعلیم کے لئے اساتذہ مقرر کئے۔

گجرات کے ایک شہر کھیڑا میں اس کا مجسمہ بنا کر وسط شہر میں نصب کیا گیا، یہ اس کے بہت بڑے اور عادل امیر ہونے کی دلیل تھی، اس ضمن میں بلاذری کے الفاظ لائق مطالعہ ہیں: فبکی اهل الهند وصوروه بالكيرج. یعنی محمد بن قاسم کی موت پر ہندوستان کے

لوگ روئے اور کیرج (کھیڑا) میں اس کی تصویری یادگار قائم کی گئی۔

یہ اس کے ساتھ باشندگان ہند کی محبت وعقیدت کی انتہا تھی اور اس کی ہر دل عزیزی، معدلت گستری اور انصاف کے تقاضوں پر عمل پیرا ہونے کا واضح ثبوت تھا، مدتوں یہ صورت حال رہی اور عرصۂ دراز تک لوگ اسے یاد کرتے اور آنسو بہاتے رہے، وہ بہت بلند مرتبہ امیر تھا، سندھ اور ہند کی فتوحات میں ایک طرف اگر اس نے اپنے آپ کو رستم واسکندر سے بڑھا ہوا ثابت کیا تو دوسری طرف عدل وانصاف، رعایا پروری اور ہمدردیٔ خلائق میں نوشیرواں سے بازی لے گیا۔

منصور بن حاتم نحوی کے حوالہ سے ہندوستان کے ممتاز مؤرخ قاضی اطہر مبارک پوری رحمۃ اللہ علیہ رقم طراز ہیں:

> ''راجا داہر اور اس کے قاتل دونوں کی تصویریں یا مجسمے شہر بھروچ میں بنے ہوئے ہیں، ہندوستان میں قدیم زمانہ سے نامور افراد کے مجسموں اور تصویروں کے ذریعہ ان کی یادگار قائم کرنے کا رواج ہے، چوں کہ سندھ کا راجا داہر سوراشٹر اور گجرات کے علاقے کچھ میں قتل ہوا، جو راجا راسل کی ملکیت تھا، اس لئے اس کی اور اس کے قاتل دونوں کی یادگار گجرات کے قدیم شہر بھروچ میں قائم کرکے دونوں بہادروں کے کارناموں کو یادرکھا گیا، دونوں اپنے اپنے کارناموں میں بہادر تھے، راجا داہر نے عرب کی عظیم فوج کا جم کے مقابلہ کیا اور قشعم نے اس عظیم راجا کا کام تمام کیا، راجا داہر کے مرنے کے بعد پورے سندھ پر محمد بن قاسم کا مکمل قبضہ ہوگیا اور وہ اطراف وجوانب کے قریہ قریہ اور شہر شہر کو فتح کرتے ہوئے ارور جا پہنچے۔''

محمد بن قاسم کے سندھ پر حملہ کے موقع سے آپ کے ساتھ آنے والے ایک ممتاز ومشہور قاری اور محدث ''جنید بن عمر والعدوانی المکی'' تھے، جو مکہ مکرمہ کے جید ومعروف قاری تھے۔

علم حدیث میں بھی ان کا مرتبہ بڑا اونچا تھا، ثقہ اور کثیر الحدیث راوی تھے، آل زبیر بن عوام رضی اللہ عنہ کے آزاد کردہ غلام تھے، انہوں نے حمید بن قیس سے روایت کی اور خود ان سے محمد بن عبداللہ بن قاسم نے درس حدیث لیا، قراءت مجاہد سے سیکھی، منقول ہے کہ مکہ مکرمہ میں جنید بن عمر واور عبداللہ بن کثیر سے بڑھ کر کوئی قاری نہ تھا، آپ ان تبع تابعین میں سے تھے جو فتح سندھ کے موقع پر محمد بن قاسم کے ساتھ برصغیر وارد ہوئے تھے، محمد بن قاسم نے ساوندری کے مقام پر پہنچ کر ہراور میں قیام کیا تھا، پھر ہراور سے انہوں نے جنید بن عمر وکو فوج کے ایک دستے کا کمانڈر بنا کر مخالفین اسلام کے خلاف جہاد کے لئے بھروچ روانہ کیا تھا۔

محمد بن قاسم کے حالات میں مدارس قائم کرنے اور قرآن وحدیث کی تعلیم کے لئے اساتذہ مقرر کرنے کا اہتمام دلالت کرتا ہے کہ آپ کے زمانہ میں وسطی گجرات اور کاٹھیاواڑ میں قرآن کریم کی تعلیم کا نظم ضرور ہوگا، نیز حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ کے شاگرد رشید جنید بن عمر والعدوانی جیسے مشہور قاری کو شہر بھروچ روانہ کرنا بھی دلالت کرتا ہے کہ آپ نے جہاد کے ساتھ ساتھ لشکر میں اپنے ذوق کے قراء حضرات بھی تیار کئے ہوں گے، کیوں کہ جب بھوکا انسان دو اور دو کے جواب میں چار روٹی سے اپنی بھوک کو نمایاں کرتا ہے، تو اتنا بڑا صاحب فن وحریص علم اپنے ذوق کو اہل شوق حضرات کے سامنے پیش نہ کرے یہ تعجب کی بات ہے، مزید یہ ہے کہ امیر لشکر ہونے کی حیثیت سے اس کو اِس کے مواقع بھی فراہم ہوں۔

شہر بھروچ میں ۱۵ھ میں صحابۂ کرام کی آمد کے بعد حضرت جنید بن عمر و کا داعیانہ ومجاہدانہ شان سے تشریف لانا فضیلت در فضیلت کو ثابت کرتا ہے، تجوید وقراءت کے اس

امام کا یہ حق ہے کہ بھروچ والے اس امام فن کی قربانیوں کو ضائع نہ ہونے دیں، بلکہ فن تجوید و قراءت میں مہارت پیدا کر کے آپ کو خراج عقیدت پیش کریں۔

چوتھا جہادی سفر: ۱۰۷ھ میں عراق کے حاکم خالد عمر بن مسلم باہلی کو سندھ کی حکومت سے الگ کر کے جنید بن عبدالرحمٰن کو سندھ کا حاکم بنایا، (عمر بن مسلم نے سندھ کی ولایت کے درمیان کچھ کو فتح کر کے سندھ کے تابع کر دیا تھا) جنید نے رادھن پور کے پاس موجود پنچاسر کو (جو سولنکی راجہ کا پایۂ تخت تھا اور سولنکیوں نے اسے چاوڑا خاندان سے چھین لیا تھا) فتح کرلیا، سولنکی فوج یہاں سے بھاگ کر امداد کے لئے جنوبی گجرات پہنچی اور بھروچ میں جنگی تیاری کرنے لگی جنید کو جب اس کی خبر ہوئی تو فوراً بھروچ پہنچا اور ایک ہی جنگ میں اس کا خاتمہ کر دیا، پھر جنید نے بھیلمان اور گجرات کو فتح کیا، یہاں اس کو اتنا مالِ غنیمت ملا کہ زائرین وسائلین کو دینے کے بعد بھی چار کڑور بچ گیا۔

ان فتوحات کی تائید ان کتبوں سے بھی ہوتی ہے، جو اثری تحقیقات کے ماتحت برآمد ہوئے ہیں، یہ چالوکیہ راجہ کے عہد کا نوساری سے دستیاب ہوا ہے، چنانچہ پول کیشی جناشر کے عہد کا ایک کتبہ ہے، جس میں تحریر ہے:

"عرب لشکر نے سندھ، کچھ، سوراسٹھ، چاوڑا، موریا (ماڑواڑ یا مالوہ)
اور بھیلمان کی سلطنت کو حیران کیا۔"

یہ کتبہ (بعہد پول کیشی) ۷۳۸ء کا ہے، گویا اصل واقعہ سے دس بارہ برس بعد کا ہے۔

پانچواں جہادی سفر: جنید کے حملے کے بعد عربوں نے تقریباً ۳۰ یا ۳۲ سال تک گجرات کی طرف رخ نہیں کیا، ۱۳۲ھ میں اموی کی جگہ عباسی حکومت پر فائز ہوئے اور دمشق کے بجائے بغداد کو اپنا دارالخلافت بنایا، اس انقلاب نے ہندوستان کو عرب سلطنت سے بہت قریب کر دیا، عباسی خلیفہ ابوجعفر منصور نے ۱۴۰ھ میں ہشام بن عمر تغلبی کو سندھ کا گورنر

بنا کر بھیجا، ہشام نے سندھ کے اندرونی حالات درست کر کے گجرات کی طرف توجہ مرکوز کی اور گجرات کے ایک مرکزی مقام بھاڑ بھوت (بھروچ سے قریب ۱۵ رکلومیٹر پر واقع ہے) کی طرف عمرو بن جمل کی سرکردگی میں ایک بحری فوج روانہ کی، پھر خود ہی مزید تیاری کر کے گندھار (بھروچ) پر حملہ آور ہوا، اس کو فتح کر کے چندروز قیام کیا اور وہاں ایک مسجد تعمیر کی، یہ سندھ کے علاوہ ہندوستان میں پہلی مسجد تھی۔

ہشام کے عہد حکومت میں ملک میں شادابی اور خوش حالی آ گئی، لوگ اس کو برکت سمجھتے تھے، اس نے سرحدوں پر پورا قابو حاصل کرلیا تھا اور تمام معاملات کو مستحکم کر دیا۔

چھٹا جہادی سفر: ۱۴۰ھ سے ۱۵۸ھ تک عرب تاجروں کو گجرات سے کوئی شکایت نہیں ہوئی، البتہ عباسی خلیفہ مہدی (۱۵۸ھ) کے تخت خلافت پر بیٹھنے کے دوسرے سال ۱۵۹ھ میں اس نے عبدالملک بن شہاب مسمعی کی سرکردگی میں سرکاری اور غیر سرکاری (رضا کار) فوجوں کی ایک بڑی تعداد بھاڑ بھوٹ کی طرف روانہ کی اور ۱۶۰ھ میں اس کو فتح کیا۔

ان فوجوں میں والنٹیر بھی بہت تھے اور غالباً ان کے افسر ابوبکر ربیع بن صبیح السعدی بصری رحمۃ اللہ علیہ تھے، جن کو تابعی ہونے کا فخر حاصل تھا، انہوں نے ایک دوسرے کو جہاد کے لئے بڑا جوش دلایا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ گجراتی مسلمانوں کے پر جوش حملوں کو نہ روک سکے، گجراتی شہر میں چلے گئے اور پھاٹک بند کر دیا، عرب فوج نے اس سختی سے محاصرہ کیا کہ وہ لوگ عاجز آ گئے، آخر ایک دن عرب فوج بزور شہر میں گھس گئی اور شہر فتح ہو گیا۔

اسی طرح چھٹے حملہ میں آنے والے رضا کار مجاہدین میں محدث جلیل ربیع بن صبیح رحمۃ اللہ علیہ کے علاوہ قرآن وحدیث کے دیگر ماہرین بھی ضرور ہوں گے، لیکن چوں کہ ان حضرات کے حالات تاریخ بلاذری، طبقات ابن سعد اور فتوح البلدان وغیرہ میں نہایت ہی

مختصر طور پر مذکور ہیں، لہذا حتمی طور پر کچھ کہنا مشکل ہے۔

ساتواں جہادی سفر: خلیفہ مأمون اور معتصم کے زمانہ میں (۱۹۸ھ) جنوبی گجرات کے ایک مشہور سمندری مقام سندان (سنجان) پر بنوسامہ کے آزاد کردہ غلام فضل بن ماہان نے قبضہ جمایا اور اپنی خود مختار حکومت قائم کی، جو اس کے بعد اس کے لڑکے محمد بن فضل اور ماہان بن فضل کی باہمی خانہ جنگی میں ۳۰؍سال کے عرصہ میں تباہ ہوگئی۔

اس طرح ابتدائی دوصدیوں کی آمد ورفت کے نتیجہ میں گجرات کے کناروں پر واقع متعدد بندرگاہوں میں مسلمانوں کی نوآبادیاں قائم ہوگئی ،جس کی شہادت تیسری صدی اور چوتھی صدی ہجری میں آنے والے عرب سیاحوں نے دی ہے۔

ابتدائی مسلم آبادی کا تذکرہ:

۱۶۰ھ کے بعد سے سلطان محمود غزنوی کے حملہ تک کے حالات بھی بظاہر بہت واضح نہیں ہیں، لیکن حسن اتفاق سے سندھ میں اسلامی حکومت کے قیام اور گجرات میں ۷۷۰ء مطابق: ۱۶۰ھ میں چالوکیہ خاندان کا خاتمہ ہونے کے بعد گجرات کا دکن کے راشٹ کوٹ راجاؤں کے ماتحت ہونے نے راشٹ کوٹ راجاؤں کو مسلمانوں سے قریب کردیا، راشٹ کوٹ راجاؤں کا لقب ’’ولبھ رائے‘‘ تھا، اس خاندان کے بعض راجہ مسلمانوں کے بڑے خیر خواہ اور دوست گذرے ہیں، انہیں کے عہد حکومت میں عرب تاجر اور مہاجر گجرات میں ہزاروں کی تعداد میں آئے اور مستقل اقامت اختیار کرلی، حسن اتفاق سے اس دور میں مسلمان تاجر اور مؤرخ گجرات میں آئے اور انہوں نے اپنے سفرناموں میں مسلمانوں کے جو احوال پیش کئے ہیں، ان سے محسوس ہوتا ہے کہ مسلمان اس دور میں گجرات میں نہایت اطمینان کے ساتھ زندگی گذار رہے تھے اور ان کو کتاب وسنت پر عمل کرنے کی مکمل آزادی تھی، ابن خرداذبہ (آمد: ۲۱۱ھ، مطابق ۸۲۶ء، وفات: ۳۰۰ھ، مطابق ۹۱۲ء) نے اپنی تاریخی کتاب ’’المسالك والممالك‘‘ میں ان راجاؤں کا تذکرہ کیا ہے، اسی طرح تیسری صدی ہجری

کے دوسرے سیاح ''سلیمان تاجر'' نے اپنی کتاب ''سلسلة التواريخ '' (جس کی تکمیل بعد میں ابوزید سیرفی م: ۲۳۷ھ نے کی) میں بھی ان کا تذکرہ کیا ہے، ''بزرگ بن شہریار'' نے تیسری صدی کے اواخر اور چوتھی صدی کے اوائل میں گجرات کا سفر کیا تھا، انہوں نے ''عجائب الہند'' میں اور مسعودی (م: ۳۴۶ھ) نے ''مروج الذهب ومعادن الجوهر '' میں بھی کافی کچھ لکھا ہے، جس سے اس دور کی کچھ تصویر ابھر کر سامنے آتی ہے۔

علامہ سید عبدالحی رحمۃ اللہ علیہ یادایام میں رقم طراز ہیں:

''اسلامی فتوحات سے قبل ہندوستان کے جس علاقہ سے عرب سب سے زیادہ متعارف تھے وہ گجرات تھا، عرب سیاحوں اور جغرافیہ نویسوں نے اس کا تفصیلی ذکر کیا ہے، البیرونی اور ادریسی نے یہاں کے دریاؤں اور جغرافیائی حالات پر دلچسپ روشنی ڈالی ہے، مسعودی (م: ۳۴۶ھ مطابق: ۹۵۷ء) ''مروج الذهب ومعادن الجوهر '' میں گجرات کے راجہ بلہرا کے متعلق لکھتے ہیں:

> ''سندھ اور ہندوستان کے راجاؤں میں راجہ بلہرا کی طرح مسلمانوں کو اور کسی کی حکومت میں عزت حاصل نہیں ہے، اسلام اس راجہ کی سلطنت میں محفوظ اور معزز ہے، اس کے ملک میں مسلمانوں کی نماز پنج گانہ کی مسجدیں اور جامع مسجد ہیں، جو آباد ہیں۔''

گجرات کے راجہ نے عرب تاجروں کے لئے جو ساحلی علاقوں میں بس گئے تھے، مسلمان قاضی مقرر کئے تھے، جو ''ہنرمن'' کہلاتے تھے، تاریخی شہادتوں سے ثابت ہے کہ گجرات میں مسلمانوں کا سیاسی اقتدار قائم ہونے سے قبل مسلم آبادی اور اس کے ثقافتی ادارے وجود میں آ گئے تھے۔

مشہور مؤرخ مسعودی لکھتے ہیں:

میں نے ہندوستان کے شہر کھنبایت میں دیکھا اور یہی وہ شہر ہے جس کی طرف کھنباتی جوتے منسوب ہیں، جو یہاں اوراس کے قریب سندان اورسوپارہ وغیرہ شہروں میں بنتے ہیں، میں کھنبایت ۳۰۳ھ میں گیا تھا، اس زمانہ میں وہاں کا راجہ بانیا تھا، جو برہمنی مذہب کا پابند تھا اور مہانگر کے راجہ ولبھ رائے کے ماتحت تھا،اس کے راجہ ''بانیا'' کو مناظرہ سے بڑی دلچسپی تھی اور جو مسلمان یادوسرے مذاہب کے لوگ اس کے ملک میں آتے، وہ ان سے بحث ومناظرہ کرتا تھا۔

اسی طرح ایک مقام پر لکھتے ہیں:

''میں۳۰۴ھ میں ہندوستان کے شہر چیمور میں (جو راجہ ولبھ رائے کی مملکت لار کا علاقہ ہے) موجود تھا اوراس زمانہ میں جو راجہ تھا اس کا نام جانج تھا،اس وقت تقریباً دس ہزار مسلمان وہاں آباد تھے، جو اصل میں بیاسرہ،سیراف، عمان،بصرہ ،بغداد اور دوسرے ملکوں کے تھے؛ لیکن ان علاقوں میں بودوباش اختیار کرلی تھی، ان میں سے بہت سے معزز اور بڑے تاجر ہیں ،جیسے موسی ابن اسحاق صنداپوری وغیرہ ،اور ہنرمندی کے عہدہ پران دنوں ابوسعید معروف بن زکریا مامور تھے، ہنرمند سے مراد مسلمانوں کا سردار ہے،اس کی شکل یہ تھی کہ راجہ کا قاعدہ تھا کہ وہ کسی مسلمان رئیس ہی کو ان کا سردار بنادیتا تھااور مسلمانوں کے تمام معاملات اسی کے سپرد ہوتے تھے، بیاسرہ سے وہ مسلمان مراد ہیں جو ہندوستان میں پیدا

ہوئے، اسی نام سے وہ مشہور ہیں، اس کا واحد بیسر ہے۔'' (دیکھئے:
عرب و ہند کے تعلقات: ۲۸۱)

ان کے علاوہ علامہ بلاذری (م: ۲۷۹ھ، مطابق: ۸۹۲ء) نے فتوح البلدان میں، یعقوبی (م: ۲۸۴ھ مطابق: ۸۹۷ء) نے تاریخ یعقوبی میں، ہمدانی (۲۷۹ھ کے بعد) نے کتاب البلدان میں، ابن رستہ (م: ۲۹۰ھ) نے ''الاعلاق النفیسہ'' میں، طاہر مقدسی (چوتھی صدی ہجری کا وسط) نے کتاب البدء والتاریخ میں، اصطخری (۳۴۰ھ، مطابق: ۹۵۱ء) نے المسالك والممالك میں اور بشار مقدسی (م: ۳۷۵ھ مطابق: ۹۸۵ء) نے احسن التقاسیم فی معرفة الاقالیم میں تفصیل سے گجرات کے احوال ذکر کئے ہیں۔ (واضح ہو کہ اصطخری کو یہ امتیازی حیثیت حاصل ہے کہ وہ ابن حوقل کے ہم عصر ہیں، بلکہ دونوں کی ہندوستان میں ملاقات بھی ہوئی تھی۔)

لیکن افسوس ہے کہ ان تمام حضرات نے گجرات کے تاریخی، جغرافیائی اور سیاسی حالات پر زیادہ تبصرہ کیا ہے، مسلم آبادی کے دینی احوال اور تعلیم و تعلم کے ذرائع کے سلسلہ میں سوائے چند اشاروں کے وہ عمومی طور پر خاموش ہیں، اس لئے اس دور میں مسلم آبادی اچھی خاصی تعداد میں ہونے کے باوجود صحیح صورت حال واضح نہیں ہو رہی ہے۔

اصطخری اور مسعودی نے مساجد اور شرعی احکام و قوانین کی مناسب رہنمائی کے لئے باصلاحیت وذی استعداد افراد کے تقرر کی بات ذکر کی ہے، چنانچہ اصطخری اپنی کتاب ''المسالك والممالك'' میں لکھتے ہیں:

> ''کھنبایت سے راجہ بلہرا کے شہر چیمور تک سب ہندوؤں کے شہر ہیں، مگر ان میں کچھ مسلمانوں کی بھی آبادی ہے اور راجہ بلہرا کی طرف سے کوئی مسلمان ہی ان کے معاملات کا نگران ہوتا ہے، ان شہروں میں مسجدیں اور جامع مسجدیں ہیں، جن میں نماز جمعہ ادا کی

جاتی ہے، بلہرا کی راجدھانی کا نام مہانگر ہے جہاں وہ رہتا ہے،
اس کی سلطنت بہت وسیع ہے۔''

محمودغزنوی سے لے کر خود مختار سلطنت کے قیام تک کادور :

سلطان محمود غزنوی کا گجرات پر حملہ خود ایک بزرگ مانگرولی کی گجرات میں مسلمانوں پر ہونے والے ظلم کی داستان سننے پر ہوا تھا، جو اس وقت گجرات میں مسلم آبادی کے وجود کا ثبوت بھی پیش کر رہا ہے، سلطان کے حملہ کے بعد بھی وقتی طور پر حالات کے تلخ ہونے کے باوجود مسلمان داعیوں کی مسلسل آمد و رفت جاری رہی، اسی دور میں بھروچ میں ''بابا ریحان'' اوران کے رفقاء کی آمد ہوئی، البیرونی نے بھی قریب قریب اسی دور میں یہاں کا سفر کیا، الادریسی (۴۹۳ھ) نے ''نزهة المشتاق فی اختراق الآفاق ''میں اور قاضی رشید بن زبیر (۴۶۲ھ) نے ''الذخائر والتحائف ''نامی کتاب میں گجرات کے حالات ذکر کئے ہیں۔

اسی دور سے متعلق علامہ سید عبدالحی لکھنوی رحمۃ اللہ علیہ نے تفصیلی حالات نقل فرمائے ہیں، جن کا خلاصہ یہ ہے کہ ۴۱۶ھ میں سلطان محمود غزنوی کو گجرات کا خیال پیدا ہوا اوراسی ارادہ سے وہ ملتان سے نکل کر نہایت دشوار گذار راستہ طے کرتے ہوئے، ریگستانوں کو عبور کرتے ہوئے نہروالہ پہنچا، اسے فتح کر کے دیولواڑہ کو بھی تہہ تیغ کیا، پھر سومناتھ کا قصد کیا، جہاں تمام دشواریوں پر غالب آتے ہوئے فتح حاصل کر کے بے شمار مال و دولت لے کر بخیر وخوبی لوٹ گیا۔

پھر ۵۷۴ھ میں سلطان شہاب الدین غوری نے گجرات پر دھاوا کیا، اس وقت کے راجہ بھیم دیو سے سخت مقابلہ ہوا، جس میں شہاب الدین کو شکست اٹھانی پڑی۔ ۵۹۱ھ میں قطب الدین ایبک نے اپنے آقا شہاب الدین غوری کی اجازت سے گجرات پر حملہ کیا اور

بھیم دیو کو شکست فاش دی، پھر اسی قطب الدین ایبک کو ۵۹۷ ھ میں شہاب الدین نے دو بارہ حملہ کی غرض سے بھیجا، اس بار بھی قطب الدین فاتح رہا، اس کے بعد علاء الدین خلجی کا دور آیا، چنانچہ اس نے ۶۹۶ ھ میں ''اُلغ خان'' کو تسخیر گجرات کے لئے روانہ کیا، اس وقت راجہ کرن حکومت کا ذمہ دار تھا، اس نے کسی طرح اپنی جان بچائی، لیکن الغ خان نہ صرف فتحیاب ہوا بلکہ مال کثیر اور شاہی افراد پر بھی قابض ہوگیا تھا، اسی الغ خان نے بیس برس تک گجرات میں نہایت خوش اسلوبی سے حکمرانی کی اور ملک کو فتنہ وفساد سے پاک کردیا۔ (یادایام، ص: ۴۷، ۴۸)

کیا محمود غزنوی میں رواداری نہ تھی ؟

ہماری بدنصیبی رہی ہے کہ ہم جنگ وجدل کی تاریخ تو بہت دلچسپی سے پڑھتے ہیں لیکن ایسے واقعات کو نظرانداز کردیتے ہیں جن سے باہمی موانست ویگانگت کا درس مل سکتا ہے، محمود غزنوی نے سومناتھ کو جس طرح برباد کیا، اس کی کہانی تو بہت دہرائی جاتی ہے لیکن اسی کے حالات زندگی میں یہ بھی ہے کہ جب اس نے متھرا کا مندر دیکھا تو اس کی شوکت وحشمت دیکھ کر ششدر رہ گیا، اپنے ایک مکتوب میں لکھتا ہے کہ اگر کوئی ایسی عمارت بنانا چاہے تو لاکھوں سرخ دینار خرچ کرکے بھی نہیں بنا سکتا ہے، اور شاید وہ سو برس میں بھی ایسی عمارت نہ بنا سکے۔ (تاریخ یمینی بحوالہ لیٹ جلد دوم ص: ۴۴) یہاں وہ نہ بت شکن بنا اور نہ بت فروش بلکہ اس مندر کے حسن وشوکت سے متاثر رہا، اس کی کوئی مثال نہیں کہ اس نے امن کی حالت میں کسی مندر کو منہدم کیا یا اس نے کسی ہندو کو ترک مذہب کرنے پر مجبور کیا؛ بلکہ غزنہ میں تو اس نے ہندوؤں کی بودوباش کے لیے ایک محلّہ بھی آباد کردیا تھا۔ (رساہ الغفران معری بحوالہ دی لائف اینڈ ٹائمس آف سلطان محمود غزنہ از محمد ناظم: ص/۱۶۳)

جوامع الحکایات ولوامع الروایات میں ہے کہ امیر نصر جو خراسان کا امیر تھا اور محمود کا چہیتا بھائی تھا، ایک بار وہ سلطان کے پاس ٹھہرا ہوا تھا، اس کے زین خانے

سے ایک جڑاؤ لگام چوری ہوگئی، چوری پکڑی گئی تو چور ایک ادنی درجہ کا ملازم تھا جو ہندو تھا، امیر نے حکم دیا کہ اس کو باندھ کر بیس کوڑے لگائے جائیں، سلطان کو یہ معلوم ہوا تو اس کو بہت دکھ ہوا، اس نے امیر نصر کو کہلا بھیجا کہ ہماری موجودگی میں ہمارے غلاموں کو تازیانے سے پٹواتے ہو اور ہماری ناراضگی کی پروا نہیں کرتے ،اس کے بعد ایک ماہ تک اس کو اپنے حضور میں آنے کی اجازت نہیں دی۔ (اردو ترجمہ از اختر شیرانی: ص/۸۴-۸۶)

کلکتہ یونیورسٹی کے پروفیسر سنیتی کمار چٹر جی کی تحقیق ہے کہ محمود کے سکّوں پر سنسکرت کے الفاظ پائے جاتے ہیں، اس کے سکّوں پر ایک طرف تو کلمہ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ ہے اور دوسری طرف سنسکرت میں اس کا ترجمہ ادی اکتم ایکم محمد اوتار ہے، یہ صحیح ترجمہ تو نہیں اس لیے کہ مسلمان محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اوتار نہیں مانتے ،وہ آپ کو انسان ہی سمجھتے ہیں۔ پروفیسر سنیتی کمار چٹر جی اس سلسلہ میں یہ بھی لکھتے ہیں کہ محمود غزنوی کا اپنے سکّوں پر سنسکرت لکھوانا اس کی سیاسی ہوش مندی کا ثبوت ہے۔ جب پنجاب اس کی سلطنت کا جزو ہوگیا تو اس نے یہاں کی ہندو آبادی کو اپنی طرف اس طرح مائل کرنا چاہا، یہ اس کی دماغی اور فراخ دلی کی دلیل تھی۔ (البیرونی یادگار جلد ایران سوسائٹی کلکتہ: ص/ ۹۸)

سلطان محمود کا ہندوؤں کو اپنی طرف مائل کرنا کوئی تعجب انگیز بات نہیں، کیونکہ نہ صرف اس کے غزنہ اور پنجاب کے علاقے میں ہندو آباد تھے؛ بلکہ اس کی فوج میں ہندو سردار اور لشکری بھی تھے ،وہ طخرستان سے بڑھ کر بلخ، ایلک خاں سے برسر پیکار ہونے کے لیے گیا تو اس کے لشکر میں ترکوں، خلجیوں اور غزنویوں کے ساتھ ہندو لشکری بھی تھے۔ (تاریخ یمینی بحوالہ الیٹ جلد دوم: ص/۳۲)

موجودہ دور کے بعض وسیع النظر اور فراخ دل ہندو مؤرخوں نے ہندووں کے ساتھ سلطان محمود کی رواداری کا اعتراف اچھی طرح کیا ہے، مثلا ایشور ٹوپا نے لکھا ہے کہ موجودہ دور کے ایک مؤرخ کا خیال ہے جو محمود غزنوی کا ناقد بھی ہے کہ وہ کوئی مبلغ اسلام نہیں تھا،

غیر مسلموں کو مسلمان بنانا اس کا مقصد نہیں رہا۔ الفنسٹن نے ہم کو یقین کے ساتھ بتایا ہے کہ سلطان گجرات میں عرصہ دراز تک رہا، لاہور میں بھی اس کا قیام رہا، لیکن اس نے کسی غیر مسلم کو مسلمان نہیں بنایا، اس نے ہندوؤں کو مسلمان بنانے کی فکر ہی نہیں کی، اس کی مذہبی پالیسی میں رواداری کی خصوصیت تھی، اس کے متعلق یہ کہیں ذکر نہیں آتا کہ اس نے کسی ہندو کو اپنا مذہب چھوڑنے پر مجبور کیا، اس نے کسی بھی شخص کو اس کے ذاتی ضمیر کی بنا پر موت کی سزا نہیں دی، اس نے لڑائی یا محاصرہ کے موقع پر تو ہندوؤں کو ہلاک کیا لیکن کسی اور موقع پر اس کے ہندوؤں کو ہلاک کرنے کا ذکر نہیں پایا جاتا ہے، اس کے دور حکومت میں ہندوؤں کو پوری مذہبی آزادی رہی، ان کا تقرر نہ صرف انتظامی امور کے سلسلہ میں کیا جاتا بلکہ وہ فوج میں بھی بحال کیے جاتے، ان کے مذہب پر کوئی اعتراض نہ ہوتا، جس طرح فوج میں عرب، افغان، دیلمی، خراسانی اور غوری ہوتے وہ بھی ہوتے، ہندو لشکری اپنے آقا کی خاطر کرمان، خوارزم اور مرو میں جا کر لڑے، غزنویوں کی فوجی مہموں کی تاریخ میں ہندو فوجی سرداروں میں تلک، سوندی رائے اور ہج رائے کے نام نمایاں و مشہور ہیں، غزنیوں کی حکومت میں ان ہندو فوجی سرداروں کو اعلیٰ حیثیت حاصل رہی، وہ بڑے قابل اعتماد سردار سمجھے جاتے، غزنیوں کے ساتھ ان کی وفاداری اور خدمت گذاری مثال کے طور پر پیش کی جاتی۔ (پالی ٹکن اِن پری موغل ٹائمس از ڈاکٹر ایشورٹوپا: ص/ ۴۶-۴۵)

سلطان محمود کی وفات کے پندرہ روز کے بعد ہی اس کے بیٹے سلطان مسعود نے ایک ہندو فوجی سردار سبوندرائے کو ہندو سواروں کی معیت میں ان امراء کے خلاف بھیجا جو اسکے بھائی کے حامی تھے، پانچ سال کے بعد مسعود ہی کے حکم سے تلک نے ہندو سپاہیوں کے ساتھ بتالگین کے خلاف لشکر کشی کی اور اس کو شکست دیکر ہلاک کر دیا، اس کے پانچ سال کے بعد سلطان مسعود سلجوقی ترکمانوں سے مغلوب ہو کر غزنی سے ہندوستان چلا آیا تو اس نے یہاں

ایک بڑی فوج اکھٹا کی جس میں ایک بڑی تعداد ہندوؤں کی تھی۔(تاریخ سبکتگین بحوالہ الیٹ جلد دوم:ص/۶۰) بیہقی نے اپنی تاریخ میں غزنوی دور کے ہندوفوجی سردار تک کا ذکر جس طرح کیا ہے اس سے اندازہ ہوگا کہ ہندواس دورحکومت میں تحقیر کے بجائے عزت کی نظروں سے دیکھے جاتے تھے۔

مثلاً ایشورٹوپا کی تحریر سابق میں گذرچکی ہے کہ ''محمود نے کسی غیر مسلم کومسلمان نہیں بنایا،اس کی مذہبی پالیسی میں رواداری کی خصوصیت تھی،اس کے متعلق یہ کہیں ذکرنہیں آتا کہ اس نے کسی ہندوکواپنا مذہب چھوڑنے پرمجبورکیا،اس نے کسی بھی شخص کواس کے ذاتی ضمیر کی بناپرموت کی سزانہیں دی،اس نے لڑائی اورمحاصرہ کے موقع پرتو ہندوؤں کو ہلاک کیا،لیکن کسی اورموقع پراس کے ہندوؤں کے ہلاک کرنے کا ذکرنہیں پایا جاتا ہے۔اس کے دورحکومت میں ہندوؤں کو پوری مذہبی آزادی رہی،ان کا تقررنہ صرف انتظامی امورکے سلسلہ میں کیا جاتا، بلکہ وہ فوج میں بھی شامل کئے جاتے،ان کے مذہب پرکوئی اعتراض نہ ہوتا۔(عہد ماضی میں مسلمان حکمرانوں کی رواداری:ص/۳۴)

سی.وی.ویدیہ نے اپنی کتاب میں لکھا ہے کہ محمودایک جلیل القدر بادشاہ تھا،اس نے محض اپنی قوت بازو سے ایک چھوٹے سے پہاڑی علاقے کوایک وسیع اورخوش حال سلطنت میں تبدیل کردیا، یہ کوئی معمولی کارنامہ نہ تھا، میرا خیال ہے محموداان افراد میں سے ہے جوقدرت کی طرف سے ایک عرصہ کے بعد پیدا ہوا کرتے ہیں اورجن میں غیر معمولی قسم کی خوبیاں اورعدیم المثال صلاحیتیں ہوتی ہیں اورجودنیا کی تاریخ اورقوموں کی قسمت بدل دیتے ہیں،وہ ایک اچھا حکمران بھی تھااوراچھا منتظم سلطنت بھی۔عوام کوخوش حال بنانے کی فکر میں برابرلگارہا۔(سی.وی.ویدیہ کی کتاب ہسٹری آف مڈل انڈیا جلد سوم بحوالۂ تاریخ مسلمانوں کے عہد ماضی میں: ص/۳۸)

ایشوری پرشاد نے اپنی کتاب میں لکھا ہے کہ ایک غیر متعصب محقق اور مؤرخ اس کے زمانہ کی صورتِ حال کو پیش نظر رکھ کر یہی فیصلہ دینے پر مجبور ہوگا،محمود بلاشبہ اپنے ساتھیوں کا ایک جلیل القدر رہنما ،ایک انصاف پسند اور دیانت دار حکمران ،ایک باکمال پُرجوش سپاہی، عدل وانصاف کا شیدائی ،علوم وفنون کا مربی تھا ،وہ بلا شک وشبہ دنیا کے بہترین اور عظیم ترین حکمرانوں میں شمار کئے جانے کے لائق ہے۔(الہ آباد یونیورسٹی کے سابق پروفیسر ایشوری پرشاد اپنی کتاب مڈل انڈیا بحوالہ مسلمانوں کے عہد ماضی میں :ص/۳۹)

چوں کہ ابتداء میں عرب تاجر کی حیثیت سے آئے تھے،اس لئے اس زمانہ میں ان کا تعلق ان ہی علاقوں سے ہوا، جہاں بندرگاہیں تھیں،اس زمانہ میں سب سے زیادہ بندرگاہیں جنوبی ہند میں،اس کے بعد سندھ، گجرات اور بلوچستان میں تھیں،مثلاً موجودہ مدراس میں کولم ملی بار،راس کماری، گجرات میں تھانہ، کھنبایت،سوپارہ،چیمور،سندھ میں دیبل، بلوچستان میں تیز وغیرہ، جزائر میں سراندیپ اور مالدیپ،اس لئے ابتداء میں عرب انہی علاقوں میں آباد ہوئے اور ہندوستان میں مسلمانوں کی حکومت کے قیام سے صدیوں پہلے وہ سراندیپ، مالدیپ،ملیبار،کولم،(موجودہ ٹرانکور) کارومنڈل،چیمور،تھانہ، کھنبایت،گندھار، چنداپور یا کور(برکور) منگلور وغیرہ میں آباد ہو چکے تھے،بعض مقامات پر ان کی آبادی دس دس ہزار تک تھی،ان کی مسجدیں تھیں، ہندوؤں سے ان کے تعلقات نہایت خوش گوار تھے، ہندو راجہ ان کا بڑا احترام کرتے تھے اوران کو باعث برکت سمجھتے تھے اور بعض حکومتوں میں ان کو خاص حقوق ومراعات حاصل تھے۔

چنانچہ جہاں جہاں ان کی آبادی زیادہ تھی، وہاں ان کا الگ نظام قضاء تھا اوران کے معاملات ومقدمات کے فیصلہ کے لئے ہندو راجہ کی جانب سے مسلمان قاضی یا حاکم مقرر تھے، جو ہنرمند کہلاتے تھے، ہندو راجاؤں کے مسلمان وزیر ومشیر تھے،بعض راجاؤں نے جن

کوحق کی تلاش تھی؛ اسلام کے متعلق تحقیقات کے لئے اپنے سفیر عرب بھیجے اور مسلمان بزرگوں کے ہاتھوں پر مسلمان ہوئے، پھر ان کے اثر سے ان کی رعایا میں بھی اسلام کی اشاعت ہوئی، یہ سارے حالات عرب سیاحوں اور جغرافیہ نویسوں کی کتابوں میں ملتے ہیں۔

ابن خرداذبہ نے جس راجہ بلہرا کا ذکر کیا ہے، اس کا نام مودگھ ورش ولبھ رائے ہے، اس کی حکومت کا زمانہ ۸۱۵ء سے ۸۷۷ء تک ہے، اس راجہ نے اپنے طویل عہد حکومت میں بڑی فتوحات حاصل کیں، حسن انتظام کے لحاظ سے بھی یہ بہترین راجہ تھا، اسے عربوں سے بڑی محبت تھی، آخر عمر میں تخت سے دست بردار ہوکر عبادت الٰہی میں مشغول ہو گیا تھا اور اس کا لڑکا اس کا جانشین ہوا۔ (تاریخ گجرات)

> ان میں ایک گجرات کا راجہ ہے، جس کے پاس بڑی فوجیں ہیں، کسی ہندوستانی راجہ کے پاس اتنی فوجیں اور گھوڑے نہیں، وہ عربوں کا دشمن ہے؛ لیکن اس حقیقت کا معترف ہے کہ عرب کا بادشاہ ہی سب سے بڑا بادشاہ ہے، اس سے بڑھ کر کوئی ہندوستانی اسلام کا دشمن نہیں، یہ کاٹھیاوار میں رہتا ہے، اس کے پاس دولت، اونٹ اور مویشی بہت زیادہ ہیں، اس ملک کے لوگ چاندی کے بدلہ سونا خریدتے ہیں، کہا جاتا ہے کہ ان کے پاس کئی کانیں ہیں، اس شہر سے زیادہ کوئی شہر چوری سے محفوظ نہیں۔
>
> (ہندوستان عربوں کی نظر میں)

اصلاحی تعلقات :

محمود غزنوی کے حملہ کے بعد بھی داعیان اسلام کے قافلہ کی گجرات آمد جاری رہی، ان بزرگان واولیاء ہی میں سے ایک شخصیت بابرکت بابا ریحان کی بھی ہے، افسوس ہے کہ

ایسی عظیم ہستی کے حالات سے تاریخ کا دامن خالی ہے، آپ گرچہ کسی مشہور سلسلہ سے منسلک نہیں تھے، لیکن اشاعت اسلام کی غرض سے گجرات کے مشہور علاقہ بھروچ تشریف لائے تھے اور یہیں آسودۂ خاک ہوئے۔

مشہور انگریز مؤرخ ''مسٹر فاربس'' نے ان کی نسبت اپنی کتاب (Oriental Memories) میں لکھا ہے:

''۱۰۷۸ء اور ۴۹۲ھ میں جب بھروچ کے علاقے میں ہندوؤں کا راج تھا، بغداد سے ایک بزرگ باوا ریحان مشائخ اور فقراء کی تعداد کے ساتھ اشاعت اسلام کی غرض سے یہاں وارد ہوئے، لیکن راجہ نے ان کی مخالفت کی اور اپنے بیٹے رائے کرن کو ایک بڑی فوج دے کر باوا ریحان کے مقابلہ کے لئے بھیجا، رائے کرن باوا صاحب کی شخصیت سے اس قدر متاثر ہوا کہ اس نے باوا صاحب کے ہاتھ پر اسلام قبول کر لیا اور ملک محمد اپنا نام رکھا، ان دونوں کی کوششوں سے راجہ کی بیٹی بھاگ دیوی اور اس کے علاوہ بے شمار دوسرے ہندو اپنا آبائی مذہب چھوڑ کر باوا ریحان کے مرید ہو گئے، لیکن رائے کرن کے باپ نے ان کی مخالفت کی اور باپ، بیٹے میں بڑا سخت معرکہ ہوا، باپ کامیاب رہا اور رائے کرن، اس کی بہن اور نومسلموں کی بھاری تعداد لڑائی میں شہید ہوئی، اس کے بعد راجہ نے باوا صاحب سے صلح کر لی اور جب ان کی وفات ہوئی تو وہ بھروچ سے باہر ایک بلند ٹیلے پر دفن ہوئے۔''

ایک حکایت یہ بھی ملتی ہے کہ بابا ریحان دراصل ماوراء النہر کے متوطن تھے، اپنے بھائی بابا احمد اور دیگر ۴۰؍مریدین ورفقاء سمیت پانچویں صدی ہجری میں بھروچ میں جلوہ افروز ہوئے، اس عہد کے راجہ سے معرکہ کیا اور پھر ۴۳۰ھ میں مدرسہ اور خانقاہ تعمیر کی۔

اس طرح علاقہ راندیر سورت کی ترقی سے پہلے کافی مشہور تھا، جس کا اندازہ اس بات سے بھی ہوتا ہے کہ البیرونی نے اپنی تصانیف میں راندیر کا ذکر کیا ہے، ۱۲۲۵ء میں یہاں جینیوں کی حکومت تھی، اس وقت عرب تاجروں اور ملاحوں نے مل کر جینیوں کا مقابلہ کیا اور شہر پر قبضہ کرلیا، آگے چل کر یہ عرب ''نوائط'' کہلائے۔

اسی سلسلہ میں سخنورانِ گجرات میں مذکور ہے کہ خلیفہ سفاح عباسی کے عہد میں کوفہ سے ایک مؤمن قبیلہ راندیر آیا تھا، ان لوگوں نے راندیر میں اشاعت اسلام کی خدمت انجام دی تھی، ۱۱۵۶ء میں وہاں ایک مسجد تعمیر کی گئی تھی، وہ اب تک موجود ہے، ۱۱۲۹ء میں جب سلطان صلاح الدین نے مصر پر قبضہ کرلیا تو وہاں کے بعض اسماعیلیوں نے گجرات میں پناہ لی تھی، ایک شخص نورالدین ستاگر نامی سات اماموں کی تقلید کرتا تھا جو گیارہویں صدی میں گجرات میں تبلیغ میں مصروف پایا جاتا ہے، اس نے ۱۰۹۴ء میں وفات پائی، امام مستنصر باللہ ۱۰۹۴ء کے عہد میں احمد نامی ایک شخص کو بغرض تبلیغ گجرات بھیجا گیا تھا۔ (سخنوران گجرات:۲۴)

راندیر سے زیادہ شہرت کھنبایت کی بندرگاہ کو حاصل تھی، جو عرب و ہند کی آمد و رفت کے لئے قدیم راستہ ہونے کی وجہ سے معروف بندرگاہ تھی، یہاں شروع ہی سے عربوں کی آبادیاں قائم ہوگئی تھیں، کئی بوہرے مبلغین اور دیگر بزرگانِ دین یمن وعرب کے دوسرے حصوں سے یہاں پہنچے اور اپنے اپنے عقائد کی اشاعت کرنے لگے، مشہور بوہرہ فاضل ''محمد علی''۔ جنہیں پیر پرواز بھی کہتے ہیں۔ پہلے کھنبایت ہی تشریف لائے تھے، آج بھی ان

کا مزار بوہروں کی مشہور زیارت گاہ ہے، ان کے علاوہ دیگر بزرگان دین کی مزاریں بھی موجود ہیں۔

ساحلی مقامات کو چھوڑ کر گجرات کے جس شہر میں اسلامی مبلغ سب سے پہلے پہنچے، وہ ''نہروالہ'' (پٹن) ہے، احمد آباد کی تعمیر سے پہلے یہ بڑا پر رونق شہر اور گجرات کے ہندو راجاؤں کا دارالسلطنت تھا، اس شہر کے بزرگوں کے حالات سید احمد صاحب نے ''منازل الاولیاء'' میں جمع کئے ہیں اور ''مرآۃ احمدی'' میں ان کا خلاصہ پیش کیا گیا ہے، ان بزرگوں کے حالات پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ مسلم فاتحین کی آمد سے قبل ہی یہ دلوں کو فتح کرنے والے بزرگان خدا کہاں کہاں پہونچ چکے تھے۔ چنانچہ پہلی شخصیت جس کا تذکرہ ملتا ہے، وہ ایک بوہرہ داعی تھے، جنہیں یمن سے تبلیغ دین کے لئے بھیجا گیا تھا، نام آپ کا عبداللہ یا محمد بیان کیا جاتا ہے، یہ راجہ سدھ راج جے سنگھ (م:۵۳۸ھ) کے زمانہ میں پٹن گئے تھے، ایک روایت کے مطابق مذکور راجہ نے آپ کے ہاتھ پر ایمان بھی قبول کیا تھا، جب کہ بعض کا کہنا ہے کہ سیدی احمد نے اسے حلقہ بگوش اسلام کیا تھا، حضرت حاجی ہود اولین بزرگ ہیں جنہوں نے نہروالا پٹن میں سکونت اختیار کی اور سن ۱۱۴۱ء میں وہیں وفات پائی، شیخ احمد عرفاتی متوفی سن ۱۲۴۷ء، بابا حاجی متوفی ۱۲۷۱ء، شیخ احمد دہلوی المعروف بہ بابا دھلیا (خلیفہ شیخ محی الدین علوی دہلوی) متوفی سنہ ۱۱۶۰ء، حضرت قاضی محمود دریائی کے جداعلیٰ شاہ علی سرمست اور دیگر نے گجرات کو اپنا وطن ثانی بنالیا اور رشد وہدایت کی خدمت انجام دی۔

رفاعی خاندان سے ہندوستان آنے والے پہلے بزرگ نجیب الدین عبدالرحیم محبوب اللہ بن سید بن عمر ہیں ۶۸۷ھ میں عراق میں پیدا ہوئے، وہ مکہ ہوتے ہوئے گجرات میں پیران پٹن پہنچے اور بعد میں احمد آباد کو دائمی اقامت گاہ بنالیا۔ (سخنوران گجرات:۲۴)

ہندوستان میں سیاسی فاتحین کی حیثیت سے مسلمانوں کی آمد سے قبل عرب اور ایرانی تاجروں کی حیثیت سے آباد تھے، بلکہ بعضوں نے گجرات کو اپنا وطن ثانی بنالیا تھا اور وہ یہیں پیوند خاک بھی ہوئے، ان کی زبانوں یعنی عربی اور فارسی سے یہاں کے لوگ مانوس تھے، اس جگہ مسجدوں اور مزاروں کے کتبوں کی چند شہادتیں آج بھی موجود ہے، جن کا خلاصہ یہ ہے:

گجرات پر ۹۶۱ء سے ۱۲۹۷ء تک سولنکیوں کا اقتدار اور دور دورہ تھا، پھر ۱۲۹۷ء سے ۱۵۷۳ء تک عنان حکومت اور باگ ڈور مسلمانوں کے قبضہ میں رہی، کرن دیو واگھیلا کے عہد میں گجرات میں اقتدار مسلمانوں کا تھا، اس سے کئی صدیوں پہلے مشرق وسطیٰ کے مسلمان گجرات کے مختلف مقامات پر چند افراد کے گروہ میں مجتمع ہوکر آبادی کی شکل میں بودوباش اختیار کر چکے تھے، یہ لوگ ناخدا اور تجار کی حیثیت سے مختلف مقامات میں خوشحالی سے زندگی گذارتے تھے، ۷۱۱ء تا ۷۱۲ء میں اہل عرب کے حملے سے پہلے ہی یہ لوگ آباد ہو گئے تھے۔

ڈاکٹر زیڈ. اے. دیسائی (Dr.Z.A.Desai) کی تحریر کے مطابق مسلمانوں کی آمد اولاً گجرات ہی میں بغرض تجارت ۶۳۶ء میں ہوئی، گجرات میں کھمبایت، انہل واڑ پٹن، بھروچ، ویراول، جونا گڈھ اور بھدریسور (کچھ) سے حاصل شدہ کتبات سے یہ بات درجۂ یقین تک پہنچ جاتی ہے کہ ان لوگوں کی بڑی بڑی آبادیاں ان شہروں میں آباد ہوئی تھی۔

قدیم مسلمان آبادیوں کے متعلق ہندوستان کے کسی بھی گوشہ اور خطہ سے کتبات جیسے ثبوت نہیں ملے، صرف گجرات ہی ایک ایسا صوبہ ہے جہاں سے حکومت ہند کے محکمۂ آثار قدیمہ نے بارہویں صدی کے مجموعی طور پر ۹ کتبات تلاش کر لئے، یہ اس دور کے ہیں جب گجرات میں برسراقتدار چانکیہ اور واگھیلا خاندان تھا، یہ تمام کتبات کھمبایت، ویراول، جوناگڈھ، انہل واڑ پٹن اور سومناتھ سے ملے، جو ۱۲۱۸ء سے ۱۲۹۱ء کے درمیان مکتوب ہیں، جب کہ شعبۂ تحقیق آثار قدیمہ کچھ بھوج کے تعاون سے حکومت ہند کے محکمۂ آثار قدیمہ کو جولائی ۱۹۶۱ء میں صرف بھدریسور ہی سے ۸/ کتبات ہاتھ لگے، اس سے یہ نتیجہ بلکہ یہ امر

پایۂ ثبوت کو پہنچتا ہے کہ تیرہویں صدی عیسوی میں مسلم آبادیاں کچھ میں اور بطور خاص بھدریسور میں زیادہ ہی تعداد میں بڑھی ہوگی، اتنا ہی نہیں بلکہ بھدریسور سے دستیاب ۸/ کتبات میں سے ۵/مؤرخ ہے یعنی ان پر تاریخ درج ہے اور ۳/غیر مؤرخ ہے، تاریخ والے ۵/کتبات بالترتیب سن عیسوی کے مطابق ۱۱۵۹، ۱۱۷۴، ۱۱۷۷ اور ۱۲۰۹ کے ہیں اور ایک کتبہ سن ۱۲۲۳ کا ہے، اس طرح آخر الذکر کتبہ کے علاوہ بقیہ ۴ کتبات گجرات سے حاصل شدہ ۹ کتبات سے قدیم اور پرانے ہیں۔

Annual Report on India EP Grapy for 1961-62

Appendix D میں حکومت ہند کے محکمۂ آثار قدیمہ نے بھدریسور سے تلاش شدہ ۸/ کتبات کی فہرست درج کی ہے، یہ کتبات ۲ جگہوں سے تحقیق وتلاش کر کے نکالے گئے ہیں: (۱) درگاہ لال (لعل) شاہ باز، یہ جین دھرم شالہ سے وسئ معبد (تیرتھ دھام) جاتے ہوئے دائیں طرف واقع ہے (۲) شش ودہ عمودی (سولہ ستون والا) جگد وشاہ داتار کا محل، یہ وسئ معبد (تیرتھ دھام) کے صدر گیٹ سے دکھائی دینے والا ویران اور کھنڈر محل، یہ تمام کتبات عربی زبان میں ہے اور اس کا خط Flowery کوفی (پھول دار کوفی جو عراق کے ایک قدیم ترین شہر کوفہ کی طرف منسوب ہے) ہے، اس کا شمار قدیم ترین خط میں ہوتا ہے، اس خط میں حروف کے موڑ اور پیچ وخم میں یہ خوبی ہے کہ ہر حرف کا موڑ اور پیچ وخم پھول کی شکل کا بنتا ہے۔ اگر عوام الناس میں سے کوئی اس کو دیکھے تو یہی سمجھے گا کہ یہ پھولوں کے ہار ہیں، آج بھی لال شاہ باز کی درگاہ کے اندرون وباہری گنبد کے نیچے ہر سو ۱۶ انچ کے عرض کی ایک تراشی ہوئی نقش شدہ پٹی ہے جس کو دیکھنے سے پھولوں کے ہار کی ڈیزائن اور نقش معلوم ہوتا ہے، لیکن در حقیقت وہ عربی تحریر ہے، اس درگاہ کے شمالی گیٹ کے اوپر جو نقش کندہ ہوا ہے وہ اچھی طرح پڑھا نہیں جا سکتا لیکن ڈاکٹر دیسائی کی رائے کے مطابق اس میں مذہبی تحریر مکتوب ہے، جب

کہ جنوبی دروازے پر قرآن کی آیات کندہ ہے جو اچھی طرح پڑھی جاسکتی ہے، اس دیوار پر قرآن شریف کی سورت نمبر ۳۹ کی آیت نمبر ۷۳ مکتوب ہے، اور اس کے مشرقی سمت کے کمرے کی مغربی دیوار پر جو کتبہ ہے اس میں سن ۵۵۴ھ ذوالحجۃ الحرام (دسمبر: ۱۱۵۹، جنوری ۱۱۶۰) مکتوب ہے، جب کہ اس کے احاطے میں ایک قبر ہے، جس کے سرہانے ایک ستون ہے، اس کی چاروں طرف کچھ لکھا ہوا ہے جس میں عبدالعزیز علی کی وفات کے بارے میں بھی لکھا ہوا ہے، اس کتبہ پر ''۲۰/شعبان ۵۶۹ھ مطابق ۲۶/ مارچ ۱۱۷۴ء منگل'' لکھا ہوا ہے اور قبر کی دیوار پر قرآن کی سورت نمبر ۹ کی آیت ۲۱، ۲۲ کندہ ہے اور یہ کتابت بھدریسور لال شاہ باز درگاہ سے دستیاب کتبات سے بھی پرانی ہے، جو اس بات کا دستاویز اور ثبوت ہے کہ بھدریسور اور اس کے قرب وجوار میں مسلمان آسودگی وخوشحالی کی زندگی گذارتے تھے۔ جنہوں نے ۸۰۰-۹۰۰ سال قبل اس سرزمین پر ایسی عمارتیں اور قبریں بنوائی ہو اور جنہوں نے ایسے کتبات بنوائے ہو جو بہت ہی محنت طلب اور جہد وسعی کے بعد وجود میں آسکتے ہیں، اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ وہ خوشحال اور اہل ثروت ہوں گے، مزید براں یہ کہ برادران وطن مسلمانوں کے ساتھ آپس میں تعظیم وتکریم اور اتفاق سے مل جل کر رہے ہوں گے۔

جگد وشاہ داتار کے محل جوشش ودہ عمودی کھنڈر سے معروف تھا، وہاں سے بھی ۳/ قبروں کا پتہ چلا ہے اور تینوں قبروں کے اوپر دونوں طرف کچھ لکھا ہوا ہے۔ ان تینوں میں سے ایک کتبہ جمادی الاولیٰ ۵۷۳ھ مطابق اکتوبر، نومبر ۱۱۷۷ کا ہے جس میں کسی کی تاریخ وفات درج ہے لیکن نام غیر واضح ہے جو پڑھا نہیں جاسکتا، دوسرے کتبہ پر بھی کسی کی وفات کے بارے میں لکھا ہے جس میں نام پڑھا نہیں جاسکتا، البتہ تاریخ واضح ہے، اس پر تاریخ شعبان

۶۰۵ھ مطابق: فروری، مارچ ۱۲۰۹ء درج ہے اور تیسرے کتبہ پر ۱۰ر شعبان ۶۲۰ھ مطابق ۸ر ستمبر ۱۲۲۳ء جمعہ مرقوم ہے۔

بھدریسور سے دستیاب یہ ۸ر کتبات تیرہویں صدی میں کچھ میں مسلم آبادیوں کی غمازی کررہے ہیں اور اس پر مزید تحقیقات محکمۂ آثار قدیمہ حکومت ہند کی طرف سے جاری ہے۔

واگھیلا خاندان کے ایک راجہ ارجن دیو کے دور کا ایک عربی کتبہ سومناتھ (پربھاس پاتن) سے ملا جس میں پانی کے جہاز کے مالک نورالدین فیروز کا نام درج ہے، یہ وہی کتبہ ہے جو ایک سنسکرت کتبہ سے عربی میں نقل کیا گیا ہے، اور اصل سنسکرت کتبہ آج بھی ویراول میں ہرسد ماتا کے مندر میں محفوظ ہے، لوگوں کا عقیدہ یہ ہے کہ یہ کتبہ کسی مسجد سے نکال کر اس مندر میں لگایا گیا ہوگا، اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ اس دور میں مسلمان اور برادران وطن ہندو اتفاق، Cathlicity اور Tolerance سے رہتے تھے، بھوج (Bhuj) کے عالی والا (اعلی والا) مقام سے بھی ایک کتبہ دستیاب ہوا ہے جس میں اوپر سنسکرت زبان میں لکھا ہوا ہے اور اسی سے متصل نیچے عربی میں لکھا ہوا ہے، اس پر بھی تحقیقات جاری ہے۔

(آب حیات کچھ، مترا، ہفت روزہ ۲۲ر دسمبر ۶۳، اکابرین گجرات، گجراتی: ۳۰/ ۱۹-۲۳)

اب مساجد و مزارات کے تاریخی کتبات کی چند شہادتیں پیش خدمت ہے:

(۱) تعمیر مسجد بمقام سومناتھ پٹن (کاٹھیاواڑ) سنہ ۶۶۲ھ مطابق: ۱۲۶۴ء۔

(۲) کتبۂ تاریخ وفات تاجر شمس الدولت والدین حسن بن محمود بن علی العراقی بمقام سومناتھ پٹن ۶۶۹ھ/ ۱۲۹۹ء۔

(۳) کتبۂ تاریخ وفات معلم ابن حسن کھنباتی بمقام راندیر ۶۳۳ھ مطابق: ۱۲۳۶ء

(۴) تاسیس مسجد بمقام جوناگڈھ ۶۸۵ھ مطابق: ۱۲۸۶ء۔

(۵) کتبۂ تاریخ وفات فخر الدین ابراہیم بن عبدالملک بن صدیق شہر زوری ۶۸۱ھ مطابق: ۱۲۸۲ء کھنبایت۔

(۶) کتبۂ تاریخ وفات زین الدین بن سالار ۶۸۵ھ مطابق: ۱۲۸۷ء کھنبایت۔

(۷) کتبۂ تاریخ وفات ملک التجار حاجی ابراہیم بن محمد علی الایبلی المعروف بہ فتولیا، ۶۹۰ھ مطابق: ۱۲۹۱ء کھنبایت۔

(۸) کتبۂ تاریخ وفات شمس الدین محمد بن علی بن یحیی الزجری، ۷۰۷ھ، مطابق: ۱۲۰۷ء کھنبایت۔

(۹) کتبۂ تاریخ وفات مصباح آزاد غلام زین الدین مظفر الملازوری، ۷۰۹ھ، مطابق: ۱۳۰۹ء کھنبایت۔

(۱۰) کتبۂ تاریخ وفات امین الدین کافور آزاد غلام مرحوم شرف الدین نہدی بن محمد الہمدانی ۷۱۳ھ مطابق: ۱۳۱۴ء کھنبایت۔

(۱۱) تعمیر مساجد از ملک شمس الدین، ۷۱۸ھ مطابق: ۱۸۱۳ء مقام دھولکا، ضلع: احمد آباد، کھنبایت۔

(۱۲) کتبۂ تاریخ وفات زین الدین علی بن نجیب الخوری ۷۳۱ھ مطابق: ۱۳۳۱ء کھنبایت۔

(۱۳) کتبۂ تاریخ وفات حسن بن ابوبکر علی گڑھ، ۷۳۴ھ مطابق: ۱۳۳۳ء کھنبایت

اسی طرح مشہور صوفی سلاسل میں سے نظامی وسہروردی سلسلہ کے بزرگوں نے پٹن کو بالخصوص مرکز توجہ بنایا، سلطان المشائخ کے تین خلفاء-سید موسیٰ وراق الحسنی الچشتی، مخدوم سید حسین خنگ سوار اور شیخ حسام الدین عثمانی - پٹن کے بزرگوں میں معروف ہیں، البتہ اولیت کا شرف شیخ حسام الدین کو حاصل ہے جو ۶۹۵ھ میں پٹن آئے اور ۴۱/ برس تک رشد و ہدایت کا مرجع بنے رہے، ۱۸/ ذوالقعدۃ الحرام ۷۳۷ھ میں وفات پائی، جب کہ سید حسین ۷۳۰ھ

میں پٹن میں آئے اور ۷۹۸ھ میں پیوند خاک ہوئے، پھر اور ایک ولی صفت انسان شیخ جمال الدین اچی ۷۳۰ھ میں پٹن پہنچے، پندرہ سال تک فیوض وارشادات سے سیراب کرنے کے بعد ۷۴۵ھ میں وفات فرما گئے، حضرت چراغ دہلوی کی بھی پٹن کو خصوصی توجہ حاصل رہی، چنانچہ ان کے قریبی مرید شیخ سراج الدین پٹن ہی میں آرام فرما ہیں۔

۷۴۳ھ میں ابن بطوطہ کھنبایت پہنچا تھا، اس نے وہاں کی مساجد کی تعریف کی ہے اور دو خانقاہوں کا بالخصوص ذکر کیا ہے، ایک حاجی ناصر کی جو عراق کے باشندے تھے اور دوسری خواجہ اسحاق کی جہاں فقیروں کے لئے لنگر تقسیم ہوتا تھا۔

عرب تاجروں کے علاوہ مسلمان سپاہی بھی ہندو سلطنتوں کی افواج میں ملازم تھے، مثلاً سومناتھ کے راجہ کی فوج میں مسلمان افسروں کی ایک تعداد تھی، احمد آباد کی قصباتی حضرات کا کہنا ہے کہ وہ ان خراسانی سپاہیوں کی اولاد میں سے ہیں، جو واگھیلا راجاؤں کی فوج میں ملازم تھے۔

پھر کچھ عرصہ گذرا تھا کہ حکومت وسلطنت کی خاطر ہونے والی خانہ جنگیوں کی وجہ سے جہاں دیگر علاقے فتنہ وفساد اور بغاوت کی لپیٹ میں آ گئے تھے، وہیں گجرات بھی اس فتنہ سے محفوظ نہ رہ سکا تھا، چنانچہ جب گجرات کے گورنر نے بغاوت کی تو محمد شاہ نے اپنے ایک امیر ظفر خان کو ۷۹۳ھ میں گجرات کی حکومت دے کر روانہ کیا، جس نے سب سے پہلے بغاوت کی آگ بجھائی اور ملک میں ایسا انتظام وبندوبست کیا کہ بہت جلد سکون واطمینان کی فضا قائم ہوگئی، ساتھ ہی ساتھ حدود حکومت میں بھی اضافہ ہوگیا۔ (ملخص از یاد ایام، ص: ۴۷-۵۰)

پھر علماء ومشائخ کی استدعا اور اپنے بڑے بیٹے تاتار خان کے اصرار بلیغ سے ۸۱۰ھ میں اس نے مظفر شاہ لقب اختیار کر کے اپنی خود مختاری کا اعلان کر دیا، دہلی مرحوم کے تباہ شدہ

خاندانوں کو جو افتاں وخیزاں گجرات پہنچ گئے تھے، اپنے سایۂ عاطفت میں جگہ دی، علماء ومشائخ کو باطمینان زندگی بسر کرنے اور دل جمعی کے ساتھ اپنے فرائض منصبی کے ادا کرنے کے سامان مہیا کردیئے اور ۸۱۴ھ میں نیک نامی کے ساتھ سفرآخرت اختیار کیا۔

اسی طرح گجرات میں اور بالخصوص احمدآباد میں سلسلۂ نظامیہ سے زیادہ سلسلہ سہروردیہ نے فروغ پایا، احمدآباد کی تعمیر سے پہلے ہی پٹن کی جانب اس سلسلہ کے اخوان باصفا کا ورود مسعود شروع ہوچکا تھا، حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشت کے بھائی سید راجو قتال نے گجرات کو خصوصی توجہ دی، آپ کے کئی مرید مثلاً سید محمد خدا بخش، سید احمد مخدوم جہاں شاہ وغیرہ پٹن ہی میں مدفون ہیں، آپ ہی نے حضرت قطب عالم کو دو سال تک خصوصی تعلیم دے کر اہل گجرات کی تربیت کے لئے روانہ فرمایا، چنانچہ قطب عالم اپنی والدہ محترمہ کی معیت میں پہلے پٹن تشریف لائے اور احمدآباد کی تعمیر مکمل ہوجانے پر سلطان احمد کی درخواست پر احمد آباد منتقل ہوگئے۔ یہاں اس بات کا تذکرہ بے موقع نہ ہوگا کہ نیک نیتی کے ساتھ تعمیر کیا گیا یہ شہر احمدآباد بزرگانِ دین کی دعاؤں اور شاہان گجرات کے اقبال کے طفیل جلد ہی عروج کی راہ پر لگ گیا اور بزرگانِ دین، علماء وفضلاء اس کثرت سے وارد ہونے لگے کہ ایک زمانہ میں اسے دہلی پر فضیلت دی جانے لگی۔

علمی تعلقات :

ابتدائی دو صدیوں کی آمد ورفت کے نتیجہ میں گجرات کے کناروں پر واقع متعدد بندرگاہوں میں مسلمانوں کی نوآبادیاں قائم ہوگئیں، جن کی شہادت تیسری اور چوتھی صدی ہجری میں گجرات میں آنے والے عرب سیاحوں نے دی ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ قرب مکانی کے باعث حجاز، یمن، بصرہ وغیرہ سے سمندری راستوں

کے ذریعہ گجرات تک آمدورفت آسان ہونے کے سبب سے بڑی تعداد میں مہم جو تاجر پیشہ افراد اور خاندان یہاں مختلف جگہوں پر آباد ہوگئے، ان آباد ہونے والوں نے مسجدیں اور درس گاہیں قائم کیں، جن کے ذریعہ ابتدائی سطح پر دینی تعلیم کی بنیاد پڑی۔

دوسرا سبب گجرات کے سلاطین وامراء کی علم دوستی اور علم پروری تھا، گجرات میں مسلمانوں کے اقتدار کے قیام سے پیشتر جو راجپوت راجے مہاراجے حکومت کرتے تھے، وہ بھی وسیع المشرب اور روشن خیال حکمران تھے۔

سلطان احمد شاہ اول کی علم پروری کی شہرت حجاز ومصر تک پہنچ چکی تھی، ان کی شہرت سن کر سب سے پہلے بدرالدین دمامینی (متوفی ۸۲۷ھ/۱۴۲۴ء) نامی مصر کے عالم محدث نے ۵۷/سال کی پختہ عمر میں گجرات کا سفر اختیار کیا اور کھمبایت نیز پٹن میں قیام کرکے اپنی تصانیف سلطان احمد شاہ اول کو منسوب کیں، سلطان احمد شاہ اول عدل وانصاف، تقوی وپرہیزگاری اور سخاوت کے معاملہ میں بے نظیر تھے، سن بلوغ سے لے کر آخری عمر تک ان کی صبح کی نماز کبھی قضاء نہیں ہوئی تھی۔

سلطان احمد شاہ کے پوتے فتح خان عرف سلطان محمود شاہ بیگڑہ کا پچاس سالہ دور حکومت گجرات میں علوم دینیہ کی ترقی کا زرین دور شمار ہوتا ہے، ان کا دربار عرب اور دیگر ممالک کے علماء دین سے ہمیشہ بھرا رہتا تھا، ان کے زمانۂ حکومت میں حجاز، یمن اور مصر سے گجرات آنے والے مشاہیر علماء ومشائخ میں علامہ ابن سوید، حدیث میں جن کی فضیلت کے پیش نظر سلطان محمود نے انہیں ملک المحدثین کا خطاب عطا کیا تھا، سب سے زیادہ قابل ذکر ہیں، سلطان مظفر ثانی کی سرپرستی حاصل کرنے والوں میں قاضی جمال الدین بحرق اور شیخ ابو القاسم ابن فہد کا بھی شمار ہوتا ہے، جو اپنے وقت کے اکابر علما میں سے تھے، گجرات میں آکر علوم دینیہ کی خدمت اور اس کی اشاعت کرنے والے علماء کی فہرست بہت طویل ہے، یہاں صرف مشاہیر علماء کے نام لئے جاتے ہیں:

(۱)علامہ شہاب الدین عباسی مصری (۲)حافظ نورالدین ابوالفتاح الطاؤسی (۳) شیخ بن عبداللہ العیدروس (۴)علامہ جمال الدین محمد العمودی (۵)ابوالسعادات الفاکہی (۶) مولانا نورالدین شیرازی۔

مذکورہ بالاعوامل کے نتیجہ میں گجرات کے تعلقات حجاز، یمن اور مصر کے ساتھ قریب سے قریب تر ہوتے گئے، گجرات کے چند بڑے شہر مثلاً احمد آباد، پٹن، بھروچ اور سورت تو ملک حجاز کا حصہ معلوم ہونے لگے تھے، ان تعلقات میں حکومت اور سیاست کو بہت زیادہ دخل نہیں تھا، ان کی بنیاد تجارت، ثقافت اور تعلیم وتعلم کے عمل پر رکھی گئی تھی، ان سے دونوں طرف کے عوام وخواص متاثر ہوئے تھے، ان کا اندازہ اس سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ عرب مؤرخین نے اپنی تصانیف میں گجرات کو اہم مقام عطا کیا اور گجراتیوں کے علوم دینیہ کے میدان میں کارہائے نمایاں کا خاص ذکر کیا ہے۔(گجرات کے علماء حدیث وتفسیر:۶)

ہندوستان کے باشعور مؤرخوں مثلاً مولانا سید حکیم عبدالحی اور علامہ سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی عربوں کے ساتھ تعلقات اور علوم دینیہ کی اشاعت میں گجرات کے خاص مقام کو تسلیم کیا ہے۔علامہ سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ ایک مقالہ میں رقم طراز ہیں:

> درحقیقت عرب اور ہندوستان کو ایک کرنے کی سعادت سلاطین گجرات کی قسمت میں تھی .....احمد شاہ اول وہ خوش قسمت سلطان ہے، جس نے گجرات کو عرب اور ہندوستان کے بیچ میں سلسلۃ الذہب بنادیا، علامہ نے اس بات کا بھی ذکر کیا ہے کہ سفر کی آسانی اور آمدورفت کی کثرت نے علماء ہند کو حجاز سے اور وہاں کے علوم سے آشنا ہونے کا موقع بہم پہنچایا۔(ہندوستان میں علم حدیث، معارف، ج:۲۲،نمبر:۴، بابت اکتوبر،نومبر،دسمبر:۱۹۲۸ء)

سلاطین کے علاوہ گجرات کے امیروں نے بھی علماء دین کی سرپرستی اور خاص طور سے عرب ممالک سے آنے والوں کی ہمت افزائی کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی تھی، گجرات کے علم پرور امراء میں ریحان بجلی خان (متوفی ۹۷۹ھ/ ۱۵۷۱ء) رجب خداوند خان (متوفی ۹۶۸ھ/ ۱۵۶۰ء) شیخ سعدی سلطانی (جو سیدی سعید کے نام سے اور احمد آباد کی تاریخی مسجد یعنی جالی والی مسجد کے بانی کی حیثیت سے مشہور زمانہ ہیں) اور محمد الغ خان کا شمار ہوتا ہے، گجرات کے ایک وزیر آصف خان تو خاص طور سے قابل ذکر ہے، سلطان بہادر شاہ نے گجرات پر ہمایوں کے حملہ کے پیش نظر، اپنے وزیر آصف خان کو بیگمات اور کنبے کے تمام افراد کو لے کر حجاز بھیج دیا تھا، آصف خان نے مکہ میں دس سالہ طویل قیام کے دوران وہاں کے علماء کی حتی المقدور اعانت اور نصرت کی تھی، آصف خان نے مکہ مکرمہ میں باب العمرہ کے قریب مدرسہ قائم کیا، جس میں حنفی اور شافعی مسلکوں کی تعلیم کا انتظام تھا، اس مدرسہ کے ناظم کے طور پر مکہ مکرمہ کے اس وقت کے مفتی اور شافعی عالم شیخ عبدالعزیز زمزمی اور محدث، مؤرخ و مصنف ابن حجر ہیثمی کو مقرر کیا گیا تھا، شہاب الدین احمد بن حجر آصف خان کی سوانح حیات ''ریاض الرضوان'' نامی کتاب میں لکھتے ہیں: صف خان کے ۹۵۵ھ/ ۱۵۴۸ء میں گجرات واپس لوٹنے کے بعد بھی شیخ عبدالعزیز زمزمی جب کبھی اپنا کلام حجاز سے آصف خان کو ارسال کرتے تو یہ مخلص اور قدر دان امیران کو برابر ۱۵۰۰/ اشرفیوں کا ہدیہ روانہ کرتے تھے، آصف خان کی وفات (۹۶۱ھ/ ۱۵۵۳ء) کی خبر جب مکہ پہنچی تو وہاں حزن و ملال کا ایک بادل سا چھا گیا اور شیخ زمزمی نے ۸۷/ اشعار کا ایک مرثیہ بھی لکھا۔

حرمین شریفین سے تعلقات :

سلطان محمود بیگڑہ نے مکہ میں ایک رباط تعمیر کی تھی، جس کا نام الکنبایتیہ رکھا گیا تھا اور

جس میں طلباء کو دینی تعلیم دی جاتی تھی، نیز ان کے اخراجات کے لئے وظیفوں کا بھی انتظام کیا گیا تھا، سلطان محمود کے بیٹے اور تخت کے وارث سلطان مظفر شاہ دوم نے مکہ میں ایک ایسی رباط تعمیر کروائی تھی؛ جس میں ایک مدرسہ، پانی کی سبیل اور دیگر عمارتیں شامل تھیں اور جن کے مصارف کے لئے یہاں گجرات میں زمین اور جاگیر کی صورت میں اوقاف قائم کئے تھے، جن کی آمدنی کی رقومات حج کے دنوں میں حجاز بھیجی جاتی تھیں، ان رقومات کو مدرسوں، طالب علموں، خدمت گاروں وغیرہ میں تقسیم کیا جاتا تھا، ان کے علاوہ حرمین شریفین کے باشندوں پر بھی خرچ کیا جاتا تھا، سلطان مظفر شاہ دوم اچھے کاتب بھی تھے، انہوں نے اپنے ہاتھ سے خط ثلث میں، آب زر سے کتابت کئے ہوئے کلام پاک کے دو نسخے حجاز اس لئے بھیجے تھے کہ وہاں ان کا دور کیا جائے، سلطان نے حرمین کے قاریوں کے وظائف کی ادائیگی کے لئے بھی الگ اوقاف قائم کئے تھے، جن کی آمدنی کی رقومات قاریوں کے علاوہ، ختم قرآن کریم کے موقع پر سلطان کے لئے دعائیں کرنے والوں، ان کے خادموں؛ نیز دیگر عملے کو بھی دی جاتی تھیں، حرمین شریفین کے باشندوں کے لئے رقومات بھیجنے کے علاوہ سلطان کی طرف سے ہر سال قیمتی ہندوستانی کپڑوں اور اشیاء سے لدے ہوئے جہاز بھی جدہ بندرگاہ بھیجے جاتے تھے۔

سلطان محمود سوم جو گجرات کے آخری قابل ذکر سلطان ہیں، انہوں نے بھی اپنے اجداد کی روایتوں کو قائم رکھتے ہوئے مکہ مکرمہ میں مولد النبی صلی اللہ علیہ وسلم کے قریب سوق اللیل میں ایک ایسی رباط قائم کی تھی، جس میں ایک قدیم پانی کا چشمہ بھی تھا، اس میں مدرسہ، پانی کی سبیل، یتیم خانہ اور اقامتی کمرے بنے ہوئے تھے، انہوں نے ایک اور رباط باب العمرہ کے قریب اور ایک سبیل شاہراہ جدہ پر بھی تعمیر کی تھی، علم اور علماء کی سرپرستی کے سلسلہ کا

ان کا بہترین کارنامہ تو وہ ہے کہ حضرت شیخ علی متقی رحمۃ اللہ علیہ جو گجرات کے اعلی پایہ کے بزرگ اور عالم حدیث وتفسیر تھے، ان کی اقامت گاہ اوراس کے ساتھ تعلیمی درجات اور طلباء کے لئے رہائشی کمرے بھی بنائے تھے، یہ سب عمارتیں سوق اللیل میں تعمیر کی گئی تھیں، سلطان محمود نے حرمین شریفین کے ہر طرح کے جملہ اخراجات کے لئے گجرات میں کھمبایت اور بھروچ کے قریب گندھار بندرگاہوں کے آس پاس کے گاؤں وقف کئے تھے، جن کی سالانہ آمدنی ایک لاکھ اشرفیوں (سونے کے سکوں) کے برابر تھی، ان رقومات سے مال تجارت مثلاً نیل، کپڑا وغیرہ مقامی طور پر خرید کر شاہی جہازوں میں لاد کر گھوگھا بندرگاہ سے جدہ کے لئے سرکاری خرچ پر روانہ کیا جاتا اور وہاں بازار میں فروخت کر کے جو رقم حاصل ہوتی وہ اتنی ہوتی کہ سال بھر کے اخراجات کے لئے کافی ہوجایا کرتی تھی، اسی سلطان مظفر شاہ سوم نے اپنی شہادت سے پیشتر ایک ہزار سنڈا (ٹوکرے) نیل حجاز بھیجی تھی؛ تاکہ اس کی آمدنی سے وہاں شاہراہ مدینہ پر کویں کھودے جاسکیں۔

مدت سے یہ دستور چلا آتا تھا کہ سلطنت تیموری ہر سال ہندوستان کی طرف سے ایک امیر حاج مقرر کر کے اس کے ساتھ چار لاکھ روپیہ مکہ معظّمہ اور مدینہ منورہ کی خدمت گذاری کے لئے بھیجا کرتی تھی، اکبر نے بھی اس رسم کو جاری رکھا، یہ روپیہ عموماً گجرات کے خزانہ سے بھیجا جایا کرتا تھا، اسی لئے گجرات کی تاریخوں میں اس کا بکثرت ذکر ہے، شوال المکرّم ۹۸۶ھ میں جب اکبر اجمیر میں تھا، خواجہ احرار کی اولاد میں سے خواجہ محمد یحیی کو میر حاج بنا کر اور چار لاکھ روپیہ ساتھ دے کر مکہ معظّمہ روانہ کیا، ۹۸۷ھ میں میر ابوتراب میر حاج بنائے گئے اور لاکھوں روپئے مع نقد وسامان ان کو دیئے گئے تاکہ شریف مکہ کے مشورہ سے وہاں علماء، مشائخ اور فقہاء میں تقسیم کردیئے جائیں۔

''مرآۃ احمدی'' میں ہے کہ شاہ جہاں نے ۱۰۴۱ھ میں دیوان خواجہ جہاں کو حرمین کی اجازت دی، پانچ لاکھ روپئے تاجپوشی کی نذر مانی تھی، ازاں جملہ فی الحال ۲؍لاکھ ۴۰؍ہزار روپیہ کا مال حسب مذاق اہل عرب احمد آباد اور سورت سے خرید کر خواجہ صاحب کے ساتھ بھیجنے کا حکم متصد یانِ صوبۂ گجرات کے نام صادر ہوا، حکیم مسیح الزمان بھی رخصت حج لے چکے تھے، حکم میں لکھا تھا کہ سارا مال انہی کی رائے سے تقسیم ہوگا۔

۱۰۴۷ھ میں حکیم ابوالقاسم حکیم الممالک کو اجازت حج وزیارت ملی اور متصد یان گجرات کے نام حکم صادر ہوا کہ ۶۰؍ہزار کا اسباب من جملہ رقم نذر دی جائے۔

ثقافتی تعلقات :

مختلف تجارتی، معاشرتی اور سیاسی تعلقات کا یہ نتیجہ ہوا کہ سندھ، گجرات، کارومنڈل، پلسار، مالدیپ، سراندیپ اور جاوہ میں اسلام نے اپنے قدم آہستہ آہستہ بڑھانے شروع کئے، ان جزیروں میں ایک طرف ہندوؤں اور دوسری طرف جینیوں کے اثر سے بودھ مت پھیلا ہوا تھا، مگر صدی بصدی کے جغرافیوں اور سفر ناموں کی کتابوں کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ لڑائی بھرائی کے بغیر پورے امن اور چین کے ساتھ اسلام کے اثرات یہاں بڑھتے جاتے ہیں اور دونوں قوموں کے لئے ایک دوسرے سے واقفیت کا موقع بہم پہنچ جاتا ہے۔

سندھ پر ۹۲ھ میں عربی حکومت قائم ہوجانے کے بعد تعلقات میں مزید اضافہ ہوا، اور ''راشت کٹ'' خاندان (اس کو عرب وَلَہَبْ رائے کہتے ہیں، مان کھیڑ اس کا دارالحکومت تھا) کے برسر حکومت ہونے کے بعد دونوں میں جو معاہدے ہوئے ان سے تعلقات اور زیادہ وسیع ہوگئے، تجارتی، علمی، مذہبی ہر قسم کے فوائد کے حصول کے لئے عرب بڑی تعداد میں آنے لگے، سومناتھ، کھنبایت، بھروچ، چیمور (متصل بمبئی) سوپارہ، تھانہ میں ان کی بڑی بڑی کوٹھیاں قائم ہوگئیں۔ ہارون رشید کے عہد میں یحیی برمکی کی رائے سے ایک وفد علمی تحقیقات

کے لئے یہاں آیا، جس نے واپس ہو کر ایک رپورٹ پیش کی، جس کا خلاصہ ابن ندیم نے اپنی کتاب میں دیا ہے۔ اسی طرح مفرد دواؤں کی تلاش وجستجو کے لئے بھی ایک وفد یہاں آیا تھا، ہارون رشید نے اپنے علاج کے لئے ایک طبیب (وید) بھی بغداد میں بلوایا تھا، اور جب اس کے علاج سے صحت یاب ہو گیا تو بلخ کے راستہ سے اس کو ہندوستان واپس کیا۔ کچھ لوگوں کو سنسکرت کتابوں کے عربی میں ترجمہ کرنے کے لئے بیت الحکمت میں مقرر کیا گیا، جنہوں نے سنسکرت کی بہت سی کتابوں کا ترجمہ کیا۔

دورِ عباسی کے ادبیات کے مطالعہ کے دوران ہمیں یہ نظر آتا ہے کہ ہندوستانیوں کی ثقافتی سرگرمیاں اس وقت (دورِ عباسی) بغداد میں پائی جاتی تھیں، سندھ اور جنوبی ہندوستان کے صوبہ گجرات کی بہت سی عورتیں اس وقت بغداد آ چکی تھیں اور خلفاء کے شاہی محلات میں زندگی گزار رہی تھیں، شہر بغداد کے بازار اور محفلیں ان سے بھری ہوتی تھیں، نیز بعض ہندوستانی عورتیں بحیثیت نگران وبچوں کی دایا اور مغنیہ عربوں کے گھروں میں داخل ہو چکی تھیں اور ان ہندوستانی عورتوں میں سب سے زیادہ مشہور خمار گندھار (ضلع بھروچ) تھیں، جس کا قصہ حذیفہ بنت ہارون بن عبداللہ الربیع نے یوں بیان کیا ہے کہ وہ شہر گندھار کی تھیں، خدیجہ کے دادا نے دولاکھ درہم میں اس کو خریدا تھا، وہ بہت دلربا، خوب صورت آواز کی مغنیہ تھیں، الأغانی کے مصنف نے اس کے پڑھے ہوئے بعض اشعار اپنی کتاب میں نقل بھی کئے ہیں۔

ادب عربی کے مطالعہ کرنے والے کو ادب عربی میں اس وقت بعض ہندوستانی اثرات نظر آئیں گے، خصوصاً عربی قصے کہانیوں میں، چنانچہ متعدد ہندوستانی قصے عربی زبان میں منتقل ہوئے، جیسے کلیلہ دمنہ، الف لیلہ اور سندباد وغیرہ کے قصے اور ان قصوں کو بڑی مقبولیت بھی حاصل ہوئی۔

مولانا یوسف نگرامی اپنی کتاب ''العلاقة السياسية والثقافة بين الهند والخلافة العباسية'' **میں ''کلیلہ ودمنہ'' کے تاریخی پس منظر کو بیان کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:**

ان كتاب كليلة ودمنة يعتبر من انتاج الهند و هناك قول عن سبب تأليف هذا الكتاب،ان الهند كانت تواجه الفساد والطغيان ولذلك فوض الملك دابشليم الى بيد با ان يكتب كتابا باللغة السنسكريتية يشتمل على النصح والعبر لكى يسود السلام والأمن.

بلاشبہ ''کلیلہ ودمنہ'' ہندوستان کی تخلیق سمجھی جاتی ہے،اس کتاب کے سبب تالیف میں یہ بات بیان کی جاتی ہے کہ ہندوستان چوں کہ فساد وبگاڑ اور سرکشی کا سامنا کرر ہا تھا،اس لئے بادشاہ دبشلیم نے بید با فلسفی کو یہ کام سپرد کیا کہ وہ سنسکرت زبان میں ایک ایسی کتاب لکھے، جو پند ونصائح پر مشتمل ہو؛ تاکہ اس کے ذریعہ امن وسلامتی کا دوردورہ ہواور صلح اور آشتی قائم ہو۔

من كان هذا الملك،وكان يحكم اى منطقة من الهند ؟

لیکن سوال یہ ہے کہ بادشاہ کون تھا اور ہندوستان کے کس علاقہ پر حکومت کرتا تھا؟

ان لدينا بعض القرائن بناءً على ذلك يمكن ان تحدد هذا الملك ، وأغلب الظن أنه كان ملك،(وبهدات) الذى كان يحكم كجرات لان ابن حوقل كتب عنه ملك كتاب الامثال. (ابن حوقل،ص:۲۲۵)

بعض قرائن کی بنیاد پر یہ تعیین کرنا آسان ہے کہ یہ بادشاہ کون تھا؟ چنانچہ غالب گمان یہ ہے کہ بادشاہ ''بھدات'' تھا، جو گجرات کے علاقہ پر حکومت کرتا تھا،اس لئے کہ ابن حوقل نے اس کے بارے میں ''ملک کتاب الامثال'' (یعنی کہاوتوں والی کتاب والا بادشاہ) لکھا ہے۔

وكان هذا الملك يعرف باسم دابشليم والدليل على ذلك مايقوله صاحب تاريخ فرشته عندما هاجم محمود الغزنوى غجرات ان الاسرة الحاكمة

عن غجرات كانت معروفة بلقب دابشليم. (تاریخ فرشتہ ص:۲۱۲)

نیز یہ بادشاہ دابشلیم کے نام سے معروف مشہور تھا، اس کی دلیل ''تاریخ فرشتہ'' کے مصنف کا بیان ہے کہ جس وقت محمود غزنوی نے گجرات پر حملہ کیا، اس وقت گجرات پر حکومت کرنے والا خاندان ذبشلیم کے لقب سے معروف تھا۔

ومن ناحية أُخرى ان المؤرخ اليعقوبى قد اقر ان بيدبا قد كتب هذا الكتاب فى عهد دابشليم. (تاریخ یعقوبی:۱/ ۶۹)

دوسری طرف مؤرخ یعقوبی نے بڑے پرزور انداز میں یہ بیان کیا ہے کہ بیدبا فلسفی کی یہ کتاب (کلیلہ ودمنہ) دابشلیم ہی کے عہد میں تالیف کی گئی ہے۔

کلیلہ ودمنہ نے عربی ادب پر جو اثرات چھوڑے اس کو ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

وقد كان لكتاب كليلة ودمنة اثر كبير فى الادب العربى وعنى الناس به عناية كبرى، وحذوا حذوه من ذلك ان كثيرين نظموه مثل أبان اللاحقى وابن الهاربة فى كتابه "نتائج الفطنة" وحذا حذوه كتّاب كثيرون، فابن الهبارية الّف على منواله كتاب "الصادح والباغم" وكذلك الف على منواله "سلوان المطاع فى عدوان الطباع" لابى عبدالله محمد بن ابى القاسم القرشى.

اور ''کلیلہ ودمنہ'' نامی کتاب کا ادب عربی میں بڑا اثر ہے، لوگوں نے اس پر بڑی توجہ دی ہے اور اس کے نقش قدم پر چلے ہیں، یہی وجہ ہے کہ بہت سے شعراء وادباء نے اس کو منظوم کیا ہے، جیسے ابان لاحقی اور ابن هباريه نے اپنی کتاب ''نتائج الفطنه'' میں اس کو منظوم کیا ہے، نیز بہت سے مصنفین نے اسی طرز نگارش کو اپنایا ہے اور اسی کے نقش قدم کی اتباع کی ہے؛ چنانچہ ابن الهباريه نے اس طرز واسلوب پر ''الصادح والباغم'' نامی کتاب تالیف کی ہے، اسی طرح ابوعبداللہ محمد بن ابوالقاسم قرشی نے بھی ''سلوان المطاع فى

عدوان الطباع ''اسی طرز پر تالیف فرمائی ہے۔

ویذکر کشف الظنون ان ابا العلاء المعری الف کتاباً اسمہ " القائف" علی مثال کلیلة ودمنة وھو فی ستین کراسة ولم یتمہ وان لہ کتاب "منار القائف" یتضمن تفسیرہ فی عشرة کراریس.

صاحب ''کشف الظنون '' بیان فرماتے ہیں کہ ابوالعلاء معری نے ''کلیلہ ودمنہ'' کے طرز پر ''القائف'' نامی کتاب تالیف کی ہے، جو ساٹھ دفاتر میں موجود تھی ،مگر افسوس کہ یہ کتاب پایۂ تکمیل تک نہیں پہنچ سکی، نیز ''منار القائف ''ان کی دوسری تالیف ہے، جس کی تفسیر وتوضیح دس کاپیوں پر مشتمل تھی۔

عربی لغات کا طریقۂ کار اور منہج متعین کرنے میں بھی ہندوستان نے اپنا اثر ڈالا اور اس کے زیر اثر سب سے پہلے جس شخص نے یہ کام کیا ، وہ امام نحو ولغت خلیل بن احمد متوفی ۱۷۵ھ ہیں۔ڈاکٹر شوقی فرماتے ہیں: خلیل نے ہندوستانیوں کی لغات کے حروف کی ترتیب میں ان سے متاثر ہوکر حروف کے نمونوں کی ترتیب پر عربی میں لغت تیار کی اور اس رائے کی تائید ''بیرونی'' کی اس تحریر سے بھی ہوتی ہے: ''بہت ممکن ہے کہ خلیل بن احمد نے یہ سنا ہو کہ ہندوستانیوں کے اشعار کے باب میں کچھ موازین ہیں، جیسا کہ ان کے بارے میں بعض لوگ خیال کرتے ہیں۔''

سندھ اور گجرات میں شیعیت کا آغاز :

ملتان کے اسماعیلی حکمران نے سالہا سال کی جدوجہد کے بعد اقتدار حاصل کر کے مصر وافریقہ کی فاطمی حکومت سے اپنا الحاق کر لیا تھا اور وہ اپنے اس مرکز کی مرضی اور اجازت کے بغیر کوئی کام نہیں کرتے تھے،سندھ سے لے کر افریقہ تک ہدایہ وتحائف کا سلسلہ جاری تھا

اور دونوں طرف سے نامہ وپیغام اور آدمیوں کی آمد ورفت جاری تھی، حتی کہ چند ہی سال کی حکومت میں یہاں اسماعیلی شیعوں نے یوں جڑ پکڑ لی کہ آج تقریبا چار سو سال سے ہندوستان ان کی دعوت کا مرکز ہے، اگرچہ ۳۹۶ھ میں سلطان محمود غزنوی کے ہاتھوں ملتان کی باطنی حکومت ختم ہوگئی تھی، لیکن باطنیوں کی طاقت اندر ہی اندر زور پکڑ رہی تھی اور غوریوں کے زمانہ میں وہ کبھی کبھی کھل کر مقابلہ اور کشت وخون پر بھی اتر آتے تھے، چنانچہ انہوں نے شہاب الدین غوری کے زمانہ میں پنجاب میں بڑی خطرناک صورت اختیار کرلی تھی اور ۶۳۴ھ میں قتل وغارت کر کے دہلی سلطنت پر قبضہ کرنا چاہا تھا۔

اس ملک کی باطنی تحریک کے بارے میں معلومات بہت ہی کم ہیں کیوں کہ یہ مذہب اپنی ہر بات کو خفیہ رکھنے میں کامیابی سمجھتا ہے؛ البتہ زمانۂ حال کے ایک اسماعیلی فاضل ڈاکٹر ہمدانی مرحوم نے اپنی کتاب ''الصليحيون والحركة الفاطمية'' میں اسماعیلیت کے ہندوستان میں فروغ کی مختصر تاریخ لکھی ہے، اس کا خلاصہ ہم کتاب کے آئندہ اوراق میں تفصیلاً درج کریں گے، یہاں مختصر صورت حال پر اکتفاء کرتے ہیں: شمالی افریقہ میں فاطمی حکومت سے کچھ پہلے تیسری صدی کے آخر میں فاطمی ائمہ دنیا کے مختلف بلاد وامصار میں اپنے داعی اور مبلغ بھیجتے تھے، اسی ضمن میں انہوں نے ہندوستان میں بھی اپنے دعاۃ ومبلغین روانہ کئے، چنانچہ اسی زمانہ میں یمن کے حاکم وامام ابوالقاسم منصور نے اپنے بھائی ہیثم کو بلاد سندھ کی طرف اسماعیلی دعوت کے لئے بھیجا، جس کے ہاتھ پر بہت سے لوگوں نے اسماعیلی مذہب قبول کیا، ۴۷۶ھ میں یمن کے حاکم الملک المکرّم احمد صلیحی نے مرزبان بن اسحاق بن مرزبان کا ہندوستان میں اسماعیلی دعوت کے لئے انتخاب کیا اور فاطمی پایۂ تخت قاہرہ کی ہدایت کے بموجب مرزبان کو یہاں بھیجا، اس کے مرنے پر ملکہ حرّہ نے فاطمی خلیفہ مستنصر سے مشورہ کر کے مرزبان کے بڑے لڑکے احمد بن مرزبان بن اسحاق کو ۴۸۱ھ میں ہندوستان بھیجا۔

نیز مؤید شیرازی متوفی (۴۷۵ھ) نے مستنصر فاطمی کے زمانہ میں قاضی ملک بن

مالک حمادی ہمدانی کو تیار کیا کہ وہ صلیحی دور کی دعوت یَمَنِیہ کی جانب سے ہندوستان میں داعی کا انتظام کرے، قاضی ملک نے ۴۶۰ھ میں اپنے داعی عبداللہ کو یہاں بھیجا، ان ہی ایام میں ایک روایت کے مطابق مؤید شیرازی کے ہاتھ پر مصر میں ہندوستان کے دو شخص بالم ناتھ (مولائی احمد) اور روپ ناتھ (مولائی نورالدین) اسماعیلی ہوئے، مؤید شیرازی نے قاضی ملک کے ساتھ ان دونوں کو یمن روانہ کیا اور قاضی ملک نے ان کو ہندوستان بھیجا، جنھوں نے گجرات اور دکن کے دیہاتوں اور شہروں میں اسماعیلی دعوت عام کی، یہ ہندوستان کی اسماعیلی دعوت میں یمن کی دعوت کے تابع رہی، یہاں تک کہ ۹۴۴ھ میں اسماعیلی دعوت یمن سے منتقل ہو کر ہندوستان آگئی اور اس زمانہ سے اسماعیلی مذہب ودعوت کا مرکز بن گیا۔

تشکر وامتنان: مشفقی ومربی، مفکر ملت حضرت مولانا عبداللہ صاحب کاپودروی (رئیس الجامعہ فلاح دارین، ترکیسر) دامت برکاتہم کا انتہائی ممنون ومشکور ہوں کہ حضرت والا سے جب بھی کسی کتاب کی تقریظ لکھنے کی درخواست کی گئی آپ نے بشاشت کے ساتھ حوصلہ افزا کلمات تحریر فرما کر کتاب کو رونق بخشی ہے اور اس کتاب کے متعلق بہت ساری معلومات اور مراجع کی طرف نشاندہی بھی فرمائی ہے۔

حق تعالیٰ شانہ صحت وعافیت کے ساتھ حضرت والا کے سایہ کو تادیر ہم پر باقی رکھے اور آپ کے علم وعمل سے ہمیں مستفیض ہونے کی توفیق نصیب فرمائے۔ آمین!

کتاب کے اہم موضوع ''علمی تعلقات'' کے مواد کی ترتیب وتزیین اور مسودہ کی بار بار تبییض کے لئے عزیز القدر مولانا رشید احمد منوبری صاحب کا بے حد ممنون ومشکور ہوں۔

اسی طرح کتاب کی کمپیوٹر کتابت اور اس میں بار بار اصلاحات وترمیمات کی زحمت اٹھانے کے لئے عزیز القدر مولانا یٰسین کرماڈی صاحب کا بھی بے حد شکر گذار ہوں۔

اللہ تعالیٰ شانہ ان دونوں حضرات کے علمی، عملی اور روحانی درجات میں ترقی نصیب فرمائے۔آمین! بحرمۃ سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم

اقبال محمد ٹنکاروی

دارالعلوم اسلامیہ عربیہ ماٹلی والا،

عیدگاہ روڈ، بھروچ، گجرات الہند

۱۳؍شعبان المعظم ۱۴۳۳ھ مطابق ۴؍جولائی ۲۰۱۲ء

عرب و ہند کے تعلقات

جغرافی محل وقوع کی وجہ سے عرب و ہند کے آپسی تعلقات قدیم تاریخ کے ہر دور میں قائم رہے؛ چنانچہ سندھ و عراق کے تعلقات سومیری عہد (۳۰۰۰-۲۵۰۰ قبل مسیح)، کادی عہد (۲۴۰۰-۲۱۰۰ قبل مسیح)، بابلی تہذیب (۱۸۰۰ قبل مسیح) میں موہن جوداڑو اور پھر ہڑپّا سے قائم تھے، اسی طرح فینقیوں (۱۲۰۰ قبل مسیح) حتیوں اور آریوں میں، پھر عہد سکندری و بطلیموسی میں عرب و مصر کے درمیان گوناگوں تعلقات استوار رہے، Leonard Cotterll نے Lost Cities میں اور Cordon Child نے اپنی کتاب What Happend In میں زمانہ ماضی میں عرب و ہند کے تعلقات پر تفصیل سے لکھا ہے۔ (عرب و ہند کے تعلقات)

انڈس ویلی کی تہذیب کی عمر ۲۰۰۰ ق م بتائی جاتی ہے، اس طرح ہند و عرب تعلقات کی عمر چار ہزار سال ہو جاتی ہے، جدید ہندوستانی مؤرخین تاریخی شواہد کی بناء پر اب یہ لکھنے لگے ہیں کہ وادیٔ انڈس (Indus Valley) کے قدیم ترین ہندوستانی اور قدیم عرب ایک دوسرے سے متعارف اور تجارت میں مشغول تھے؛ وہ لکھتے ہیں:

''اس کی واضح شہادت موجود ہے کہ وہ نہ صرف ہندوستان کے دوسرے حصوں سے بلکہ مغربی ایشیاء کے دور دراز ممالک سے بھی تجارت کرتے تھے، انڈس ویلی تاجر عراق سے بری و بحری دونوں راستوں سے تجارت کرتے تھے۔''

یہی مؤرخین موین کی عربوں کے ساتھ تجارت کے بارے میں لکھتے ہیں کہ ان کی تجارت خلیج فارس اور بحر احمر کے راستے عربوں اور رومیوں کے ساتھ تھی اور عربوں کی ہندوستان سے بحری تجارت نامعلوم زمانہ سے قائم تھی، بہت سے عرب تاجر ہندوستان کے مغربی ساحل پر آباد ہو گئے تھے۔ Indiabn History & Cultures. Fusie I.R.Mehta P.P.2092,72, 144),(Delhi : 1915)

جناب ممتاز احمد پٹھان صاحب لکھتے ہیں:

سندھ کے عرب دنیا سے تعلقات خصوصاً عراق، یمن اور عمان سے تاریخ کی ابتداء ہی سے چلے آرہے تھے، بعض مؤرخین کا خیال ہے کہ سمیری لوگ جنہوں نے بعد میں بابل کی سامی تہذیب کی بنیاد رکھی، وادئ سندھ سے ہجرت کر کے چلے گئے تھے، سندھ، بلوچستان، فارس اور خوزستان کے بعض علاقوں کے مشاہدے سے پتہ چلتا ہے کہ سندھ سے لے کر فرات تک سمیریوں کی بہت بڑی سلطنت تھی، انہوں نے مغربی ایشیاء کو تہذیب سکھائی اور دوسری چیزوں کے علاوہ لکھنے کا فن خط کوفی سے متعارف کرایا، ہل اور پہیہ جو انسانی تہذیب اور ثقافت کی بنیاد ہیں، سب سے پہلے انہی لوگوں کی وجہ سے ان دو دریاؤں کی سرزمین میں ہوئے۔ (تاریخ ادبیات، مسلمانانِ پاکستان و ہند، ص:۲۷، لاہور، ۱۹۷۲)

ڈاکٹر زبید احمد رالنسن کے حوالے سے لکھتے ہے:

''اگرچہ ہند و عرب کے درمیان سیاسی تعلقات کا آغاز بہت دیر سے یعنی ساتویں صدی عیسوی میں ہوا، تاہم یہ مما لک جونسل اور زبان کے اعتبار سے ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہیں، بہت سے قدیم زمانہ یعنی ساتویں صدی قبل مسیح کے آغاز سے تجارت کے ذریعہ باہم مربوط تھے اور ممکن ہے کہ روابط ماقبل تاریخ زمانے سے قائم ہوں۔''

ڈاکٹر صاحب مزید لکھتے ہیں:

''عہد قدیم میں ہند اور مغربی مما لک کے درمیان تجارت کے جو

تین راستے تھے، ان میں سے دو عرب میں سے گزرتے تھے، پہلا راستہ دریائے سندھ کے دہانے سے دریائے فرات تک جاتا تھا، اس مقام تک جہاں سے انطاکیہ اور مشرقی بحیرۂ روم کو جانے والی سڑکیں الگ ہوتی تھیں، مگر اس سلطنت کے زوال کے ساتھ یہ راستہ بھی ترک کردیا گیا۔

دوسرا راستہ جو پہلے راستہ سے بھی زیادہ اہم تھا، ہند کے ساحل سے لے کر حضر موت تک اور پھر وہاں سے بحیرۂ احمر کے ساحل کے ساتھ ساتھ شام تک اور پھر یورپ تک جاتا تھا، ایک راستہ تو براہ راست شامی ساحل سے یورپ تک تھا اور دوسرا راستہ براہ مصر واسکندریہ۔'' (عربی ادبیات بحوالہ انسائکلو پیڈیا آف برٹانیکا، گیارہواں ایڈیشن، ج:۲، ص:۲۶۴، بحوالہ عربی ادب میں ہندوستان کا حصہ:۷-۹)

ہندوستان کی پرانی سے پرانی تحریر اس وقت وہ خطوط اور کتبے ہیں، جو مگدھ (بہار) کے موریہ خاندان کے راجہ اسوکا (۲۵۳ ق م) کے مذہبی فرامین کی صورت میں ہندوستان کے پورے طول وعرض میں پشاور سے گجرات ودکن تک پہاڑوں پر اور لاٹوں پر کندہ ملتے ہیں، محققین فن خط (کیرکٹر) کا بیان ہے کہ ہندوستان کا یہ قدیم خط سامی خطوط کی شاخ آرامی خط سے ماخوذ ہے، لیکن خطوط کی زبان پالی ہے، یعنی قدیم بہار کی زبان جو بودھ کی مذہبی زبان تھی۔

تمام آرین تحریریں بائیں سے دائیں طرف لکھی اور پڑھی جاتی ہے، لیکن عجیب بات یہ ہے کہ کتبے سامی تحریروں کی طرح داہنے سے بائیں طرف لکھے ہوئے ہیں اور اسی طرح سے پڑھے جاتے ہیں، یہ اس بات کا دوسرا ثبوت ہے کہ ہندوستان کا قدیم سرمایۂ تحریر اپنے

وجود و بقاء میں عربوں کا ممنون کرم ہے۔

چنانچہ علامہ سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ انسائیکلو پیڈیا آف برٹانیکا کے مضمون سنسکرت کے حوالہ سے لکھتے ہیں:

> براہمی کتبات میں چھٹی صدی عیسوی تک ایک دوسرے قسم کے اعداد استعمال کئے گئے ہیں، ایک سے ۳ تک کے لئے آڑی لکیریں ہیں، پھر ۴-۹ تک اکائیوں اور ۱۰، ۹۰، ۱۰۰، ۱۰۰۰ کے لئے خاص علامات ہیں، یہ طریقہ بہت ممکن ہے کہ مصر سے ماخوذ ہو اور کسور عشاریہ کے لئے یہ طریقہ جو سب سے پہلے گجرات کے کتبہ میں ملتا ہے، شاید یہیں کے منجمین یا ریاضی دانوں کی ایجاد ہے۔ (عرب و ہند کے تعلقات: ۹)

ہمارے دعوے کے ثبوت کے لئے اس سے زیادہ عجیب تر اور نادر تر وہ دستاویز ہے جو مہابھارت کی عدالت عالیہ سے ہم کو مل سکی ہے، ستھیارتھ پرکاش کے گیارہویں سمولاس میں سوامی دیانند لکھتے ہیں:

> ''مہابھارت میں جب کوُرَوَں نے لاکھ کا گھر بنا کر پانڈوَوں کو اس کے اندر بھونک دینا چاہا تو بدر جی نے یدھشٹر کو عربی زبان میں بتایا اور یدھشٹر نے اسی عربی زبان میں ان کو جواب دیا۔''

سوامی جی کا بیان اگر صحیح ہے تو ہم کو نہایت خوشی ہے کہ ہم ملیچھیوں کی زبان کسی زمانہ میں اس قدر ''مقدس'' بھی تھی کہ دیوتاؤں کے بڑے بڑے اوتار اس کو بولتے تھے اور اس زبان میں ایک دوسرے سے راز کی باتیں کہتے تھے۔ (مقالات سلیمانی: ۳۲، ۳۳)

ہندوستان میں اشاعت اسلام کے اسباب

اسلام اپنی سادگی ، مساوات اور حقانیت سے اپنا راستہ خود صاف کرتا گیا ہے اور نیچ ذات اور معمولی لوگوں کے دلوں پر قبضہ کرتا ہوا بادشاہوں اور راجاؤں کے قلوب تک پر قابض ہوگیا ہے، ان عرب تاجروں اور درویشوں کے ہاتھوں میں محمود اور عالمگیر کی تلوار نہ تھی، ان کے ذریعہ سے جو اشاعت اسلام ان اطراف میں ہوئی، اس کے طریقے حسب ذیل تھے:

۱: عرب تاجروں نے خود آ کر نو آبادیاں قائم کیں، یہاں کی نومسلم عورتوں سے انہوں نے شادیاں کیں۔

۲: نیچ ذات کے ہندو اور نا برہمن جو برہمنوں کے دباؤ، ظلم، ترفع اور غرور سے نالاں تھے، انہوں نے اسلام میں عزت پائی۔

۳: تاجروں کی فیاضی اور انسانیت نوازی نے غریبوں اور محتاجوں کو اپنے دامن میں پناہ دی۔

۴: جو لوگ ذرہ ذرہ سی باتوں پر اپنی ذات سے خارج کر دیئے جاتے تھے، وہ اسلام کی برادری میں داخل ہوتے گئے۔

۵: بہت سے لوگ اپنے بچوں کو غربت کے مارے عربوں کے ہاتھ فروخت کر دیتے تھے، وہ ان کو لے کر اسلام کی تربیت دے کر اپنی اولاد کی طرح پال کر جوان کرتے تھے۔

۶: اسلام کی روحانی طاقت کی عجیب وغریب نشانیاں ان کی نگاہوں سے گزریں، جس نے ان کو اسلام کے قبول کرنے پر مجبور کر دیا۔

۷: علماء اور درویشوں نے اپنی روحانی کشش کے جلوے دکھائے۔ (مقالات سلیمانی: ۱/۲۰۴، ۲۰۵)

یہ دونوں ملک ایک سمندر کے دو مقابل ساحل ہیں،اس کا ایک ہاتھ آریاورت کے دامن کو چھوتا ہے،تو دوسرا ارض مقدس کو پابوس ہے،ساحلی مقامات فطرۃً تجارتی ہوتے ہیں، یہی پہلا رشتہ ہے،جس نے ان دونوں قوموں کو باہم آشنا کیا،عرب تاجر آج سے ہزاروں برس پہلے ہندوستان کے ساحلی مقامات تک آتے تھے اور یہاں سے خاص یہاں کی پیداوار اپنے ملک میں لے جاتے تھے اور ان کے ذریعہ سے تمام مغربی ممالک میں یہ چیزیں پھیل جاتی تھیں،مشرق ومغرب یا ہندوستان اور یورپ کی درمیانی کڑی اہل عرب ہی تھے،ان کے سامان تجارت میں زیادہ تر مسالہ،خوشبو کی چیزیں، کپڑے،تلوار اور بعض جڑی بوٹیاں اور پھل داخل تھے، چنانچہ عربی میں ان چیزوں کے نام سنسکرت کے ہیں،مثلاً مشک (موشکا) کافور (کپور) صندل (چندن) قرنفل (کنشک پھل) فلفل (پپلی) زنجبیل (زرنجابیرا) موز (موشہ) نارجیل (ناریل) کاذی (کیوڑا) سنسکرت کے لفظ ہیں،تلوار کو عربی میں مہنّد کہتے ہیں،عود ہندی،قسط ہندی،تمر ہندی اپنی نسبت خود ظاہر کرتے ہیں۔

یہ تجارتی تعلقات بحری راستوں سے تھے،اس لئے کشتی اور جہازرانی کی بعض اصطلاحات بھی ہندی الاصل ہیں،مثلاً بارجہ، دبیرجہ، بیڑہ، دونیج،ڈونگی، بلیج،بلیق (جہاز کا سقف)،ہوری (چھوٹی کشتی)،جوش (کشتی کا رسا) وغیرہ،یہ الفاظ عرب سیاحوں کے سفر ناموں میں عام طور پر مستعمل ہیں۔

خط آرامی سے خط ہندی وخط عربی کا وجود

قبل از اسلام عرب تاجروں نے بحرین سے نکل کر بحرروم کے سواحل پر اقامت اختیار کر لی تھی،ان کو یہود کنعانی،آرامی اور یونانی فینشین کہتے ہیں،تجارتی کاروبار کے سبب سے اس قوم کو حافظہ کے استحکام اور اعانت ضرورت محسوس ہوئی اور اس طرح فن کتابت کی ایجاد کا ان کو خیال پیدا ہوا۔

ان کے بحری راستے کی مغربی منزل یونان تھی اور مشرقی منزل ہندوستان، چنانچہ ان دونوں سروں پر ان کی ایجاد نے حسن قبول حاصل کیا۔

علمائے فن کتابت نے تمام دنیا کے خط اور طرز تحریر کو چار قسموں میں منقسم کیا ہے:

خط یونانی: یہ یورپ کے تمام خطوط کا پدر اعلیٰ ہے۔

خط عبری: جس سے سامری وغیرہ خط پیدا ہوئے۔

خط مسند: جس سے سبائی وحمیری اور حبشی خطوط نکلے ہیں۔

خط آرامی: جس سے چھ خط پیدا ہوئے: ہندی، فارسی قدیم، عربی مربع، تدمری، سریانی، نبطی۔ اس تفصیل سے واضح ہوگا کہ قدیم ہندوستان نے علوم کی ابجد عربوں ہی سے سیکھی۔

عرب و ہند کے سیاسی تعلقات کا آغاز براہ راست نہیں؛ بلکہ ایرانیوں کی وساطت سے ہوا، اس کو اجمالاً بیان کیا جاتا ہے: عرب و ایران کی سیاسی معرکہ آرائیوں کا ایک مدت سے سلسلہ جاری تھا، بنو شیبان ایرانیوں سے نبرد آزما تھے کہ آفتابِ اسلام طلوع ہوا، اسلام کا معجزہ سمجھئے یا بخت و اتفاق کا اثر کہئے کہ عربوں نے میدان جنگ میں ایرانیوں کو شکست دی، چنانچہ اس موقع پر آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ آج عرب نے اپنا انصاف فارس سے لے لیا، حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے عہد خلافت میں انہی شیبانیوں نے مملکت ایران پر تاخت کی، اور ایران کی کمزوری کا اچھی طرح امتحان کر کے بارگاہ خلافت کو واقعات کی اطلاع دی اور امداد کے لئے فوجیں طلب کیں، یہ پہلا دن تھا کہ مسلمان اور ایرانیوں میں سیاسی تعلقات پیدا ہوئے۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے عہد یعنی ۳۰ھ میں ایرانیوں کا خاتمہ ہوگیا، ایران کی

حکومت آخری حد سندھ سے آ کر مل جاتی تھی، مسلمانوں کو خوف تھا کہ دریا کے راستے سے سندھ سے ایرانیوں کو کمک پہنچے گی اور براہ راست ادھر عرب سے خود مرکز پر حملہ ہوسکتا ہے، اس بناء پر ان کو سندھ پر فوج کشی کرنی پڑی، اس کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ اور امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں بھی یہاں متواتر حملے ہوتے رہے، لیکن مستقل اور پائیدار فتح ولید کے عہد حکومت میں حاصل ہوئی، لیکن معلوم ہوتا ہے کہ یہاں مسلمانوں کی آبادی اچھی خاصی قائم ہوگئی تھی؛ کیوں کہ تاریخوں میں اس حملہ کی وجہ یہ لکھی ہے کہ ہندوؤں نے مسلمان عورتوں کو زبردستی گھر میں ڈال لیا تھا، اس زمانہ میں عراق کا گورنر حجاج تھا، عورتوں نے حجاج کی دہائی پکاری، پرچہ نویسوں کے ذریعہ سے یہ خبر اس کو پہنچی تو اس ملک کی فتح اور اسلام کی عزت برقرار رکھنے کے لئے بے قرار ہوگیا اور آخر اپنے اٹھارہ سال کے نوجوان بھتیجے محمد بن قاسم ثقفی رحمۃ اللہ علیہ کی سپہ سالاری میں اس نے ایک فوج روانہ کی، جس نے سندھ کو فتح کرلیا، اور رفتہ رفتہ دائرۂ فتوحات ملتان تک پہنچ گیا۔

عربوں اور ہندیوں میں مذہبی ہم آہنگی

تجارتی، معاشی اور اقتصادی تعلقات کے علاوہ عربوں اور ہندوستانیوں میں مذہبی اور اقتصادی ہم آہنگی موجود تھی، اصنام پرستی، مظاہر پرستی اور کواکب پرستی دونوں میں عام تھی اور دونوں قوموں کو ایک دوسرے کے قریب لانے میں یہ عوامل بہت کارگر و مؤثر ثابت ہوئے۔ علامہ عبدالکریم شہرستانی نے لکھا ہے کہ عرب و ہند دونوں کا مذہب قریب قریب یکساں ہے، ان دونوں میں سے اکثر کا رجحان اشیاء کے خواص کے ثبوت اور ماہیات وحقائق کے احکام پر چلنے اور روحانیت کے استعمال کرنے کی طرف ہے۔ دوسری جگہ لکھا ہے کہ عرب و ہند دونوں کا مذہب قریب قریب یکساں ہے اور وہاں اجمالاً بتایا ہے کہ دونوں کا مذہب کا میل صرف اشیاء کے خواص اور ماہیات کے احکامات کے اعتبار و حکم پر ہے اور دونوں پر فطرت کی طبیعت

کا غلبہ ہے، شروع میں ہندوعرب کی مذہبی نوعیت یہی تھی مگر بعد میں دونوں قوموں میں بت پرستی کا رواج ہو گیا۔(عرب و ہند عہد رسالت میں، ص:۱۲۵)

ان کے ساتھ بڑے بڑے ہیکل (بت خانے) تھے، جو سبع (سات) سیاروں کے نام سے موسوم تھے، ان میں سے عرب اور ہند کے ہیکل یہ تھے:[۱] مکہ مکرمہ میں کعبہ زحل[۲] ہیکل اصفحان[۳] ہندوستان میں سومناتھ[۴] بلخ میں نوبہار[۵] صنعاء یمن میں زہرہ ستارہ کے نام کا غمدان[۶] فرغانہ میں آفتاب کا ہیکل[۷] چین کا ہیکل۔(رجال السند والہند، ص:۲۹۶) اس سلسلہ میں ایک اور جگہ تحریر ملتی ہے کہ عرب اور ہندوستان کے مشہور بت خانے سات ہیں، جو ستاروں کے نام پر بنے ہیں۔

کعبہ کے متعلق عقائد

عام عربوں کا عقیدہ تھا کہ کعبہ زحل ستارے کے نام پر بنایا گیا ہے، ہندوستان کے ہندو بھی کعبہ کے متعلق یہی عقیدہ رکھتے تھے، وہ عرب کے دوسرے بت خانوں کا بھی احترام کرتے تھے، خلیفہ مأمون کے زمانہ میں تبت اور سندھ کے علاقہ کا ایک راجہ مسلمان ہوا، اس کے پاس انسانی شکل کا ایک مرصع بت اور اس کا تخت تھا، اس نے یہ دونوں چیزیں کعبہ کو نذر کر دیں۔(الملل والنحل، ج:۲، ص:۱۰۹) اس طرح عرب وعجم کے معبد قلیس سے بھی ہندوستانیوں کو عقیدت تھی، جس طرح ہندوستان میں کواکب اور ستارہ پرستی کا رواج تھا، اسی طرح عرب میں بھی تھا، ان کے بڑے بڑے بت ود، سواع، یعوق، یغوث، نسر، لات، عزی، اوس، خزرج، منات، ہبل، اساف، نائلہ تھے۔(کتاب الفہرست ابن الندیم، ص:۷۵،۷۶) عرب کے قدیم تعلقات ہندوستان اور سندھ کے ساحلی مقامات سے تھے یا وہاں کے لوگ جہاں آباد ہو گئے تھے، ان مقامات کے بت خانوں کے یہ نام تھے، مانکیر (منگرور) میں بیس ہزار بت تھے، ملتان کا بت خانہ، قمار (راس کماری) کا بت خانہ، صنف کا بت خانہ۔(کتاب الفہرست ابن الندیم، ص:۷۶)

عرب کے ہندوصائبہ

ہندوستان میں مختلف مذاہب،فرقے اور جماعت کے لوگ رہتے ہیں،مگر یہاں کے جمہورصائبہ کے مذہب پر ہیں اورکواکب پرستی ان کا مذہب ہےاس کا ذکرعلامہ عبدالکریم شہر ستانی نے اپنی کتاب ''الملل والنحل''میں صراحت سے کیاہے،جس سے پتہ چلتاہے کہ عرب میں موجود ہندوؤں کو زمانہ اسلام میں فرقہ صائبہ اورمجوس میں شمار کیا گیا اوران کے اسلام نہ قبول کرنے کی صورت میں ان کے ساتھ عہد رسالت اورعہد صحابہ میں وہی معاملہ کیا گیاجو بحرین ، عمان اور خطۂ یمن وغیرہ میں آباد عجمیوں اور مجوس وصائبہ کے ساتھ کیا گیا۔(عرب وہندعہدرسالت میں،ص:۱۳۴)

گجرات کی مختصر سیاسی تاریخ

عہدقدیم سےصوبۂ گجرات کوکئی حیثیتوں سے اہمیت حاصل رہی ہے،اس خطہ کے نام اورحکام ضروربدلتے رہے؛مگراس کی اہمیت اورشہرت ہمیشہ برقراررہی ، یہ اپنی تجارت ، تمول،شادابی ، بندرگاہوں وغیرہ کی وجہ سے ہمیشہ بیرونی واندرونی اقوام واصحاب سیف وقلم کے لئے باعث کشش رہاہے،تقریباً ۲۰۰۰ ءق م بلکہ اس سے بھی قبل سے ۱۶۰۰ ءتک دنیا کی مختلف قومیں یہاں آئیں،جن میں سیاسی فاتح ہیں اورروحانی پیشوابھی،تاجربھی، ہندوستان کے آخری حکمران انگریزبھی سب سے پہلے گجرات ہی کی بندرگاہ پرلنگرانداز ہوئے تھےاور اہل ہندکی کمزوریوں سے فائدہ اٹھاکر رفتہ رفتہ پورے ملک پرتسلط پاکرتاجر سے تاج داربن گئے،اس کی سلطنت کا مدار''برلؤلؤ ومرجان'' رہاہےاورآج بھی اس کا مدار''برگندم جو''نہیں ہے، یہ صوبہ مختلف مذاہب کے مرکز کی حیثیت سےاوراپنی زیارت گاہوں نیزندیوں کی وجہ سے بھی دوسرے علاقوں کے مقابلہ میں کسی طرح کم شہرت کا مالک نہیں ہے،سرورکائنات

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بعض صحابہ وتابعین اور تبع تابعین نے بھی سب سے پہلے اسی سرزمین پر مبارک قدم رکھے، اسماعیلیوں نے بھی تبلیغ کا کام سب سے پہلے گجرات ہی میں شروع کیا تھا۔

موجودہ گجرات کی مشرقی شمالی سرحد کوہ اراولی اور بندھیا چل پہاڑوں کی قطاروں پر ختم ہوتی ہے، اس سے سرحد پر مالوہ، میواڑ، مارواڑ وغیرہ سے گجرات علیحدہ ہوتا ہے، اس سے مغربی اور شمالی مغربی سرحد پر کچھ کا رن واقع ہے، جنوبی سرحد تھانہ (بمبئی) اور ڈانگ کے جنگلوں تک ہے اور اس کے جنوب اور جنوب مغرب میں بحر عرب اور خلیج کھمبایت ہے، عہد قدیم میں سیاسی پھیر کے ساتھ ساتھ اس کی سیاسی حدود بدلتی رہی ہیں، کبھی تو یہ سمٹ کر موجودہ گجرات اور سوراشٹر رہ جاتا اور کبھی یہ بمبئی سے جودھپور تک پھیل جاتا، شمالی بمبئی کا علاقہ کبھی تو گجرات کے زیرنگیں ہوتا اور کبھی اس پر کرناٹک کے راجاؤں کا پرچم لہراتا، گرجروں کے عہد حکومت میں یہ علاقہ تین حصوں میں منقسم تھا، ایک زمانہ میں یہ ڈراوڈ قوم کا بھی تجارتی مرکز رہا ہے، اس عہد میں اس کا کیا نام تھا، اس سے ہم لاعلم ہیں؛ مگر جب آریوں نے ہندوستان میں قدم رکھے اور مختلف علاقوں میں پھیل گئے تو گجرات میں بھی آباد ہوئے، اس وقت کوکن، سندھ، گجرات اور دوسرے قریبی علاقوں کے مجموعہ کو اَپرنتا کے نام سے یاد کیا جاتا تھا، آڑیوں نے بعد میں اس ملک کو راست (سیدھا مذہب) نام دیا اور جس جگہ غیر مہذب لوگ آباد تھے، اس کو اَرنی کہنے لگے، جب گرجروں کی حکومت گجرات ودکن میں قائم ہوگئی تو انہوں نے دکن کو مہاراٹ اور گجرات نام دیا، جو آگے چل کر مہاراشٹر، گجرات اور سوراشٹر ہوگئے۔

مہابھارت پوران میں گجرات کے حصوں کے انرتا اور لاٹا نام ملتے ہیں، انرتا 'انرت' شمالی گجرات کو کہتے تھے، اس میں سوراشٹر بھی شامل تھا، گجرات کا جنوبی حصہ لاٹا (لاٹ) کے نام سے مشہور تھا، لاٹا کو ٹالیمی سیاح کے یہاں ۱۵۰ء لاریکا یا لارک کہا گیا ہے، غرض راسٹ

سے لاٹا، لاٹ، لاریکا، لار بن گیا، آٹھویں صدی عیسوی میں عربوں کے ہاں اس علاقہ کا نام لاردیس خصوصیت کے ساتھ آتا ہے، عرب اس کی زبان کو لاری کہتے تھے، بمبئی کے بعض حصے اسی لاردیس میں شامل تھے۔

اس وقت گجرات کی کل آبادی ۶ کروڑ ہے، اس کا طول وعرض پورب پچھّم اور اتر دکھن بھی تقریباً یہی ہے، گجرات ساحلی علاقہ ہونے کی وجہ سے بندرگاہوں کا صوبہ ہے، ڈراوڈوں اور آریوں کے زمانہ میں معلوم نہیں کتنی بندرگاہیں تھیں، سلاطین گجرات کے عہد میں چوراسی بندرگاہوں کا پتہ چلتا ہے، بمبئی کے بندرگاہ بننے کے بعد ان کی اہمیت کم ہوگئی، اس وقت گجرات میں پندرہ بندرگاہیں ہیں۔

گجرات میں دریاؤں کے چھ سلسلے ہیں، ان میں دریائے نرمدا اور دریائے تپتی (تاپتی) کو مذہبی اور تجارتی نقطۂ نظر سے اہمیت حاصل ہے، اسی طرح گجرات پہاڑوں اور جنگلوں کے خزانوں سے بھی مالا مال ہے، صنعت وحرفت میں بھی اس کا درجہ کم نہیں، سوتی اور ریشمی کپڑے، ہاتھی دانت کی صنعت کاری، مینا کاری، زردوزی وغیرہ میں گجرات شہرت رکھتا ہے۔

گجرات گزشتہ دنوں میں مختلف اقوام کیلئے مرکز توجہ رہا ہے، جادو، یونانی بیکٹرینس، پارتھینس، ہیتھنس، عرب، ایرانی، مکرانی، افریقی اور اقوام مغرب کے فاتحوں کے لئے میدان کارزار، پناہ گزینوں کے لئے جائے پناہ اور تاجروں کیلئے زبردست منڈی ثابت ہوا ہے۔

گجرات ہندوستان میں گرجر قوم کی تاریخ کا ایک اہم باب ہے، چھٹی صدی تک لفظ گرجر نہ تو قوم کے لئے استعمال ہوا ہے اور نہ کسی علاقہ کا نام پایا جاتا ہے، مؤرخین کا خیال ہے کہ یہ لوگ گرجستان (جارجیہ) کے باشندے تھے، سن عیسوی کی ابتدائی صدیوں میں یہ لوگ ہند میں وارد ہوئے اور سب سے پہلے انہوں نے مدھیہ دیش میں سکونت اختیار کی،

گپتوں کے عہد حکومت میں اس قوم کے افراد حکومت کے فوجی اور غیر فوجی اعلی عہدوں پر فائز تھے، ۳۰۰ء میں عہدے داروں کی حیثیت سے یہ لوگ راجپوتانہ، مالوہ، گجرات وغیرہ میں آئے اور جب گپتوں کی حکومت میں ضعف آ گیا تو ۳۹۵ء میں یہ خودمختار ہو گئے اور ان کے مختلف خاندانوں نے دکن اور گجرات میں چھوٹی چھوٹی خودمختار ریاستیں قائم کر لیں، دکن کے علاوہ ۶۴۱ء میں علاقۂ گجرات میں ان کی ایک عظیم الشان سلطنت پائی جاتی ہے، جو بلساڑ (سورت کے قریب) سے جودھپور اور دوارکا (کاٹھیاواڑ) سے بھیلسا تک پھیلی ہوئی تھی اور راجپوتانہ، مالوہ، سوراشٹر، گجرات وغیرہ اس کے بڑے بڑے حصے تھے، یہ گوجر دیش کے نام سے یاد کیا جاتا تھا اور اس دیش کی تہذیب وتمدن اور زبان وادب میں بڑی حد تک وحدت تھی، ۱۳۰۰ء میں اسی علاقہ کی گرجرا پبھرش سے گجراتی، مارواڑی، جودھپوری وغیرہ دیسی زبانیں وجود میں آئیں، اسی قوم کے چار خاندان چالوکیہ، چوہان، پرمار اور پرتی ہارا مشہور ہیں، جن کی حکومتیں دکن، گجرات اور شمال میں صدیوں تک قائم رہیں، گجرات میں اس عہد میں بعض غیر گرجروں کی چھوٹی چھوٹی ریاستوں کی نشاندہی کی جاتی ہے، ایک دور ایسا بھی آیا کہ گرجر ریاستیں آپس میں ٹکرا کر ایک دوسرے پر غالب آتی رہیں، ان سلطنتوں کی چار پانچ راجدھانیاں مشہور ہیں، شمال میں بھیلمان، اجین، گجرات میں ولبھی پور (بھاؤنگر کے قریب)، بھروچ، انہل واڑ (نہروالا) اور دکن میں کلیانی (بیدر) نام اکثر دیکھے جاتے ہیں۔

بعض اوقات ایک ہی عہد میں دو دو خاندانوں کی حکومت کا پایا جانا مغالطہ میں ڈال دیتا ہے، گجرات کی سیاسی تاریخ جادَوؤں سے شروع کی جاسکتی ہے، جادَوْ خاندان گجرات پر حکمران رہا اور اس کا صدر مقام دوارکا تھا، کرشن اسی خاندان سے تعلق رکھتے تھے اور گجرات کے حکمران رہ چکے تھے، جادَوؤں کے بعد ۳۰۰ ق م گجرات پر موریہ خاندان کا پرچم لہرایا، بعض شواہد سے گجرات میں یونانیوں کی حکومت کا بھی پتہ چلتا ہے، موریہ دور میں ۲۰۰ ق م یہ لوگ حکومت کے اعلی عہدوں پر فائز تھے، ایک زمانہ میں ان لوگوں نے بھروچ اور جونا گڑھ

(کاٹھیاواڑ) میں خودمختار حکومتیں قائم کرلی تھیں، گجرات پر ایک شترپ خاندان بھی حکمرانی کر چکا ہے، شترپ سیستان (ایران) کے رہنے والے تھے، ٹیکسیلا، متھرا وغیرہ میں ان کی حکومتیں قائم تھیں، ان کی سلطنت یا ریاستوں کا دائرہ جنوبی راجپوتانہ، سوراشٹر گجرات اور پونا تک پھیلا ہوا تھا، اس خاندان نے تقریباً چار سو سال حکومت کی، سن عیسوی ۳۹۵ ب م میں گپتوں نے ان کا تختہ الٹ دیا، گجرات پر ایک تری کوٹک خاندان نے بھی حکمرانی کی تھی، ۲۵۰ء تا ۴۵۰ء ان کا سکہ چلتا رہا، ان کا صدر مقام بھروچ تھا، ۳۹۵ء تا ۴۸۰ء گپتوں کی گجرات میں حکومت رہی، اس کے بعد حکومت گرجر خاندان میں منتقل ہوگئی۔

گجرات و دکن میں کئی گرجر خاندان حکمران گذرے ہیں، ان میں سے ولبھی خاندان (چالوکیہ) نے گجرات میں ایک طاقت ور سلطنت قائم کرلی تھی، یہ خاندان ۴۸۰ء تا ۷۷۰ء برسر اقتدار رہا، ان کی راجدھانی ولبھی پور کے نام سے مشہور تھی، اس عہد میں گجرات ایک ترقی یافتہ ریاست تھی، اس کے ایک شہر میں تقریباً ایک سو کروڑ پتی پائے جاتے تھے، چینی اور عرب سیاحوں نے گجرات کی دولت مندی کی تعریف کی ہے، ولبھیوں کے بعد ۷۷۰ء میں دکن کا راشٹ کوٹ خاندان گجرات پر قابض ہوگیا، اس خاندان کا تعلق تقریباً دو سو سال رہا، ۷۷۰ء تا ۸۰۸ء تک گجرات دکن کے ایک صوبہ کی حیثیت سے راشٹ کوٹوں کے زیرنگیں رہا، ۸۰۸ء تا ۸۸۸ء یہاں آزاد حکومت رہی اور ۸۸۸ء کے بعد ۹۷۴ء تک پھر دکن کے صوبہ کی حیثیت رہی، راشٹ کوٹ راجاؤں کا لقب ولبھ رائے تھا، اس خاندان کے بعض راجا مسلمانوں کے بڑے خیر خواہ اور دوست گزرے ہیں، انہیں کے عہد حکومت میں عرب تاجر اور مہاجر گجرات میں ہزاروں کی تعداد میں آئے اور مستقل اقامت اختیار کرلی، جب گجرات میں بدنظمی پھیلی تو گرجروں کی ایک شاخ سولنکی کے ایک فرد مول راج نے چاوڑا (گرجر) خاندان کے راجہ سامنت سنگھ (مول راج کا ماموں) کو قتل کرکے اقتدار حاصل کرلیا، اس عہد میں گجرات بہت ترقی یافتہ ریاست تھی، گجرات کو سَرَسُوَتی مندر کہا جاتا تھا، اس کے حدود

راجپوتانہ اور مالوہ تک پھیلے ہوئے تھے، اس خاندان میں کئی راجہ گزرے ہیں، جن میں راجہ سدھ راج جے سنگھ (۱۱۴۳ء) بہت مشہور ہے، مشہور اور معروف نحوی ہیم چندر اسی کے دربار سے منسلک تھا، یہ خاندان ۱۲۴۲ء تک برسراقتدار رہا، اس عہد میں گجرات کے ایک حصہ میں باگھیلا گرجروں کی حکومت بھی قائم تھی، جب سولنکیوں کا زوال ہوا تو باگھیلا خاندان پورے گجرات پر قابض ہوگیا، باگھیلے ۱۲۰۴ء تک حکمران رہے، ۱۲۹۷ء میں اس خاندان کا ایک راجہ کرن نامی تخت پر بیٹھا، اس کے عہد میں مادھو اور کیشو دونا گر بھائی اس کے مشیر کار تھے، مادھو کی بیوی بہت حسین تھی، راجہ نے اس حسینہ کو زبردستی محل میں ڈال دیا، اس کا انتقام لینے کے لئے مادھو نے دہلی جا کر علاء الدین خلجی کو گجرات پر حملہ کرنے پر آمادہ کیا، علاء الدین نے اپنے سپہ سالار الغ خان کی سپہ سالاری میں گجرات میں فوج بھیجی، الغ خان نے گجرات کو فتح کر کے ہمیشہ کے لئے گرجروں کی حکومت کا خاتمہ کر دیا۔

علاء الدین خلجی کی فتح گجرات کے قبل گجرات میں مسلمان فوجیں کئی بار چکر لگا کر گئی تھیں، گجرات پر سندھ کے عربوں کے حملے کے علاوہ ۱۰۲۱ء میں محمود غزنوی کا حملہ سومناتھ (کاٹھیاواڑ)، ۱۱۷۸ء میں معز الدین سام (غوری) کا حملہ (بعہد مول راج)، ۱۱۹۴ء میں قطب الدین کا حملہ سرسری گزر جانے سے زیادہ نہ تھے، یہ لوگ آئے، فتح کیا، مال غنیمت لیا اور محکوم حاکموں میں سے کسی کو گورنر مقرر کر کے چلے گئے، مگر علاء الدین کی فتح کے بعد گجرات سلطنت دہلی کا ایک صوبہ قرار پایا، اس طرح شمال وجنوب کے سیاسی سماجی تعلقات قائم ہوگئے، یہ تعلقات تہذیب، زبان وادب اور ذہنی تغیر کے نقطۂ نظر سے کافی اہم ثابت ہوئے، ۱۲۹۶ء سے ۱۳۹۸ء تک دہلی سے ناظم آتے رہے، فیروز شاہ تغلق کے عہد میں گجرات کے ناظم ظفر خان نے اپنی خودمختار حکومت قائم کر لی، ظفر خان سے سلاطین گجرات کا سلسلہ شروع ہوا، انہوں نے ۱۸۴/سال گجرات پر حکمرانی کی، ۱۵۷۳ء میں اکبر نے گجرات کو فتح کر کے دوبارہ اس کو سلطنت دہلی کا ایک صوبہ قرار دے دیا، ۱۷۵۸ء تک گجرات مغلوں کے زیر نگیں

رہا،اس کے بعد گجرات مرہٹوں،انگریزوں اور مسلمانوں میں بٹتا رہااور آخرکار ۱۸۵۰ء میں انگریز اس کے مالک کار بن گئے،ملک آزاد ہونے کے بعد ۱۹۶۰ء میں پھر مستقل صوبے کی حیثیت اختیار کرلی۔(سخنوران گجرات:ص:۱۵-۱۹)

گجرات کی تجارتی حیثیت

گجرات کی قدرتی جائے وقوع ملک عرب کے سامنے ہے، بیچ میں بحر عرب کا ایک حصہ واقع ہے،اسی سمندری راستہ سے عرب قبل مسیح سے آمد ورفت رکھتے تھے اور تجارتی کاروبار کے ذریعہ انہوں نے کافی فروغ پایا، یہی سبب ہے کہ عربی زبان میں بہت سے نام آج بھی بطور یادگار موجود ہیں،اسی طرح گجراتی زبان میں بھی عربی نام بکثرت ملیں گے، پھر جب عرب سے لے کر ترکستان تک اسلامی حکومت قائم ہوگئی تو اس وقت گجرات سے لے کر لنکا تک تجارتی جہازوں کی آمدورفت بہت بڑھ گئی، اور جب کبھی ان تاجروں کو کوئی تکلیف پہنچی تو ان کی امداد کے لئے بصرہ اور سیراف وغیرہ سے جنگی بیڑہ فورا آجاتا،چنانچہ تھانہ، بھروچ، دیول وغیرہ میں متعدد بار آیا،کبھی کامیاب اور کبھی ناکام واپس گیا،سندھ پر۹۲ھ میں عربی حکومت قائم ہوجانے کے بعد تعلقات میں مزید اضافہ ہوا،اور''راشت کٹ'' خاندان (اس کو عرب وَلْہبْ رائے کہتے ہیں، مان کھیڑا اس کا دارالحکومت تھا) کے برسر حکومت ہونے کے بعد دونوں میں جو معاہدے ہوئے ان سے تعلقات اور زیادہ وسیع ہوگئے، تجارتی، علمی، مذہبی ہر قسم کے فوائد کے حصول کے لئے عرب بڑی تعداد میں آنے لگے،سومناتھ، کھنبایت، بھروچ، چیمور (متصل بمبئی) سوپارہ، تھانہ میں ان کی بڑی بڑی کوٹھیاں قائم ہوگئیں۔

ہارون رشید کے عہد میں یحیی برمکی کی رائے سے ایک وفد علمی تحقیقات کے لئے یہاں آیا،جس نے واپس ہوکر ایک رپورٹ پیش کی،جس کا خلاصہ ابن ندیم نے اپنی کتاب میں دیا ہے۔اسی طرح مفرد دواؤں کی تلاش وجستجو کے لئے بھی ایک وفد یہاں آیا تھا، ہارون رشید نے اپنے علاج کے لئے ایک طبیب (وید) بھی بغداد میں بلوایا تھا،اور جب اس کے علاج

سے صحت یاب ہوگیا تو بلخ کے راستہ سے اس کو ہندوستان واپس کیا۔ کچھ لوگوں کو سنسکرت کتابوں کے عربی میں ترجمہ کرنے کے لئے بیت الحکمت میں مقرر کیا گیا، جنھوں نے سنسکرت کی بہت سی کتابوں کا ترجمہ کیا۔

پہلی صدی ہجری ۷۷ھ ،۶۹۲ء کے آخر میں سولنکی خاندان کا راجہ بھوڑ تمام گجرات پر قابض ہوگیا،اس کے عہد میں گجرات کی سرحد سندھ تک پہنچ گئی،اور اس نے سرحدی باشندوں کو تنگ کرنا شروع کیا،اس کو عرصہ تک برداشت کیا گیا؛لیکن دکنی سولنکی حاکم جب نہ مانے تو ۱۰۷ھ میں سندھ کا گورنر جنید ایک بڑی فوج لے کر مانڈل، دھنج ،بھروچ ہوکر اجین گیا اور وہاں سے بھیل مال ہوکر سندھ واپس گیا،مگر آندھی کی طرح گیا اور بگولہ کی طرح واپس ہوا،اس لئے اس کا کوئی خاص اثر گجرات پر قائم نہیں رہا۔

اس کے بعد چارسو برس تک دونوں قوموں کے تعلقات اسی طرح محبت کے ساتھ قائم رہے،لیکن چوتھی صدی کے آخر میں عربوں کا زوال شروع ہوا،ایران،ترکستان اور افغانستان میں ترک برسراقتدار آئے، پانچویں صدی کے شروع ہوتے ہی افغانستان میں غزنویوں کی حکومت بڑی زبردست ہوگئی۔ (گجرات کی تمدنی تاریخ:ص:۲-۴)

گجرات کی جغرافی حیثیت

ہندوستان کے جنوب مغرب کا حصہ قدرتی طور پر ایسا واقع ہوا ہے کہ اس کو بحیرۂ عرب گھیرے ہوئے ہیں،اس کے سامنے عمان ہے،اس کے دائیں خلیج فارس اوراس کے بائیں خلیج عدن ہے، عدن یمن کی پرانی بندرگاہ ہے،حضرموت گجرات کے سامنے واقع ہے،اور بحرین خلیج فارس کا بحری مرکز ہے،ان طبعی حالات کے سبب سے گجرات کا عرب کے ساتھ میل جول ایک قدرتی بات ہے، گجرات سے سندھ کا راستہ بھی کھلا تھا،اور جہاز یہاں سے

سندھ کی پرانی بندرگاہ دیول جاتے تھے، اسی طرح بری اور بحری دونوں سے دکھن کا راستہ بھی کھلا تھا، مشرق میں مارواڑ، مالوہ، خاندیس وغیرہ کا راستہ خشکی کا تھا اور اس پر کاروان تجارت برابر آتے جاتے تھے، الغرض گجرات کے ایک طرف سمندر اور دوسری طرف خشکی ہونے کے باعث اس کی جغرافی حیثیت بہت اچھی تھی، یورپ، مصر، عرب، شام، عراق وایران کے جہازوں کی آمدورفت کثرت سے تھی۔ لنکا، مدراس، بنگال، آسام، برما اور چین جانے والے جہاز گجرات کی کسی نہ کسی بندرگاہ پر ضرور ٹھہرتے تھے، گجرات کی خوش حالی اور ثروت کا سبب درحقیقت شروع ہی سے یہی تھا۔

گجرات کی قدیم بندرگاہیں

گجرات کی قدیم بندرگاہیں کون کون تھیں، ان کا صحیح صحیح حال معلوم کرنا مشکل ہے، ہندوستان کی قدیم تاریخ تاریکی میں ہے، اسلامی عہد میں جو بندرگاہیں جاری تھیں ان کو درج کیا جاتا ہے:

رومی اور یونانی تاریخوں سے جن بندرگاہوں کا پتہ چل سکا ہے ان کو بھی اس میں شامل کردیا گیا ہے، مثلاً دوارکا، سومناتھ، کچھ، کھنبایت (کھمبات)، ولبھی پور (گھوگھا)، دھولیرا (دھندھوکا)، بھروچ، رورکھ، گندھار، چیمور، سوپارہ، تھانہ۔

بعض لوگوں نے اس میں مندرجۂ ذیل ناموں کا بھی اضافہ کیا ہے: نوساری، بلی مورا، کیم، پوربندر، مانگرول، تھب، سورپہ پور، گندیوی، گوپناتھ اور مہُووہ۔

اسلامی عہد کی بندرگاہیں

جیسا کہ اوپر لکھا گیا ہے کہ گجرات ٹھیک عرب کے بالمقابل واقع ہے، چوں کہ اس زمانہ میں عربوں کا عروج تھا، اس لئے ان کے جہاز چین تک تجارتی مال لے کر جاتے تھے اور مختلف اغراض کی بناء پر ان کو گجراتی بندرگاہوں پر ٹھہرنا پڑتا تھا، ایک تو تجارتی مال کے خرید

وفروخت کے لئے، دوسرے سامان رسداور میٹھے پانی کے لئے۔

جب گجرات میں اسلامی حکومت قائم ہوگئی اور وہاں کے خودمختار سلاطین نے گجرات کو ترقی دینے کی کوشش کی تو گجرات اور کاٹھیاواڑ میں بہت سی بندرگاہیں کھل گئیں، چنانچہ مرآۃ سکندری، مرآۃ احمدی اور ظفر الوالہ میں تشریح کے ساتھ لکھا ہے کہ سلاطین گجرات کے عہد میں ۸۴ر بندرگاہیں تھیں۔

گجرات تین حصوں میں منقسم ہے: خاص گجرات، کاٹھیاواڑ اور کچھ، چنانچہ کچھ کی بندرگاہیں یہ تھیں: لکھ پت، مانڈوی، مُنْدَرَا، جکھو، کنڈلا، ٹونا۔

اور کاٹھیاواڑ کی بندرگاہیں مندرجۂ ذیل ہیں:

نولکھی (سوربی) چوڑیا، بیڈی (جام نگر)، سلایا، اوکھا (دوارکا)، پوربندر، نوسی بندر، مادھپور، مانگرول، جورواڑ، ویراول، سومناتھ، کوڑینار، دیو، جعفرآباد، مہووا، بھاؤنگر، دھولیرا، وبھی پور، گھوگھا، نوانگر (متصل دیو) گانف (متصل دھندھوکا)، جھون جھون واڑا۔

گجرات کے متعلق حسب ذیل بندرگاہیں تھیں:

کھنبایت (پرم)، بھروچ، بھاڑبھوت، گندھار، انکلیشور، ہانسوٹ، سورت، راندیر، ڈوس، نوساری، گندیوی، دنساڑ، دمن، ٹنکاریہ، دیہج، دہی گاؤں، کاوی، سنجان، بلی مورا، چیمور (متصل بمبئی) مہائم، تھانہ، سوپارہ، کلیان، دہانو۔

گجراتیوں کی جہاز رانی

گجرات اور کاٹھیاواڑ کے ساحلی باشندے آج بھی دریاؤں اور سمندروں سے بڑی دلچسپی رکھتے ہیں، ان کو سمندری تجارت اور جہاز رانی سے خاص شغف تھا، سندھ سے لے کر لنکا تک ان کے جہازوں کی آمدورفت تھی، یہ بھی کہا جاتا ہے کہ جاوا اور سماترا تک جاتے

تھے۔پہلی صدی عیسوی سے چوتھی صدی تک شرب خاندان کی حکومت خشکی اور تری پر یکساں تھی۔ان دنوں تجارت کو بڑا افروغ تھا۔چھٹی صدی میں سیلون اور سورٹھ میں تجارتی تعلقات بڑے وسیع تھے،اسی صدی میں لوگوں نے مہر احمد جاٹ کو کچھ سے نکال دیا،وہ اور دوسرے لوگ بحرین میں جا کر آباد ہوئے۔ہونگ شیا نگ چینی سیاح نے لکھا ہے کہ ایران کے شہروں میں ہندوؤں کو بھی آباد دیکھا ہے،یہ جاٹ ان جہازوں میں معلم کا کام کرتے تھے،جو ایران اور گجرات کے درمیان آمدورفت رکھتے تھے۔

نویں صدی میں گجراتی اس قدر طاقت ور ہوگئے کہ جاوہ میں برسر اقتدار آ گئے،اسی لئے وہاں کا تمدن چینی ہمسایوں کے مقابلہ میں ہندو تمدن اور کلچر سے زیادہ قریب تھا،چنانچہ وہاں کے راجہ کو مہاراج کہتے تھے،عرب سیاحوں نے بھی اپنے سفرناموں میں اس کا ذکر کیا ہے،اسی سبب سے جاوہ کا سکہ گجرات میں بھی چلتا تھا،جس کو طاطریہ کہتے تھے،اس کو بھی عرب سیاحوں نے لکھا ہے کہ گپت کے سکے بھی مدغاسکر (افریقہ) اور جاوہ میں چلتے تھے،اور جاوہ کی زبان مدغاسکر کے تاجر سمجھتے تھے۔عرب سیاحوں کا بیان ہے کہ بصرہ اور سیراف میں ہندو آتے تھے،مگر وہ خود بھی آپس میں ساتھ مل کر نہیں کھاتے تھے۔حالانکہ ان کی تعداد سو سے بھی زیادہ پہنچ جاتی تھی۔بزرگ بن شہریار نے جو تیسری صدی کا سیاح ہے اپنی کتاب میں ہندو بنیوں کا بار بار ذکر کیا ہے،یہ یمن بھی جاتے تھے اور کافی تجارتی فائدہ اٹھاتے تھے، گجرات کا ایک بنیا وینا یک (વિનાયક) نامی یمن میں سلسلہ تجارت رکھتا تھا اور خود بھی کبھی کبھی یمن جاتا تھا۔بھیم دیو دوم ۱۲۴۲ء/۶۴۰ھ کے پاس بھی بحری بیڑہ تھا اور ارجن دیو ۱۲۷۵ء/۶۷۴ھ کا امیر البحر ایک مسلمان تھا،اس سے معلوم ہوتا ہے کہ عربوں نے اس محکمہ کو بہت منظّم اور باقاعدہ بنادیا تھا۔

گجرات بحری مرکز کے طور پر

ماقبل تاریخ ہندوستان کی جہاز رانی کی تاریخ تاریکی میں ہے، تاہم جزئی واقعات سے پتہ چلتا ہے کہ گجرات کے شمال میں ۲۰۰ قبل مسیح دوارکا بحری مرکز تھا، جنوب میں بھروچ اور ۹۵۰ قبل مسیح میں (رورکھ) بھروچ مرکز نظر آتا ہے، پہلی صدی عیسوی سے کھنبایت کی ترقی شروع ہوئی، گووَلبھی راج یعنی چھٹی صدی میں گھوگھا کو مرکزیت حاصل تھی؛ لیکن تجارت کی منڈی کھنبایت ہی تھا، جنوب میں بھروچ اپنی جگہ پر رہا۔

ساتویں صدی میں بھی بھروچ اور کھنبایت بحری مرکز رہے، جیسا کہ ہونگ شیانگ چینی سیاح کے بیان سے پتہ چلتا ہے۔ آٹھوں صدی میں بھی گو بھروچ اور کھنبایت کی مرکزیت باقی رہی، مگر چیمور (متصل بمبئی) اور سوپارہ کو بھی بڑی اہمیت حاصل ہوئی، کیوں کہ وہ راشت کٹ راجاؤں کی راجدھانی ''مان کھیڑ'' سے قریب تر تھے، عرب سیاحوں نے اس کا ذکر خصوصیت کے ساتھ بڑی تفصیل سے کیا ہے، اسی طرح چوڑا خاندان کے پایۂ تخت پٹن سے بھی کھنبایت نزدیک تھا۔ آٹھویں صدی میں بھروچ کی حیثیت گر گئی اور کھنبایت بحری مرکز بن گیا، سولنکی راجاؤں اور باگھیلا خاندان کے (۱۳۰۴ء/۷۰۴ھ) عہد تک کھنبایت کی مرکزیت قائم رہی، خلجی اور تغلق کے زمانے میں بھی یہ اپنی اصلی حالت پر قائم رہا، سلاطین گجرات میں سے محمود شاہ اول تک کھنبایت اگرچہ بحری مرکز ضرور تھا؛ لیکن دیو ترقی کرنے لگا، سلطان مظفر دوم اور سلطان بہادر شاہ کے عہد تک دیو بحری مرکز رہا اور اس کی تجارتی حیثیت بھی بہت بڑھ گئی، لیکن محمود بن لطیف خان کے زمانے میں جب دیو پر پرتگیزوں کا قبضہ ہوگیا تو کھنبایت پھر بحری مرکز بن گیا، بڑے بڑے جہاز گھوگھا میں ٹھہرتے، اور وہاں سے کشتیوں میں مال لادکر کھنبایت میں اتارتے۔

مظفرشاہ آخری سلطان کے عہد میں امیروں کی خانہ جنگی سے مرکزی حکومت کا خاتمہ ہوگیا، بھروچ، سورت اور کھنبایت میں الگ الگ حکومتیں قائم ہوگئیں، مغل دور میں کھنبایت اور سورت کی مرکزی حیثیت تو قائم رہی؛ لیکن بھروچ گرگیا، عالمگیر کے زمانے میں ۱۶۰۰ء میں سورت کو بڑی ترقی ہوئی اور کھنبایت پر زوال آگیا، شاہ عالم کے عہد میں مؤمن خان ثانی کھنبایت کا شاہ بندر (پورٹ کمشنر) مقرر ہوا، تو گھوگھ اور بھروچ اس کے ماتحت ہوگئے، ۱۷۵۳ء/ ۱۱۶۷ھ بعد مرہٹوں کی لوٹ مار سے ملک میں سخت بدنظمی پیدا ہوگئی، کھنبایت، بھروچ، سورت وغیرہ بندروں پر جو لوگ قابض تھے وہ ان کے مالک بن بیٹھے، انگریزوں کے قبضۂ گجرات تک یہی عالم رہا، اس درمیان میں انگریزوں نے بمبئی کو ترقی دے کر بحری مرکز بنادیا، یہاں تک کہ وہ بھروچ اور سورت دونوں پر قابض ہوگئے اور کھنبایت کے نواب انگریزوں کے مطیع ہوگئے، غرض وہ تمام گجرات اور کاٹھیاواڑ پر قابض اور حکمران ہوگئے، تو انھوں نے ان بندرگاہوں پر ایسی ایسی شرطیں عائد کیں کہ وہ بند ہوگئے اور بمبئی پورے ہندوستان کا بحری مرکز بن گیا۔ (گجرات کی تمدنی تاریخ: ۲۶۵-۲۷۶)

سوپارہ کی قدامت

گجرات کے ایک مشہور پرانے شہر کا نام عربوں نے سوبارہ لکھا ہے، اصطخری (۳۴۰ھ) نے ہندوستان کے مشہور شہروں میں اس کا بھی ذکر کیا ہے اور اس کے بعد بیت المقدس کے سیاح بشاری (۳۷۰ھ) نے چوتھی صدی ہجری کے آخر (دسویں صدی عیسوی کے آخر) میں اس کا نام لیا ہے اور اس کی جگہ کھنبایت کے قریب بتائی ہے، اور دونوں میں چار مرحلوں کا فصل بتایا ہے اور کہتا ہے کہ ”سوپارہ سمندر سے قریب ایک فرسنگ کی دوری پر ہے۔“ (احسن التقاسیم، بشاری، ص: ۴۷۷، ۴۸۶ لیڈن)

پچھلے سالوں میں گجرات میں جو پرانی یادگاروں کی تحقیقات ہوئی ہے ان میں ایک سوپارہ نام کے شہر کا بھی پتہ چلتا ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ وہی شہر ہے جس کا عرب سیاحوں نے اپنے زمانے میں ذکر کیا ہے۔

۲رفروری ۱۹۳۰ء کے سنڈے بمبئی کرانیکل میں ص:۳۱، ۳۲ میں سوپارہ کی اثری تحقیق پر ایک مضمون نکلا ہے؛ جس کا خلاصہ یہ ہے:

> ''آثار قدیمہ کی تحقیقات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس شہر کا پتہ مگدھ دیش (بہار) کے مشہور راجہ اشوک کے زمانہ سے چلتا ہے، یہاں راجہ اشوک کا ایک یادگاری پتھر ۱۸۸۱ء میں ہمارے انہی محققوں کو ملا ہے، سیپارہ اب بھی بی بی سی آئی ریلوے کے ایک غیر معروف اسٹیشن کا نام ہے، جو اپنے قریب کے اسی نام کے ایک گاؤں کے سبب سے رکھا گیا ہے، پنڈت بھگوان لال اندرجی (آنجہانی) نے یہاں اشوک کے سنگی کتبہ کا پتہ لگایا تھا، اب یہ مقام بمبئی کے علاقہ میں بسین سے جو سمندر کے کنارے ہے، تین چار میل اتر اور خاص شہر بمبئی سے تیس میل ہے۔

سن ۲۵۰ قبل مسیح میں یہ مقام ہندوستان کے مشہور و پر رونق شہروں سے تھا، جس کے سبب سے یہ ان چند خوش قسمت شہروں میں منتخب ہوا جہاں راجہ اشوک نے اپنے یادگاری پتھر لگائے، سوپارہ والا پتھر یہاں سے اٹھ کر پرنس آف ویلز میوزیم (مغربی ہند) میں رکھا گیا ہے، اس میں دس سطریں ہیں، پہلی چار سطریں مٹ گئی ہیں، اس کا خط وہ خط ہے جو دیوناگری اور دوسرے ہندی حروف کی اصل ہے اور جس کے متعلق یوروپین محقق بوشلر کی رائے ہے کہ یہ تجارتی آمد و رفت کی راہ ہے، مسیح سے سات آٹھ سو برس پیشتر عراق سے ہندوستان آیا تھا۔

ڈاکٹر بھنڈارکر کہتے ہیں کہ بمبئی میں ٹھاٹھ کے ضلع میں سوپارہ مشہور بندرگاہ تھا، جس کا

نام مہا بھارت میں سور پار یکا ہے اور بطلیموس نے اپنے جغرافیہ میں اس کا نام سوپارہ لکھا ہے، یہ ایک مقدس مقام اور اپارنتا کا دارالحکومت تھا۔

موجودہ سوپارہ اسی نام کے قدیم مشہور شہر کے موقع پر آباد ہے، یہ ایک خلیج کے بائیں کنارہ پر واقع ہے، جو خلیج بسین کے ریلوے پل اور دریائے وٹرنا کے درمیان گھومتی نظر آتی ہے، پرانے سوپارہ میں اب بھی پرانی عمارات کے نشانات باقی ہیں، یہاں ایک رام کنڈ بھی ہے جو اس کے تیرتھ ہونے کی دلیل ہے۔

۱۸۸۱ء میں جب سوپارہ کے یادگاری پتھر کا پتہ لگا ہے اس وقت اس گاؤں میں بمشکل چھ سو گھر تھے، جن میں تقریباً دو ہزار آدمی رہتے تھے، ان میں برہمن، ہندوستانی عیسائی اور مسلمان باشندے ہیں، مسلمانوں میں عرب اور ایرانی ہیں، جو سات صدی پیشتر سے تجارتی تعلق سے یہاں آباد ہوئے۔

اس خلاصہ سے معلوم ہوگا کہ گجرات کے دوسرے ساحلی تجارتی شہروں کی طرح یہاں بھی مسلمان آباد تھے اور اگر راجہ اشوک کے سنگی کتبہ اور بطلیموس کے جغرافیہ سے اس آبادی کا مسیح سے ڈھائی سو برس پہلے نشان ملتا ہے تو مسلمان عرب سیاحوں کے بیان سے اس کا مسیح سے ایک ہزار برس بعد بھی پتہ چلتا ہے۔ (عرب و ہند کے تعلقات: ۲۵۹-۲۶۱)

عرب کا جغرافیہ

خطۂ عرب اور ہندوستان ایشیائی براعظم کے رشتہ سے ایک دوسرے سے منسلک ہیں، ان دونوں کے درمیان ایک طویل وعریض آبی خطہ حائل ہے، اس کا ایک کنارہ عمان، یمن، حضرموت اور حجاز کے ساحلوں تک پھیلا ہوا ہے، دوسرا کنارہ جنوبی ہند، مالابار اور مدراس کے بحری ساحلوں سے ملتا ہے، تیسرا کنارہ باب المندب سے نکل کر بحر قلزم تک پہنچتا ہے، جو آبی خطہ عرب سے متصل ہے وہ بحر عرب اور جو حصہ ہند سے ملحق ہے وہ بحر قلزم کہلاتا ہے۔

عرب قوم کا مرکزی وطن زمین کا وہ حصہ ہے، جسے ''جزیرہ نمائے عرب'' کہتے ہیں،

اس کے تین طرف پانی ہے اور ایک طرف خشکی، یہ جزیرہ نما براعظم ایشیا کے جنوب مغرب میں واقع ہے، اس کی شمالی سرحدیں شام اور عراق سے ملتی ہیں اور جنوبی سرحدیں بحر ہند سے، اس کے مشرق میں خلیج فارس اور عمان کے علاوہ بحر ہندواقع ہیں، مغرب میں بحر قلزم (Red Sea) ،عرب باشندوں کی مجموعی تعداد، یورپ کی مجموعی آبادی کی چوتھائی ہے، اس جزیرہ نما کے اندر پہاڑوں کا ایک سلسلہ ہے جسے کوہ سرات کہتے ہیں، یہ سلسلہ شام کی سرحدوں سے ملتا ہے، اس کی وجہ سے جزیرہ نما عرب قدرتی طور پر دو حصوں میں تقسیم ہو گیا ہے: (۱) مغربی حصہ اور (۲) مشرقی حصہ۔

مغربی حصہ کوہِ سرات کے دامن سے لے کر بحر احمر (Red Sea) کے ساحل تک پہنچتا ہے، اسی لئے اس کے نشیبی علاقے کو (غور) کہتے ہیں اور چوں کہ اس علاقہ میں گرمی بہت پڑتی ہے، اس لئے اسے تہامہ یعنی پیاس لگنے کی جگہ کہتے ہیں۔

مشرقی حصہ ابھرا ہوا ہے، اس کی سرحدیں عراق سے ملی ہوئی ہیں، اس لئے اس کو نجد یعنی ''اونچی زمین'' کہتے ہیں، ان دونوں حصوں کے بیچ میں زمین کا جو ٹکڑا ہے اسے حجاز یعنی حد فاصل کہتے ہیں۔

پہلی بحری تاجر قوم: عرب

وہ پہلی تاجر قومیں جنہوں نے سب سے پہلے سمندری تجارت کا دروازہ کھولا اور سمندروں میں جہازرانی کے ذریعہ تجارت کی، وہ فینقی یا فینشی کنعانی، آرامی اور کلدانی قومیں تھیں، یہی وہ قومیں تھیں جن کو قرآن کریم نے 'عاد ارم' کا لقب دیا، الم تر کیف فعل ربك بعاد، ارم ذات العماد. [الفجر] جدید محققین اور یورپ کے مستشرقین نے لکھا ہے کہ وہ عرب تھے جو ساحل بحرین سے اٹھ کر شام میں سکونت پذیر ہوئے، جہاں سے وہ یونان کے

جزیروں، یورپ کے ملکوں اور شمالی افریقہ کے کناروں تک پہنچے، ایران و ہند اور چین کی بندرگاہوں پر لنگر انداز ہوئے، ان ہی کے ذریعہ یونانی تہذیب کی بنیاد پڑی اور یہی لوگ شمالی افریقہ کے قرطاجنا (کارتھیج) کی تہذیب کے بانی ہوئے۔

ہندوستان کو یہ شرف اور اعزاز حاصل ہے کہ اس کی آغوش باہر سے آنے والی ہر قوم کے لئے ہمیشہ کھلی رہی، چنانچہ آریائی قبیلوں کے صحرائے گوبی یا سنٹرل ایشیاء کے آنے سے صدیوں پہلے عراق، میسوپوٹیمیا کے مشہور قبیلے سمیری نے اپنے آبائی وطن عراق سے رخت سفر باندھ کر ہندوستان میں ڈیرہ ڈالا اور اس ملک کو اپنا وطن بنایا، یہی لوگ دراوڈ کہلائے اور ان ہی کے قدموں نے ہند کی سرزمین پر عراقی تہذیب کا سب سے پہلا نقش قائم کیا۔

پھر جب وسط ایشیاء کے میدانوں سے آریوں کی آمد کا سیلاب اُمڈنا شروع ہوا تو یہ دراوڈی قوم جنوبی ہند کے خطے میں محصور ہو کر رہ گئی۔

تاریخ عالم کے تجارتی احوال میں سب سے پہلے جو قوم بحری کاروبار کرتی دکھائی دیتی ہے وہ عرب قوم ہے، جو تجارتی اسفار کرتے ہوئے سندھ کی بندرگاہ دیبل (موجودہ کراچی) تک پہنچی اور رن کچھ سے گجرات، کاٹھیاواڑ اور وہاں بندرگاہ تھانہ (بمبئی) کالی کٹ اور راس کماری تک پہنچی، پھر کولم (مدراس) اور بنگال سے ہوتے ہوئے چین تک جا پہنچی۔

تاریخ ہند میں درج ہے کہ اگاتھرس ۲۰۰ ق م کے جہاز ہندوستان کے ساحل سے سبا (ملک یمن) تک آتے اور وہاں سے مصر پہنچتے۔ (تاریخ ہند الفنسٹن، ص:۱۸۲) بہر حال قدیم ملک یمن اور حضر موت کی خوش حالی کا راز عربوں کی وہ تجارت ہے جو خشکی اور تری کے راستے ہندوستان سے ہوتی تھی۔ (انسائیکلو پیڈیا آف برٹانیکا، ص:۱۲۶۴، عرب و ہند کے تعلقات: ۲۵۹، ۲۶۱)

عربوں کا سندھ پر فاتحانہ حملہ پہلی صدی ہجری میں شروع ہوا تھا، لیکن ان دونوں قدیم العہد قوموں میں اس سے صدیوں پہلے دوستانہ روابط قائم تھے، ہندوستان آرین قوم کی

قدیم نسل ہے تو عرب سامی قوم کی صحیح اور اصلی یادگار ہے۔

قدیم ہندی (دراوڑ) قوم کا وطن عراق

گجرات کی قدیم تاریخ معلوم کرنا دشوار ہے، لیکن قیاس کیا جاتا ہے کہ پتھر اور لوہے کے زمانے کے بعد گجرات میں بڑی تعداد میں دراوڑوں کی آبادی تھی، مؤرخوں کا ماننا ہے کہ دراوڑ ہندوستان کے اصل باشندے نہیں تھے، بلکہ عراق یا اس کے آس پاس کے رہنے والے تھے، مغربی سرحد پار کر کے ہندوستان میں حملہ آور ہونے کی حیثیت سے داخل ہوئے تھے، اللہ تعالیٰ نے انہیں عمدہ صلاحیتوں سے نوازا تھا، بڑے مہذب اور متمدن تھے، رفتہ رفتہ یہ لوگ جنوبی ہند میں پھیلنے لگے تھے، تجارت میں بڑے ماہر تھے، چنانچہ انہوں نے بھروچ بندرگاہ سے دور دور تک تجارتی کاروبار پھیلا رکھا تھا، دوسرا نمبر بھیل لوگوں کا تھا، جو تمام ملکوں میں پھیلے ہوئے تھے۔

جب شمالی ہند سے آریہ ''آبو'' کے راستہ سے گجرات آئے تو ملک میں نیا انقلاب پیدا ہو گیا، یہ بڑے متمدن تھے، علم و تمدن اور شائستگی اپنے ساتھ لائے تھے، قدیم آریہ قوم کا دستور یہ تھا کہ وہ زیادہ تر پانی کے قریب اپنی بستیاں بساتے تھے، اس لئے قیاس کیا جاتا ہے کہ انہوں نے بھی اسی صوبہ میں سب سے پہلے کھنبایت اور بھروچ کے علاقہ کو آباد کیا ہوگا۔
(تاریخ گجرات: ص:۸۱، علماء گجرات کی حدیث کی خدمات: ص:۳۴)

ملک عرب کے قدیم باشندے

عرب تاجر دو ہزار برس قبل مسیح سے برابر مشرق و مغرب کے درمیان کی کڑی رہے ہیں، ہندوستان سے جو مال تجارت جاتا وہ یمن اور حضر موت کے سواحل پر اترتا اور پھر وہاں سے بحر احمر کے کنارے کنارے شام اور یورپ پہونچتا تھا۔

سوال یہ ہوتا ہے کہ ہندوستان سے مال تجارت یمن اور حضر موت لے جا کر یورپی

ممالک پہنچانے والی قوم کون تھی؟ عام طور پر اکثر مؤرخین کا قول یہ ہے کہ وہ قوم سباء تھی۔

"صرح المؤرخ اليونانی "آجاثرشيدين " أنه لم تكن هناك امة اغنی واثری علی وجه الارض من السبائيين بحكم وضعهم فی مركز تجاری استراتيجی حيث يلتقی فيه جميع الطرق التجارية بين القاراة." (العرب والہند قبل الاسلام: ۵٦،عرب وہند کے تعلقات:ص:٦)

A history of persian Navigation, By Hadi Hassan. (London 1928 p.p. 45-47)

یونانی مؤرخ ''آگاتھرشیدس'' نے اس بات کی وضاحت کی کہ کرۂ ارض پر قوم سبا سے زیادہ مالدار کوئی قوم نہیں تھی؛ کیوں کہ انہوں نے ایسی جگہ پر سکونت اختیار کی تھی جو کہ تجارت کا اہم مرکز تھا، اس طور پر کہ اس جگہ بین الاقوامی تجارت کے تمام راستے جمع ہوتے تھے۔

"ان سفن العرب التجارية كانت تصل الی "اوقبر" مرة فی كل ثلاث سنوات فی عهد سليمان وتحمل من هناك الذهب والفضة والجواهرات والبخوروالعاج والقردة والطاؤس وغيرها. (العرب والہند قبل الاسلام:۵٦)

حضرت سلیمان علیہ الصلاۃ والسلام کے عہد میں عرب کی تجارتی کشتیاں کبھی کبھی ہر تین سال میں ''اوقبر'' پہنچتی تھی اور یہاں سے سونا، چاندی، جواہرات، خوشبودار لکڑی، ہاتھی دانت، بندر اور مور وغیرہ لے جاتے تھے۔

"ان تجارة الهند البحرية ظلت فی أيدی العرب من عهد

یوسف علیہ السلام الی واسکودی غاما“ (المصدرالسابق:
الباب العاشر)

بحرِ ہند کی تجارت حضرت یوسف علیہ السلام کے عہد سے واسکوڈی گاما کے زمانے تک عرب ہی کے ہاتھ میں رہی ہے۔

اگرچہ جزیرۃ العرب میں قدیم زمانہ میں سونے چاندی کی کانیں تھیں، جیسا کہ ہمدانی نے ذکر کیا ہے، لیکن مانگ کی زیادتی کے سبب سونا، چاندی اور عقیق ہندوستان سے بھی جاتا ہوتو کیا تعجب کی بات ہے؟! خود ہندوستان میں سونا چاندی کی کانیں ہونے کے باوجود امریکہ وافریقہ سے بکثرت سونااورچاندی آتا ہے، چنانچہ کچھ سال پہلے بیرون ممالک کھمبایت سے عقیق بکثرت جایا کرتا تھا، توممکن ہے کہ ماضی میں جوعمدہ خوشبو، جواہرات، سونا وغیرہ یمن کی بندرگاہ عدن اور حضرموت سے شام جاتا ہوا دکھائی دیتا ہے وہ ہند(سواحل گجرات) سے گیا ہو۔

حضرت سلیمان علیہ السلام کے عہد میں جن اشیاء کی تجارت ہوتی تھی، اس کے متعلق تو مؤرخ ’جوزیفس‘ نے صراحۃً لکھا ہے کہ وہ سوپارہ اور رورکھ متصل بھروچ سے جایا کرتی تھیں اور مؤرخِ مذکور کے بقول:

> ”حضرت سلیمان علیہ السلام کے عہد میں ہاتھی دانت، بندر، مور وغیرہ گجرات کے سواحل ”سوپارہ“ اور ”رورخ“ (متصل بھروچ) سے فلسطین جاتے تھے۔(تاریخ گجرات:۱۸۶)

مولانا سید ابوظفر ندوی نے تاریخ گجرات میں قوم سبا کے متعلق لکھا ہے کہ قوم سبا جن چیزوں کی تجارت کیا کرتی تھی، وہی چیزیں ہمیں دو ہزار قبل مسیح سے مصر جاتی ہوئی نظر آتی ہیں۔

اسی طرح ۱۰۰۰قبل مسیح حضرت داودعلیہ السلام سبا(یمنی عرب) سے سونا طلب فرماتے تھے،۹۵۰ق م میں ملکہ سبا نے حضرت سلیمان علیہ السلام کو جوتحفہ پیش کیا تھااس میں خوشبودار اشیاء،سونا اور جواہرات بھی تھے،۷۰۰ق م صنعاء(یمن) سے شام کوفولاد، تیز پات اور مسالہ جاتا تھا۔(تاریخ گجرات:۱۸۲)

۴۰۰قبل مسیح سے ۱۰۰قبل مسیح تک مصر پر یونانیوں کا قبضہ رہا اور وہ سبا(یمنی عرب) سے بہت زیادہ متعارف تھے، چنانچہ۱۹۴قبل مسیح میں یونانی مؤرخ ''اراٹوستھینس''عرب کے متعلق لکھتا ہے:

عرب کی انتہائی حد پر سمندر(بحر ہندوعرب) کے پہلو میں سبا کے لوگ ہیں، جن کا دارالحکومت ''مآرب'' ہے،قوم سبا حضرموت اور معین جیسے خوش وخرم ملک کے رہنے والے ہیں۔

۱۴۵قبل مسیح میں دوسرا یونانی مؤرخ ''آگاتھرشیدس''عرب کے متعلق لکھتا ہے:

''سبا عرب میں رہتے ہیں، تمام دنیا میں سب سے زیادہ دولت مندلوگ ہیں، چاندی اور سونا بکثرت ہرطرف سے لایا جاتا ہے، یہی سبب ہے کہ کسی نے اس کو فتح نہیں کیا۔''

''قوم سبا'' کے ہاں ان قیمتی اشیاء کی درآمد ہندوستان کے ساحل سے ہوا کرتی تھی اور یہ ساحل درحقیقت گجرات کے تھے۔

یونانی مؤرخ آگاتھرشیدس لکھتا ہے:

"ان السفن كانت تقدم من سواحل الهند الى سبا(اليمن) ومن سبا تتوجه الى مصر."

کشتیاں سواحل ہند سے قوم سبا کی بستیوں میں پہنچتی تھیں اور وہاں سے مصر کی طرف روانہ ہوتی تھیں۔

بلکہ یمن ہندوستان کے تجارتی سامانوں کے لئے ایک بڑا مارکیٹ بن چکا تھا۔

كانت اليمن سوقا كبيرة للبضائع الهندية منذ عصور بالغة في القديم و كثيرا ما كان يتردد اليها التجار الهنود، يقول استاذ احمد أمين :" و كان لسكان اليمن قديما علاقات بالهند و الشرق الادنى."

یمن قدیم زمانہ میں ہندوستانی تاجروں کے سرمایہ کے لئے ایک بڑا بازار سمجھا جاتا تھا اور ہندوستانی تاجروں کی یمن کثرت سے آمد ورفت رہا کرتی تھی، استاذ احمد امین فرماتے ہیں کہ یمن کے باشندوں کے ہندوستان اور مشرق ادنی سے قدیم تعلقات تھے۔

ایک اور موقع پر لکھتے ہیں:

كانت التجارة قديما في يد اليمنيين (السبائيين) و كانوا هم العنصر الظاهر فيها، فعلى ايديهم كانت تنقل غلات حضر موت و الهند الى الشام و مصر. (المسالک والمما لک ۱۲/۱۵)

''قدیم زمانہ میں تجارت اہل یمن کے ہاتھ ہی میں تھی اور یہ لوگ تجارت میں کافی ماہر تھے، انہی کے ہاتھوں حضرموت اور ہندوستان کا سامان شام اور مصر جایا کرتا تھا۔

نوٹ: قارئین اس بات کو یاد رکھیں کہ ''گجرات'' ہی کو عرب لوگ ہند کہتے تھے جب کہ سندھ کو سند کہتے تھے۔ (گجرات کا سانسکرتک اتہاس:۱۰۵۲)

قدیم زمانہ میں عرب کی بندرگاہیں

گجرات اور عرب کے تجارتی تعلق کو سمجھنے کے لئے جس طرح گجرات کی قدیم بندرگاہوں کا جاننا ضروری تھا، اسی طرح عرب کے قدیم ساحلوں کو جاننا بھی ضروری ہے۔

مشہور جغرافیہ نویس اور صاحب ''المسالک والممالک'' ابواسحاق ابراہیم بن محمد فارسی اصطخری لکھتے ہیں:

''فبلاد العرب يحيطها بحر فارس من عبادان فيمتد على البحرين، حتى ينتهي الى عمان ،ثم يعطف على سواحل مهره وحضر موت ، وعدن حتى ينتهي على سواحل يمن الى جدة ،ثم يمتد على الجار ومدين حتى ينتهي الى ايلة وثم انتهى حينئذ حد ديار العرب عن هذا البحر. (المسالک والممالک۱۲-۱۵)

''ملک عرب بحر فارس (بحر عرب) سے یوں گھیرا ہوا ہے کہ ''عبادان'' سے ''بحرین'' ہوتا ہوا ''عمان'' چلا گیا ہے ، پھر وہاں سے مڑ کر سواحل مہرہ، حضر موت اور عدن پہنچا ہے، پھر سواحل ''یمن'' سے ''جدہ'' تک گیا ہے، پھر ''جار اور مدین'' پر مڑ کر ''ایلہ'' پہنچا ہے، جہاں پر دیار عرب کی بحری حد ختم ہو جاتی ہے۔

مولانا ابوظفر ندوی گجرات اور عالم عرب کے سواحل اور ان کے باہمی تعلقات پر روشنی ڈالتے ہوئے رقم طراز ہیں:

''گجرات کے مغربی حصہ کو بحیرۂ عرب گھیرے ہوئے ہیں، اس کے

سامنے عمان ہے، دائیں جانب خلیج فارس اور بائیں جانب خلیج عدن
واقع ہے، ملک عرب میں یمن سے حضر موت خصوصیت سے وہ
ملک ہیں ،جن کا ہندوستان (سواحل گجرات) سے گہرا تعلق رہا
ہے۔'' (تاریخ گجرات:ص:۱۸۰)

نیز مشہور محقق مؤرخ اور ادیب علامہ سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں:

''بحرین، عمان، حضر موت، یمن اور حجاز یہ وہ مقامات ہیں؛ جو بحر
احمر، بحر ہند اور خلیج فارس پر آباد ہیں، انہیں مقامات کو قدرۃً اس بحری
تجارت کا موقع حاصل تھا۔'' (عرب و ہند کے تعلقات:ص:۴۴)

ماقبل میں مذکور تفصیل ملحوظ رکھنے سے یہ بات واضح ہوکر سامنے آجاتی ہے کہ یہ مقامات سواحل گجرات کے بالکل سامنے ہیں، سواحل گجرات اور عرب کے ان مقامات کا آمنے سامنے ہونا فطرۃً اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ ان دونوں علاقوں میں قدیم زمانے سے ضرور تعلقات رہے ہوں گے، چنانچہ تاریخ کی کتابوں اور مشہور سیاحوں کے اقوال سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ ہندوستان سے مال تجارت بحری راستہ سے ''یمن'' اور ''حضر موت'' پہونچتا تھا اور یہاں سے براہ خشکی بحر احمر کے کنارے کنارے شام اور مصر آتا تھا اور پھر یہاں سے بحر روم ہوکر یورپ چلا جاتا تھا۔

انسائیکلو پیڈیا آف برٹانیکا میں لکھا ہے:

''جنوبی مغربی عرب (حضر موت اور یمن) کی خیر و برکت کا سب
سے بڑا سبب اس زمانہ میں یہ تھا کہ مصر اور ہندوستان کے درمیان کا
تجارتی سامان سمندر کی راہ سے پہلے انہیں ساحلی مقامات پر

آتا تھا اور پھر خشکی کی راہ سے مغربی ساحل پر جاتا تھا، یہ تجارت ۱۰۰ قبل مسیح میں بند ہوگئی تھی؛ کیوں کہ مصر کے بطلیموسی بادشاہوں نے ہندوستان سے اسکندریہ تک براہ راست ایک راستہ بنا لیا تھا۔

(عرب وہند کے تعلقات:۳۵)

اگر یوں کہا جائے کہ دنیا کی تجارت کا حال ہم اس وقت سے معلوم کر سکتے ہیں، جب سے سواحل عرب کو گجرات کے سواحل سے تعلق رہا ہوگا تو کوئی تعجب کی بات نہ ہوگی، چنانچہ تورات کے اوراق الٹنے سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دو ہی نسل کے بعد حضرت یوسف علیہ السلام کے زمانہ میں تجارتی قافلہ عرب کے ان سواحل (حضرموت ویمن) سے گزرا کرتا تھا، یہ وہی کارواں ہے، جو حضرت یوسف علیہ السلام کو مصر پہنچاتا ہے:

”وجاء فی کتاب تاریخ الهند لألفستون: ان تجارة الهندية البحرية ظلت فی ایدی العرب من عهد یوسف علیه السلام الی ایام ”واسکودی غاما.“(عرب وہند کے تعلقات:۴۵)

”ہندوستان کی بحری تجارت حضرت یوسف علیہ السلام کے عہد سے لے کر ”واسکودی گاما“ کے عہد تک عرب ہی کے قبضہ میں تھی۔“

(عرب وہند کے تعلقات، ص:۴۵، علماء گجرات کی حدیث کی خدمات:۳۴-۴۱)

اہل گجرات کی عرب میں آمد ورفت

عام طور پر یہ غلط روایت ہندوستانیوں کے متعلق مشہور ہے کہ وہ باہر جانے اور بحری سفر کو پاپ سمجھتے تھے، جیسا کہ الفنسٹن نے بھی اس کی تائید کی ہے، لیکن سید عابد علی وجدی الحسینی نے لکھا ہے کہ ہندی لوگ اہل عرب کے درمیان جانے پہچانے جاتے تھے، چنانچہ ان کو زط (جاٹ) سیابچہ (سندھی لوگ) اساورہ اور اسامرہ کے القاب سے یاد کیا جاتا تھا،

خصوصا زط اور سیابچہ یعنی جاٹ اور سندھی لوگ عرب کے مشرقی ساحلوں پر یمن اور حضرموت کے علاقوں میں بکثرت پائے جاتے تھے، اس لئے جس طرح اہل عرب ہندوستانیوں کے لئے کوئی اجنبی مخلوق نہیں تھے، اسی طرح عرب لوگ اہل ہند سے بیگانہ نہ تھے۔

عرب میں گجراتیوں کی بستیاں

قدیم تاریخ میں عرب اقوام کے ہندوستان میں قیام کا کوئی نام ونشان نہیں ملتا اور نہ ان کے زیادہ وقت ٹھہرنے کا ثبوت ملتا ہے، اس کے برعکس ہندوستان کے باشندوں کے عرب میں کثرت سے آباد ہونے کا ثبوت ملتا ہے، جو وہاں مستقل طور پر آباد ہوگئے تھے۔

(عرب اور ہند عہد رسالت میں: ص:۱۰۷)

عرب میں آباد سات ہندوستانی قوموں میں سے مید، اساورہ، احامرہ اور بیاسرہ وغیرہ کا تعلق سندھ اور گجرات سے تھا۔

ہندوستانیوں کے ساتھ عربوں کا حسن سلوک، رواداری اور مہمان نوازی بدستور قائم تھی، اس کی وجہ یہ بھی تھی کہ عربوں کو گھر بیٹھے ضروریات کی چیزیں ہندوستانیوں کے ذریعہ مل جایا کرتی تھیں، کئی عرب قبائل نے ہندوستانیوں کو اپنی ولاء میں لے رکھا تھا، اس کے علاوہ ہندوستان کے لوگ بت پرستی میں جاہل عربوں کے ہم مشرب تھے، اس لئے دونوں ملکوں میں تعلقات اور بھی مضبوط ہوئے، مذہبی یک رنگی، عادات وخصائل اور رسم ورواج یکساں تھے، اس لئے ہندوستانی باشندے عرب میں اپنے قدم جمانے میں کامیاب ہوگئے، عرب اور ہندؤوں کے درمیان تعلقات کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ ایران کے شہنشاہ کا قبضہ بلوچستان اور سندھ کے اوپر رہا، اس قبضہ کی وجہ سے بعض فوجی دستے ایرانی فوج میں داخل ہوگئے، ان جنگجو قبیلوں میں دو کا ذکر عربوں نے کیا ہے، اور وہ ''جاٹ'' اور ''میڈ'' ہیں، یہ دونوں سندھ کی مشہور قومیں تھیں۔ (ہندوستان اسلام کے سایہ میں، ص:۱۹، ۹۸)

اسی طرح بحرین ،عمان ، یمامہ ، نجران ،مکہ مکرمہ ،مدینہ منورہ اورتبوک کے اطراف میں ہندوستانی باشندوں کی بستیوں کا پتہ چلتا ہے۔

عرب میں آباد ہندوستانی (گجراتی) قومیں

سندھ اور ہند کی سات قومیں

عرب میں ہندؤوں اور سندھیوں کی جومختلف جماعتیں موجود تھیں وہ مندرجۂ ذیل ہیں: زُطّ (جاٹ) میڈ، تکارہ، سیابچہ، اساورہ، احامرہ، بیاسرہ، یہ اقوام اپنے مختلف پیشوں کی وجہ سے مختلف ناموں سے یاد کی جانے لگیں، وھم جنس من السنودان (السنود)و الھنود. (مجمع بحار الانوار:ص:۲/۶۲) یہ ہندوستانی جنگجوقوم جوسیاہ رنگ کی تھی، ان میں سے کچھ ساحلی علاقوں میں آباد ہوکر مویشی، بھیڑ، بکریاں، اونٹ وغیرہ پالتے تھے اور کچھ مستقل طور پر ساحلی شاہراہ پرآباد ہو گئے تھے، سوق اھواز سے فارس تک جانے والی شاہراہ پر جاٹوں کا بڑا شہرآباد تھا، جسے انہیں کے نام پر زط کہا جاتا تھا۔ ابن خرداذبہ لکھتا ہے کہ اھواز سے ازم تک چھ فرسخ کی مسافت ہے اور ازم سے عَبُدین پانچ فرسخ پر ہے، پھر رام ہرمز تک چھ فرسخ ہے، پھر وہاں سے زُطّ چھ فرسخ پر ہے، یہ خوزستان کے علاقہ میں جاٹوں کا بارونق شہر تھا۔ (المسالک والممالک:ص:۴۳)

[ا] مید: برصغیر کا اور ایک گروہ جوزمانۂ قدیم سے عرب میں موجود تھا، عربوں کی عام بولی میں ''مید'' کے نام سے موسوم تھا، زط یعنی جاٹوں کی طرح یہ لوگ بھی ایرانیوں کے ذریعہ عرب کے مختلف علاقوں اور شہروں میں گئے تھے، سب سے پہلے یہ ایران کی فوج میں بھرتی ہوکر برصغیر سے ایران پہنچے اور پھر وہاں سے عرب کے شہروں میں گئے۔

عرب ان کو ''مید'' اس لئے کہتے تھے کہ یہ بحری قزاق اور ڈاکو تھے، جوعربوں کے جہاز اور کشتیاں لوٹ لیتے تھے اور ان کے تجارتی کاروبار کو جوسمندری راستے سے ہوتا تھا؛

نقصان پہنچاتے تھے۔

عرب کے قدیم جغرافیہ نویس ابن خرداذبہ کی تحقیق کے مطابق یہ لوگ دریائے سندھ سے لے کر دور تک پھیلے ہوئے تھے، گجرات کاٹھیاواڑ کے علاقے بھی ان کی تگ وتاز کی زد میں تھے، یہ بدھ مذہب سے تعلق رکھتے تھے۔

والکفار فی حدود بلاد السند،انما هم البدة وقوم يعرفون بالميد.
(المسالک الممالک،ص:۱۶۷)

بلادسندھ میں جوکافرفروکش ہیں، وہ بدھ ہیں اور یہ وہ لوگ ہیں، جنہیں مید کہاجاتا ہے۔

ابن خرداذبہ اس سے آگے لکھتا ہے کہ مید دریائے سندھ کے کنارے کناروں سے لے کر ملتان تک کے علاقوں میں پھیلے ہوئے ہیں اوراس نواح میں ان کی بہت سی چراگاہیں اور آبادیاں ہیں۔

مختلف کتابوں میں بکھری ہوئی معلومات سے پتہ چلتا ہے کہ سندھ ، گجرات، کاٹھیاواڑ ،علاقۂ ملتان اور راجستھان میں اس گروہ سے تعلق رکھنے والے لوگ اچھی خاصی تعداد میں موجود تھے، ساحلی علاقوں میں لوٹ مار کرنا؛ نیز سمندروں اور دریاؤں میں ڈاکے ڈالناان کا کام تھا، یہی مید (یعنی سمندری لٹیرے) تھے جنہوں نے پہلی صدی ہجری کے آخر میں اس جہاز کولوٹا تھا؛ جوسرندیپ سے آرہا تھااور جس میں مسلمان عورتیں اور بچے سوار تھے، سرندیپ کے راجہ نے ان کوعزت اوراحترام کے ساتھ اموی خلیفہ کے پاس بھیجنا چاہا تھا۔

فتوح البلدان میں مرقوم ہے:

فعرض للسفينة التى كن فيها ، قوم من ميد الدبيل فى بوارج . (ص:۴۲۳)

جس جہاز میں یہ عورتیں سوار تھیں، اس کودبیل کے مید کی ایک جماعت نے کشتیوں پر سوار ہوکر گھیر لیا۔

طویل عرصہ تک برصغیر کے یہ سمندری قزاق ساحلی علاقوں میں آباد رہے اور دہشت پھیلاتے رہے، تیسری صدی ہجری میں دولت ماہانیہ سنجان (گجرات) کے حکمرانوں نے ان کو ختم کیا اور یمن کی حدود سے لے کر کاٹھیاواڑ تک کے ساحلوں کو ان کے وجود سے پاک کردیا۔

برصغیر کا یہ وہ گروہ تھا، جس سے عرب متعارف تھے اور جس کی عرب علاقوں میں آمدورفت تھی۔

یہ بحری ڈاکو سندھ سے گجرات بلکہ اس سے بھی آگے ساحلی مقامات تک پھیلے ہوے تھے اور خشکی کی کمائی کے ساتھ بحری کمائی بھی کرتے تھے، یہ بدھ مذہب کے پیرو تھے۔

(المسالک والممالک، ابن خرداذبہ: ص:۴۳، ۷۷)

[۲] زُط:

یہ عربی زبان کا لفظ ہے اور اس کے معنی ''جاٹ'' کا ''جٹ'' کے ہیں، یہ برصغیر کی وہ قوم اور اس نواح کا وہ گروہ ہے جس کے بہت سے افراد قدیم دور سے عرب میں آباد تھے، یہ لوگ درحقیقت پنجاب، سندھ اور بعض مؤرخین کے نزدیک بلوچستان میں بھی موجود تھے۔ لسان العرب میں ان کے بارے میں مرقوم ہے:

الزط: جيل اسود من السند، وقيل: الزط اعراب جت الهندية وهو جيل من اهل الهند وهم جنس من السودان والهنود. (لسان العرب:۷/ ۳۰۸)

یعنی زط سندھ کے سیاہ رنگ کے لوگ ہیں، کہا جاتا ہے کہ زُط ہندی لفظ جٹ کا معرب ہے اور یہ لوگ اہل ہند میں سے ہیں، جن کے رنگ سیاہی مائل ہے اور ہندوستانیوں کی جنس سے تعلق رکھتے ہیں۔

علامہ محمد بن طاہر پٹنی مشہور کتاب ''مجمع بحار الانوار'' میں ان کے متعلق لکھتے ہیں:

وهم جنس من السودان (السنود) والهنود. (مجمع بحارالانوار:۲/۶۲)

زُط سیاہ رنگ کے سندھیوں اور ہندیوں کی جنس سے تعلق رکھتے ہیں۔(برصغیر میں اسلام کے اولین نقوش:۱۶)

[۳] سیابجہ:

میداور جاٹ کے علاوہ ہندوستان کی قوم جو عرب میں آباد تھی؛ سیابجہ تھی، سیابجہ کے معنی سیاہ کمبل پہننے والے کے ہیں، یہ لوگ چوں کہ سردی، پانی اور سورج سے بچنے کے لئے سیاہ کمبل استعمال کرتے تھے، اس لئے ان کو سیابجہ کہا جانے لگا، یہ سندھ اور ہند کی ایک قوم ہیکل اور ڈیل ڈول والی قوم تھی۔(عرب و ہند عہد رسالت میں،ص:۸۰)

[۴] احامرہ:

قدیم زمانہ سے ہندوستان کی ایک اور جماعت عرب میں مقیم تھی جو حمراء،حمر اور احامرہ کے لقب سے یاد کی جاتی تھی۔علامہ سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ بودھیوں کا ایک تیسرا نام عربی کتابوں میں محمرہ ہے، یعنی سرخ کپڑے پہننے والے، مقصود شاید گیروا یا زعفرانی رنگ ہو، یہ رنگ ان کے مذہبی پیشواؤں کی پہچان تھی۔(عرب و ہند کے تعلقات،علامہ سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ،ص:۱۵۴)

[۵] اساورہ:

برصغیر کے جن لوگوں نے عرب میں جا کر سکونت اختیار کرلی تھی، ان میں ایک گروہ ''اساورہ'' کے نام سے موسوم تھا، قاضی اطہر مبارک پوری رحمۃ اللہ علیہ نے اساورہ کا تذکرہ کرتے ہوئے جو کچھ لکھا ہے، اس سے پتہ چلتا ہے کہ عرب میں جو غیر ملکی لوگ آباد تھے؛ ان میں اساورہ کی تعداد سب سے زیادہ تھی اور ان کی شان وشوکت اور غلبہ واقتدار کا یہ عالم تھا کہ عراق سے لے کر یمن تک کے پورے ساحلی عرب کی سیاست وحکومت پر ان کا

قبضہ تھا،شاہان ایران کے نام سے اس علاقہ پر یہی لوگ حکومت کرتے تھے،ان کو ایرانی شاہی فوج کی حیثیت حاصل تھی اور عرب وایران کے ایرانی مقبوضات کا اصل محافظ یہی طبقہ تھا، یہ اپنے آپ کو اس درجہ بلند و بالا سمجھتے تھے کہ زط ،سیابجہ اور احامرہ وغیرہ پرانی ہندی قوموں کی طرح عربوں سے میل جول نہیں رکھتے تھے؛ بلکہ ایرانی شہنشاہیت کے نمائندہ ہونے کی بناء پر حاکمانہ غرور کی زندگی بسر کرتے تھے،خلیفہ ثانی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے عہد میں ایرانی علاقے فتح ہوئے تو اساورہ کی گردن جھکی اور ان میں سے بہت سے لوگوں نے اسلام قبول کرلیا،عرب قبائل کے ساتھ مل کر رہنے لگے اور مسلمانوں کی معیت میں کافروں سے جنگ و جہاد میں شریک رہے۔(عرب و ہند عہد رسالت میں،ص:۹۱)

قاضی اطہر مبارک پوری رحمۃ اللہ علیہ کا خیال ہے کہ اساور یا اساورہ دونوں لفظ ''اسوار'' کی جمع ہیں ، اور ''اسوار'' سنسکرت کے دولفظوں سے مرکب ہے،''اشو'' اور ''وار'' سے، ''اشو'' کے معنی ہیں گھوڑا، اور''وار'' کے معنی ہیں بلند و بالا، یعنی گھڑ سوار! یہ لوگ ایرانی فوج میں چونکہ بہت اچھے گھڑ سوار، بہت اچھے نیزے باز، بڑے جنگ جو اور بہادر فوجی تھے اور شہسواری میں ان کا کوئی مقابلہ نہ کرسکتا تھا،اس لئے اساور یا اساورہ کہلائے۔

عراق کے شہروں میں سے ایک شہر کا نام ''ابلہ'' تھا اور یہ وہی شہر تھا؛ جہاں ۱۴ہجری کو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں بصرہ آباد ہوا، اس شہر میں اساورہ کثیر تعداد میں آباد تھے۔

اساورہ برصغیر کی وہ قوم تھی ،جس کو عرب میں عزت واحترام کی نظر سے دیکھا جاتا ہے اور یہ لوگ وہاں ٹھاٹھ سے رہتے تھے،فتوح البلدان ،لسان العرب ،تاریخ طبری ،کامل ابن اثیر، الاصابہ اور الاستیعاب وغیرہ کتابوں میں خاصی تفصیل کے ساتھ ان کا ذکر کیا گیا ہے، انہوں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں اسلام قبول کیا۔

یہ قدیم زمانہ سے ہندوستانی شہسوار تھے اوران کا تعلق ایرانی فوج سے تھا،صرف ابلّہ میں اسلام سے پہلے اساورہ کی کثرت کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ جب ۱۵ء میں عتبہ بن غزوان نے ادھر کا سفر کیا تو اس وقت پانچ سو اساورہ شہر ابلّہ کی حفاظت کرتے تھے۔(تاریخ طبری:۴/۱۵۰)

[٦] بیاسرہ:

برصغیر کی ایک جماعت ''بیاسرہ'' کے نام سے موسوم تھی، جو عرب میں موجود تھی، یہ جماعت سمندری قزاقوں اور ہندوستان کے گروہ مید کے حملوں سے عربوں کے جہازوں اور کشتیوں کی نگرانی وحفاظت کے فرائض سرانجام دیتی تھی۔

والبیاسرة قوم بالسند، وقیل: جیل من السند یواجرون انفسهم من اهل السفن لحرب عدوهم. (لسان العرب، ج:۴، ص:۵۸)

بیاسرہ: وہ علاقہ سندھ کی ایک قوم کو کہا جاتا تھا، ان کے بارے میں منقول ہے کہ یہ سندھ کا ایک ایسا گروہ ہے جو جہازوں کے مالکوں کے ساتھ اجرت پر رہتا تھا؛ تاکہ ان کے سمندری دشمنوں سے جنگ کرے۔

یہ لوگ بھی سیابچہ کی طرح عربوں کے جہازوں اور کشتیوں کی حفاظت کرتے تھے؛ تاکہ سمندروں کے لٹیروں؛ خاص کر ہندوستانی مید سے ان کو محفوظ رکھ سکیں۔(لسان العرب، ج:۴،ص:۵۸)

بعض کتابوں میں بتایا گیا ہے کہ یہ گروہ سندھ اور ہند دونوں علاقوں سے تعلق رکھتا تھا، جسے جہاز ران اور کشتی بان، دشمن سے لڑائی کے لئے اجرت پر اپنے پاس رکھتے تھے۔

تھانہ، بھروچ، چیمور اور اس نواح کے مختلف مقامات میں جو بحر ہند کے ساحل پر آباد ہیں، ہزاروں کی تعداد میں بیاسرہ سکونت پذیر تھے، عربوں سے ان کے اتنے تعلقات تھے کہ ان میں سے بہت سے لوگ اپنی بیٹیوں کی شادیاں عربوں سے کر دیتے تھے، اسلام کے بعد بیاسرہ میں متعدد چوٹی کے علماء ومحدثین پیدا ہوئے جنہوں نے اپنے اپنے دور میں شاندار علمی خدمات انجام دیں۔ (برصغیر میں اسلام کے اولین نقوش:۲۶،۲۷)

[۷] تکاکرہ، ٹھاکر:

یہ خالص ہندوستانی قوم ہے، جن کی بہادری اور جواں مردی عربوں میں مشہور ہے۔ (لسان العرب، ج:۲،ص:۹۲)

عرب اور گجرات کے تجارتی تعلقات

عرب وہند کے درمیان دیگر تعلقات کی بہ نسبت تجارتی تعلقات زیادہ قوی اور اہم تھے، ہندوستان سے ہر قسم کا عود، کافور، باخور، جوز بوا، صندل، قاقلہ، قرنفل، کبابہ، نارجیل، نباتاتی کپڑے، روئی کے مخملی کپڑے اور ہاتھی عرب جاتے تھے اور سراندیپ سے ہر قسم کے یاقوت، موتی، بلور، سنباوج وغیرہ، ان چیزوں کے علاوہ ہندی تلواریں، سندھی کپڑے، سندھی مرغی، ہلالہ اونٹ، (فالج) عود ہندی، نیزے، جوتے وغیرہ عرب جاتے تھے، ان کی تفصیلات ابن خرداذبہ نے اپنی کتاب المسالک والممالک میں دی ہے، ہندوستانی مال کی کھپت کے لئے عرب میں چار منڈیاں تھیں، ابلہ، صحار، عدن اور جار۔ (عرب وہند عہد رسالت میں، ص:۲۸،۳۰) مشرقی دنیا کی تجارتی مال کی منڈیاں یمن اور عدن تھے اور اندرون عرب تجارت کا اہم مرکز مکہ مکرمہ تھا، جس کا سب سے بڑا اسالانہ بازار عکاظ میں لگتا تھا، عرب کے بعض مقامات پر ہندوستان کی اشیاء اس قدر مشہور ہوگئی تھیں کہ انہیں مقاموں کے ناموں سے منسوب کر دیا گیا تھا، مثلاً خط (نیزے) سمہری (نیزے) دارین (مشک دارین)۔

ادبیات عربی میں ہندوستان کی اشیاء کا ذکر

بعض ہندوستانی اشیاء کا ذکر شعراء کے کلام میں ملتا ہے، مثلاً ہندی تلوار (سیف ہندی) سنہری، مہندی، ہندوانی قلعی، زہیر بن ابی سلمی کے ایک شعر میں مذکور ہے۔

(دوسری تلواروں کے درمیان ہندی تلوار تم کو میدان جنگ میں ناکام نہیں کرسکتی، جب کہ اسلحہ بند لشکروں میں جنگ ہو۔)

اس کے علاوہ عربی شاعری خطی وسمیری یعنی ہندی نیزے، مشک، عود، کافور، زنجبیل، قرنفل، ساج، قسط، داذی، سندھی مرغی، لنگی، چادر، کرتا اور شکر کا بھی ذکر ملتا ہے۔(وصف الھند و مایجاورھا من البلاد من کتاب نزھة المشتاق، ص:۲، اردو زبان وادب پر عربی اثرات:۱۶-۲۳)

ہندوستانی پیداوار اور بیوپار

عرب سوداگر ہندوستان کے جزیروں سے اپنے ملک کو کیا لے جاتے تھے؟ اس کا سرسری اندازہ اس بیان سے ہوگا جو ۱۴ھ میں ایک عرب سیاح نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے کہا تھا: ”ہندوستان کا دریا موتی، اس کا پہاڑ یاقوت اور اس کا درخت عطر ہے،“ اس سے معلوم ہوگا کہ چھٹی صدی عیسوی میں اہل عرب ہندوستان سے موتی جواہرات اور خوشبو کی چیزیں لے جاتے تھے۔ نویں صدی عیسوی میں ایک عرب سیاح اس کا سبب بیان کرتا ہے کہ سیراف کے جہاز بحر احمر ہوکر مصر کیوں نہیں جاتے اور جدہ سے لوٹ کر ہندوستان کیوں چلے جاتے ہیں؟ کہتا ہے ”اس لئے کہ وہ چین اور ہندوستان کے سمندر کی طرح جس کے پانی میں موتی اور عنبر ہوتا ہے اور جس کے پہاڑوں میں جواہرات اور سونے کی کانیں ہیں اور جس کے جانوروں کے منھ میں ہاتھی دانت ہیں اور جس کی پیداوار میں آبلوس، بید، عود، کافور، لونگ، جوز بوا، (جائے پھل) بکم، صندل اور ہر قسم کے خوشبو کی چیزیں ہوتی ہیں اور جس کے پرندوں میں طوطا اور مور ہیں اور جس کی زمین کا فضلہ مشک اور زباد (ایک جانور کا خوشبودار

پسینہ) ہے۔

ابن خرداذبہ (۲۵۰ھ) جو آٹھویں صدی عیسوی کے کچھ بعد تھا، وہ ہندوستان کی ان پیداواروں اور بیوپار کی جو عرب اور عراق جاتی تھیں، یہ فہرست دیتا ہے: خوشبو، لکڑیاں، صندل، کافور، لونگ، جوزبوا (جائے پھل)، کباب چینی، ناریل، سن کے کپڑے، روئی کے مخملی کپڑے، ہاتھی اور سراندیپ سے ہر قسم کے یاقوت، موتی، بلور اور سنباذج جس سے جواہرات درست کئے جاتے ہیں اور ملیبار سے سیاہ مرچ اور گجرات سے سیسہ اور دکھن سے بکم اور داذی اور سندھ سے کٹ (ایک ہوا) اور بانس اور بید۔ (کتاب المسالک والممالک ابن خرداذبہ، ص:۷۱)

مسعودی ۳۰۳ھ اور بشاری ۳۰۷ھ دونوں نے کھنبایت کے جوتوں کی تعریف کی ہے، جو یہاں سے بن کر باہر جاتے تھے۔ (مروج الذہب مسعودی:۱/۲۵۳) تھانہ (بمبئی) کے کپڑے مشہور تھے، وہ یہیں بنتے تھے یا اندر ملک سے آتے تھے، مگر اسی بندرگاہ سے باہر جاتے تھے، بہرحال ان کو تھانہ کے کپڑے کہتے تھے۔ (عرب و ہند کے تعلقات:۴۹-۵۰)

عرب تاجر اپنی بادبانی کشتیوں کے ذریعہ سمندر کے کنارے کنارے عمان، بحرین وغیرہ ہوتے ہوئے خلیج فارس کے ساحلوں سے گزر کر یا تو بلوچستان کی بندرگاہ تیز پر رک جاتے تھے یا پھر سندھ کی بندرگاہ دیبل چلے آیا کرتے تھے، اس کے علاوہ آگے بڑھتے ہوئے گجرات اور کاٹھیاواڑ کی بندرگاہ تھانہ اور کھنبایت تک چلے آتے تھے، کبھی کبھی اور آگے بڑھتے ہوئے کالی کٹ، مدراس پہنچ کر سراندیپ (لنکا) اور انڈمان ہوکر خلیج بنگال میں داخل ہوکر برما اور سیام ہوتے ہوئے چین تک جاتے تھے اور پھر اسی راستہ سے واپس وطن لوٹ جاتے تھے۔

اس پورے تجارتی سفر میں یہ عرب ہندوستان سے صندل، کافور، مونگ، جائفل،

کباب، چینی، ناریل، سَن (جوٹ) کے ریشوں سے تیار ہوا سامان، روئی کے مخملی کپڑے، ہاتھی دانت؛ سراندیپ (لنکا) سے یاقوت، موتی؛ مالابار سے سیاہ مرچ، الائچی وغیرہ لے جایا کرتے تھے۔ بعض شواہد سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ان اشیاء کے علاوہ نارنگی، لیمو، جاوتری، کیلے، دارچینی، ساگوان کی لکڑی، تلواریں، سونٹھ، چھالی، نیل، گینڈے کی کھال وغیرہ جیسی بے شمار چیزیں بھی ہندوستان سے یہ عرب تاجر لے جایا کرتے تھے، اس کے بدلہ میں ہندوستان کو یہ لوگ قیمتی پتھروں جیسے زمرد، مرجان وغیرہ کی انگوٹھیاں، شراب، رومی ریشمی کپڑا، مختلف قسم کی خوب صورت قیمتی کھالیں، گلاب کا عرق، کھجوریں، عربی گھوڑے فراہم کرتے تھے، بہت سے سفرناموں اور تاریخی کتب میں یہ تجارتی تفصیلات درج ہیں۔

گجرات اور دکن کے حالات میں اکثر عرب مؤرخین اور سیاحوں نے راجابلہرا (ولبھ رائی) کے بلند اخلاق کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ وہ اس وقت ہندوستان کا سب سے بڑا راجا تھا، جس کی حکومت گجرات، کاٹھیاواڑ، کچھ، کھنبایت اور کوکن تک پھیلی ہوئی تھی، عربوں سے بہت محبت کرتا تھا، اس کی رعایا تو یہاں تک عقیدہ رکھتی تھی کہ عربوں کی محبت ہی کی وجہ سے ہمارے راجاؤں کی عمریں لمبی ہوتی ہیں، دکن کے راجاؤں کے بارے میں بھی ایسے ہی خیالات کا اظہار کیا گیا ہے۔ مسعودی نے بھی ان راجاؤں کی تعریف کی ہے اور لکھا ہے کہ ان کے راج میں مسلمانوں نے بہت سی چھوٹی بڑی مسجدیں بنالیں ہیں، جو ہر طرح آباد ہیں، البتہ گجرات کے ''گوجر'' حکمران ضرور ان عربوں سے نہ صرف نفرت کرتے تھے؛ بلکہ ان کے شدید دشمن بھی تھے، ان مقامات کے علاوہ ایسے اور بھی بہت سارے چھوٹے چھوٹے علاقے تھے، جیسے کہ کھنبایت، کاوی، گندھار، بیرم، چنداپور، منگلور، کالیکٹ، پاکنور، جرپٹن، دہ پٹن، بدھ پٹن، کولم، مالدیپ، سیلون، وجیہ نگر وغیرہ جن کا ذکر ابن بطوطہ نے اپنے سفر میں کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ان تمام مقامات پر مسلمان تاجروں، مسلمان جہازرانوں اور مسلمان بزرگوں سے ملاقات کا موقع ملا، تقریباً ہر جگہ مسجدیں نظر آئیں، مسلمان بچوں کی تعلیم کے

انتظامات بھی نظر آئے، بلکہ بعض راجاؤں کی فوج میں بھی ہزاروں مسلمان سپاہی شامل نظر آئے۔

اسلامی عہد میں گجراتی بیڑے

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد سب سے پہلے جو جہاز تیار ہوا، وہ بحر عرب کے مقام بحرین میں ہوا، بحرین سمندر میں ہونے کے سبب سے جہاز سازی اور جہاز رانی دونوں کے لئے بہت موزون جگہ ہے، عربوں کا سب سے پہلا جہاز بحر عرب میں ۱۵ھ اور ۶۳۶ء میں بحرین سے روانہ ہوکر تھانہ پہنچا، دوسرا بھروچ اور تیسرا دیول، اس کے بعد تجارت کی ترقی کے ساتھ ساتھ جہاز رانی بھی بڑھتی گئی، اور پہلی صدی کے اختتام تک عربوں کے جہاز لنکا، جاوہ اور چین تک جانے لگے، چنانچہ انہی عربوں کے وہ جہاز تھے جن کو دیول کے پاس قزاقوں نے لوٹ لیا تھا اور لوٹ کا مال اور عورتوں کی واپسی کے انکار پر محمد بن قاسم نے سندھ پر حملہ کر کے اس کو فتح کرلیا، دوسری صدی ہجری کے آخر میں عربوں کی تجارت بحر عرب میں بہت ترقی کر گئی اور تمام بڑے بڑے گجراتی بندر عرب جہازوں سے بھر گئے۔

یوگ راج چاوڑہ کے عہد ۱۹۱ء ۸۰۶ھ میں شیم راج نے سومناتھ کے بندرگاہ پر عربوں کے جن جہازوں کو لوٹا تھا، ان میں دس ہزار گھوڑوں اور ہاتھیوں کے علاوہ لاکھوں روپیوں کا مال تھا۔ (رتن مالا، بیان خاندان چاوڑہ، ان گھوڑوں کی قیمت ستر لاکھ ۶۰ ہزار تھی، اس سے ہاتھی اور دوسرے مال کی قیمت کا اندازہ کیا جاسکتا ہے) اس سے اس وقت کی تجارتی ترقی کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

ساتویں صدی کے ختم ہوتے ہوتے عربوں کی بحری تجارت اس قدر بڑھ گئی اور اس کو اتنا فروغ ہوا کہ گجرات کا کوئی بندر ان کے مال تجارت سے محروم نہیں رہا، اس سے خود ملک کا راجہ اور اہل ملک بھی فائدہ اٹھاتے تھے، لیکن یہ عجیب بات ہے کہ اس سلسلہ میں خود گجراتی

بیڑوں کا ذکر کتابوں میں نہیں ملتا، شاید عربوں کی جہاز رانی اور عربی جہازوں کی کثرت نے اس کو بیکار کردیا ہو۔

سلیمان بصری، ابوالحسن زید سیرافی اور مسعودی کے سفرناموں سے پتہ چلتا ہے کہ یہاں کے راجہ عرب تاجروں کی بڑی قدر کرتے تھے، ان کے مال تجارت کی درآمد پر جو محصول لیا جاتا تھا، اس سے ان راجاؤں کی بڑی معقول آمدنی ہوتی تھی، ساتویں صدی کے آخر میں سولنکی اور باگھیلا خاندان نے جہازوں کی جانب توجہ کی اور انہوں نے عربوں کی مدد سے ایک بیڑا تیار کرلیا، چنانچہ ارجن باگھیلا کے بیڑے کا امیرالبحر ایک عرب تھا، خلجی اور تغلق خاندانوں کے عہد میں ان تجارتی جہازوں کی آمدورفت اس وجہ سے زیادہ بڑھ گئی کہ مسلمان عرب اور ایرانی بڑی تعداد میں راشٹ کٹ کے عہد سے تمام گجراتی بندرگاہوں میں آباد ہو گئے تھے۔

مسعودی نے لکھا ہے کہ چیمور میں عربوں اور ایرانیوں کے دس ہزار گھر ہیں، جو تقریباً سب کے سب تاجر ہیں یا تجارت سے وابستہ ہیں، یہی حال دوسری بندرگاہوں کھنبایت، بھروچ، سومناتھ، جوناگڑھ وغیرہ کا تھا، سدھ راج کے زمانہ میں پارسیوں کے بھرکانے سے ہندوؤں نے جو بلوہ کیا تھا، جس میں انہوں نے بہت سے عربوں کو قتل کیا تھا اور ان کی جامع مسجد گرادی تھی، اس سے عربوں کی وسیع آبادی کا پتہ چلتا ہے۔

خلجیوں اور تغلقوں کے عہد میں یہی عرب اور ایرانی نوآبادکار تاجر تھے، جن کے جہاز انفرادی یا مشترکہ طور پر چلتے تھے، ممکن ہے دوچار سرکاری جہاز بھی رہے ہوں، لیکن اب تک حکومت کے کسی تجارتی یا مسافروں کی جہاز یا جنگی بیڑے کا پتہ کتابوں سے نہیں چلتا، ابن بطوطہ کے سفرنامہ سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ تمام جہاز انہی نوآبادکار غیرملکی تاجروں کے تھے، بعض مقامی زمین داروں کے بھی اپنے جہاز تھے، لنکا اور مدراس کے سمندر میں اور مالابار کے

ساحل پر چینی جہازوں کی آمد کا ذکر ملتا ہے، بحری تجارت سے زیادہ تر بنئے فائدہ اٹھاتے تھے اور لاکھوں کماتے تھے؛ مگران میں سے کسی کے پاس جہاز نہیں تھا، البتہ گجرات وہاں وَٹو میں ایک بنئے کے پاس متعدد جہازوں کے ہونے کا ذکر ہے۔ (گجرات کی تمدنی تاریخ: ص:۲۷۶-۲۷۹)

پرتگیزیوں کے استیصال کے لئے گجراتی بیڑے کے ساتھ مصری (عربی) بیڑے کی شمولیت

۹۱۳ھ مطابق ۱۵۰۷ء میں سلطان محمود گجراتی کو معلوم ہوا کہ پرتگیزی بڑی تعداد میں آ گئے ہیں، اور ملک کے کسی ساحلی مقام پر قبضہ کر کے قلعہ بنانا چاہتے ہیں، اس نے فوراً امیر البحر ایاز کو ان سے جنگ کرنے کا حکم دیا، اور وہ دیو، دمن اور مہائم کے جنگی جہازوں کو لے کر ان کے مقابلہ کے لئے روانہ ہو گیا، اسی اثناء میں ملک اشرف قانصوغوری حاکم مصر نے بھی خاص ہدایات کے ساتھ امیر البحر امیر حسین کو ایک بیڑا دے کر پرتگیزوں کے استیصال کے لئے ہندوستان بھیجا، دونوں مل کر جیون بندر پر جہاں پرتگیز جمع ہو گئے تھے؛ پہنچ گئے، اور دونوں نے مل کر ایک ساتھ پرتگیزی جہازوں پر گولہ باری شروع کر دی، اور ایک بہت بڑے تجارتی جہاز کو تاک کر ایسا گولہ پھینکا کہ وہ دیکھتے دیکھتے ڈوب گیا، اس میں ایک کروڑ روپیہ کا مال تھا، اس کے علاوہ ان کے اور متعدد قسم کے جہاز غرق ہو گئے اور ان کو بڑی فاش شکست ہو گئی، ان کے دس ہزار آدمی قتل اور سات ہزار سے زیادہ گرفتار ہوئے، اور ادھر چھ سو گجراتی اور چار سو ترکی شہید ہوئے، پرتگیزوں جیسے عظیم الشان بیڑے کو شکست دینے سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ گجراتی بیڑا کس قدر بڑا، مضبوط اور طاقت ور رہا ہو گا۔

اسی بحری قوت کا ہی فیض تھا کہ سلطان محمود اول کے عہد میں تمام بحر عرب میں امن رہا اور تجارت کو بے حد ترقی ہوئی۔ (ظفر الوالہ ۳۷، لنڈن، مرآۃ سکندری، ص: ۱۱۷) اس کے جہازوں

میں دس ترکی جہاز بھی تھے، جن میں سے دو برشت اور تین غراب قسم کے اور باقی پانچ ہلکے قسم کے تھے۔

امن وامان کے لحاظ سے سلطان مظفر حلیم کا عہد ممتاز ہے، اس کے دور میں کوئی بحری جنگ نہیں ہوئی، پھر بھی پرتگیزوں سے ہر وقت چوکنا اوران کے مقابلہ ومدافعت کے لئے تیار رہتا تھا، اس کے عہد میں بڑے بڑے جہاز تیار ہوئے، ان میں وہ جہاز بھی شامل تھے، جن میں ایرانی سفیر کو واپس کیا گیا تھا، امیرالبحر ملک ایاز تھا، صرف بندرگاہ دیو سے ایک ہزار مسافر اور ایک سو سے زیادہ تجارتی جہازوں کی سالانہ آمدورفت ہوتی تھی، اور دو سو جنگی جہاز ہر وقت تیار رہتے تھے، ان میں سے غالباً ایک سو کھنبایت کی خلیج میں اور باقی دوسرے بندرگاہوں میں رہتے تھے، اس وقت گجرات کی ساحلی حد سندھ کی سرحد سے لے کر کوکن کی سرحد جیول بندر تک تھی۔ (گجرات کی تمدنی تاریخ: ص: ۲۸۰-۲۸۲)

پرتگیزیوں کے مقابلہ میں عثمانی ترکی سلاطین کا بحری بیڑہ گجرات میں

۹۴۵ھ ۱۵۳۸ء میں سلیمان بادشاہ ایک ترکی بیڑا لے کر پرتگیزوں سے جنگ کرنے آیا، لیکن جنگ ابھی ختم بھی نہیں ہوئی تھی کہ واپس چلا گیا؛ مگر تمام جنگی سامان چھوڑ گیا، جس میں توپیں بھی تھیں، اس سے گجراتی بیڑے کو بڑی تقویت ہوگئی، لیکن وزیر افضل خان کی حماقت سے جب خداوند خان اور دوسرے بہترین بحری افسر پرتگیزوں کے ہاتھ سے شہید ہوگئے تو اس بیڑے کو سخت نقصان پہنچ گیا، جس سے سلطان محمود بے حد متأثر ہوا، افضل خان کو وزارت سے معزول کر دیا اور حکم دیا کہ توپیں اور نئے جہاز تیار کئے جائیں، چنانچہ خداوند خان کے لڑکے رومی خان اور جہاں گیر خان کی نگرانی میں کام شروع ہوگیا، اور تھوڑی ہی مدت میں پانچ سو نئے جنگی جہاز تیار ہوگئے، یہ ان جہازوں پر مستزاد تھے جو دوسرے بندرگاہوں میں پہلے سے موجود تھے۔ (ظفر الوالہ، ج:۱،ص:۲۲۱)

مغلیہ عہد میں تاجروں کے پاس اپنے ذاتی جہاز بکثرت تھے، جو عرب، مصر، ایران، عراق، شام، افریقہ اور جزائر تک جاتے تھے اور تجارت کے ذریعہ ان سے بڑا نفع کماتے تھے، سورت اس وقت کی بحری تجارت کا بہت بڑا مرکز تھا، سورت کے ایک عبدالغفور نامی تاجر کے پاس اپنے ذاتی جہاز اتنے عمدہ تھے کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے پاس بھی نہیں تھے، مسافری جہاز بھی لوگوں کے پاس بہت تھے، جن کی عرب وایران میں بڑی آمدورفت تھی۔ (گجرات کی تمدنی تاریخ: ص: ۲۸۲-۲۸۴)

بحری نقشے

جہاز رانی کے لئے سب سے ضروری چیز بحری نقشے ہیں، جن کو جہاز ران اپنے ساتھ رکھتے تھے، جن سے سمندر کے متعلق بہت سی چیزیں معلوم ہوتی تھیں، وہ ان نقشوں کو اپنے ذاتی تجربات سے بھی مکمل کرتے، اس میں دریا، ساحل، جزیرے، طول البلد اور عرض البلد وغیرہ لکھا ہوتا، بشاری مقدسی نے چوتھی صدی کے وسط میں امیر خراسانی کے کتب خانہ میں کاغذ کا اسی قسم کا ایک نقشہ دیکھا تھا، پھر اس نے امیر ابوالقاسم بن انماطی کے پاس نیشاپور میں اسی قسم کا کپڑے کا نقشہ دیکھا، ابن ماجد مشہور امیر البحر جب واسکوڈی گاما پرتگالی کو ہندوستان لایا تھا، تو اس کے پاس بحر ہند کا پورا نقشہ موجود تھا، اس میں خطوط نصف النہار اور خطوط متوازی ترتیب کے ساتھ بہت متصل بنے ہوئے تھے، لیکن اس میں ہواؤں کے رخ کے نشانات نہ تھے، جو مربعے ان خطوط سے بنتے تھے وہ بہت چھوٹے ہوتے تھے، اس لئے ساحل کی جو راہ خطوط نصف النہار کو قطع کرنے والے خطوط شمال، جنوب، مشرق اور مغرب سے معلوم ہوتی تھی، وہ بہت صحیح تھی، اس نقشہ پر ہواؤں کے رخ کے نشانات کثرت سے نہ تھے، جیسا کہ پرتگالی نقشے پر ہوتے تھے، جو دوسروں کے لئے بنیاد کا کام دیتا تھا۔ (عربوں کی جہاز رانی، مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ)

اصطرلاب: ایک پیتل کا آلہ جس پر علم نجوم کے احکام کے بموجب نقوش اور خطوط

کھدے ہوتے تھے، اس سے آفتاب اورستاروں کے سالانہ ارتفاع کا حساب بخوبی معلوم ہوجاتا تھا، یہ اصطرلاب ہر جہازران کے پاس ضرورہوتا تھا، واسکوڈی گاما نے جب ابن ماجد امیر البحر کولکڑی کا ایک بڑا اصطرلاب اور دھات کے بنے ہوئے چند اصطرلاب دکھائے، جن سے آفتاب کی بلندی کا اندازہ ہوتا تھا تو اس نے قطعی حیرت کا اظہار نہیں کیا، اوراس نے بتایا کہ بحراحمر کے جہازراں آفتاب اور قطب کی بلندی کا اندازہ کرنے کے لئے پیتل کے آلات استعمال کرتے ہیں، اوراس سے وہ جہاز رانی میں بہت زیادہ کام لیتے ہیں، ان کی شکل مثلث اور مربع دائرہ کی ہوتی ہے، اس نے یہ بھی کہا کہ وہ خوداور کھنبایت (گجرات) اور ہندوستان کے تمام جہازران بعض جنوبی وشمالی ستاروں اور چند خاص ستاروں کی مدد سے جوآسمان میں مشرق سے مغرب تک پھیلے ہوئے ہیں، جہاز رانی کرتے ہیں، وہ لوگ آفتاب کی بلندی کا اندازہ اس قسم آلات سے نہیں کرتے، جس قسم کے واسکوڈی گاما نے اسے دکھائے تھے؛ بلکہ ایک دوسرے آلہ سے جسے ابن ماجد خود بھی استعمال کرتا تھا، یہ تین تختیوں کا بنا ہوا تھا اور اسے واسکوڈی گاما کو اس نے دکھایا بھی تھا۔

عرب جہازرانوں نے پہلی صدی ہجری (۶۰۰ء) میں بحری سفر میں سمت معلوم کرنے کے لئے قطب نما سے کام لیا، تیرہویں صدی میں رومیوں نے بھی اس کو استعمال کیا، اس سے پہلے ان کو اس کا علم نہ تھا، تحریری صورت میں عربوں میں سب سے پہلے ادریسی ۵۴۹ھ ۱۱۵۳ء نے اس کا ذکر کیا ہے، جس کا حوالہ ڈاکٹر موسیو لیبان نے اپنی کتاب تمدن عرب میں دیا ہے، ساتویں صدی کی ابتداء میں محمد عونی نے جوامع الحکایات میں نوواردا شیاء کے ذیل میں اس کا شمار کیا ہے، یہ ۶۲۸ھ میں سندھ سے کھنبایت (گجرات) آیا تھا۔

جہازوں کے نام

جس طرح آج کل جہازوں کے نام ہوتے ہیں، اسی طرح اگلے زمانہ میں بھی نام

ہوتے تھے، چنانچہ تغلق کے عہد میں ابن بطوطہ جن جہازوں میں مع مال واسباب خود سوار ہوا تھا، ان کے نام عکبری، جاگیر اور منورت تھے۔ (ابن بطوطہ،۱/۲۸۳) ۹۷۳ھ مطابق ۱۵۶۵ء میں الغ خان نے اپنا جو جہاز یمن اور مکہ وغیرہ بھیجا تھا، اس کا نام الغ خانی تھا، اسی پر مشہور عالم ابن افلح سوار تھے، اس جہاز کا مشہور ناخدا احسن علوان تھا، اسی میں فقیہ محمد زبیدی بھی تھے، افسوس ہے کہ یہ جہاز ڈوب گیا، ایک جہاز عیدروس نامی تھا، جو شحر وعمان سے دیو آتے ہوئے ڈوب گیا، اس میں بہت سے حسنی سادات تھے، ایک جہاز کا نام ''تیز رو'' رکھا گیا تھا، محمد آصفی مصنف ظفر الوالہ اسی جہاز پر مکہ مکرمہ سے سورت (گجرات) آیا تھا۔ (ظفر الوالہ ج:۲،ص:۵۸۰) ایک جہاز کا نام احمدی تھا، جو سورت سے عرب آتا جاتا تھا۔ (حقیقت السورت، ص:۷۷) مولوی رفیع الدین صاحب جس جہاز پر سوار ہوکر عرب گئے تھے، اس کا نام سفینۃ الرسول تھا۔ (سفر نامہ حرمین بحوالہ عربوں کی جہاز رانی، ص:۱۶۶)

گجرات میں عرب، ایران، افریقہ، لنکا وغیرہ کے جہاز آتے جاتے تھے، سلیمان مہری نے نویں صدی ہجری میں ایک کتاب لکھی ہے، اس میں ایک فہرست دی ہے، گجرات کے متعلق اس میں جو کچھ ہے، وہ یہاں نقل کیا جاتا ہے:

> یول (سندھ) سے دیو، دیو سے مسقط، کھنبایت سے عدن، دیو سے ملاگا، دیو سے چاٹ گام (بنگلہ)، زیلع (حبشہ) سے گجرات، دیو یا کھنبایت سے براہ راست گجرات، عدن سے گجرات، قشن سے گجرات، ظفار (یمن) سے گجرات، قلمات سے گجرات، دیو سے شقاص، دیو سے شحر اور عدن اور مہائم سے عرب۔ (قلادہ الشموس)

یہ وہ مقامات ہیں؛ جہاں سے بکثرت آمدورفت رہتی تھی، ورنہ کھنبایت، دیو، بھروچ، مہائم وغیرہ سے بصرہ، سیراف، قطیف، لنکا، مدراس، (معبر) کالی کٹ، بنگلہ، جاوا،

سماٹرا تک جہاز جاتے تھے، لیکن جاوا سماٹرا تک جانے والے جہاز زیادہ تر وہ ہوتے تھے جو چین جاتے تھے، اور میرا خیال ہے کہ یہ جہاز زیادہ تر غیر ملکی (عرب) ہوتے تھے، خاص گجراتی جہاز کے چین جانے کا پتہ مجھے تاریخوں سے نہیں چلا۔

بحری راستے اور مسافت

گجراتی جہاز منزل مقصود تک پہونچنے میں کن کن بندروں پر ٹھہرتے تھے اور کن کی کیا مسافت ہوتی تھی، اس کا پتہ چلنا مشکل ہے، تاہم سفرناموں سے جو کچھ معلوم ہوسکا؛ وہ ذیل میں پیش کیا جاتا ہے:

> بصرہ یا سیراف سے جہاز روانہ ہوتا، تو اس کی پہلی منزل جزیرہ خارَک ہوتا، جو ان دونوں مقامات سے پچاس فرسخ یا ڈیڑھ سو میل کے فاصلہ پر تھا، خارک سے اسّی فرسخ پر جزیرۂ لاوان اور یہاں سے سات سو فرسخ پر جزیرۂ ابرون، پھر اس سے سات فرسخ پر جزیرۂ خَیْن، پھر یہاں سے سات فرسخ پر جزیرۂ کیس (قیس) اور آٹھ فرسخ پر جزیرۂ ابن گاواں اور سات فرسخ پر جزیرۂ ہرمز تھا، یہاں سے سات دن کی مسافت پر مقام ثارا تھا، جو سندھ کا سرحدی علاقہ تھا، اس لئے جو جہاز سندھ کو ہو کر جانا چاہتا؛ پہلے سندھ کے مشہور بندر دیول جاتا، پھر وہاں سے گجرات کا رخ کرتا، لیکن جو جہاز براہ راست جانا چاہتا ہو وہ ہرمز سے چل کر پہلے کچھ کی بندرگاہ پر ٹھہرتا، پھر یہاں سے سومناتھ اور سومناتھ سے دیو، دیو سے کھنبایت یا (گھوگھا) اور پھر یہاں سے بھروچ جاتا اور بھروچ سے دمن یا (راندیر: سورت) اور وہاں سے مہائم، پھر تھانہ۔ (الـمـمـالك و

المسالك لابن خرداذبه ، ص : ٦١،٦٢)سومناتھ سے کھنبایت تین فرسخ ، یہاں سے بھروچ تیس فرسخ اورسوپارہ چھ فرسخ اورتھانہ پانچ فرسخ تھا،چیمور،ولبھی پور، کانجی اور دھارواڑ میں بھی جہاز ٹھہرتے تھے۔(البیرونی کا ہندوستان:۱۱۲)

درآمداتی اشیاء

ان جہازوں کے ذریعہ جو چیزیں غیر ملک سے درآمد ہوتی تھیں،ان کی صحیح فہرست بتانا مشکل ہے،لیکن مختلف کتابوں میں جو چیزیں معلوم ہوسکی ہیں،وہ حسب ذیل ہیں:

قدیم زمانہ میں مصراورعرب سے سونا ، روپا،پیتل،قلعی ،سیسہ، پارۂ سرمہ، کانچ ، پکھراج،مونگھ ،شراب، کپڑاوغیرہ آتا تھا،ایران سے غلام ،لونڈیاں ،سونا،موتی، کھجور،شراب اور کپڑاخرید کرتاجر لاتے تھے،افریقہ سے سونا لاکر بھروچ اتارتے ،مالابار اور لنکا سے مسالہ آتا تھا، کھنبایت میں سونا ، روپا، تانبا ، گھوڑا، سرمہ اور چمڑا لاتے تھے۔(گجرات سروسنگھر ہ،ص: ۲۵۱،۲۵۳)بہادر شاہ کے عہد ۹۳۷ھ مطابق ۱۵۳۰ء میں دیو میں گلاب، پستہ،مویز لاکراتارتے ، اسلحہ، ریشم کے کپڑے،گھوڑےاورقالین وغیرہ بھی۔

برآمداتی اشیاء

بحری راستہ سے جو چیزیں یہاں سے برآمد ہوتیں،ان کی مکمل فہرست تو دستیاب نہیں ہوئی،تاہم کچھ اشیاءمندرجۂ ذیل ہیں:

کھنبایت سے سونٹھ، کپاس ، گوکھل،خوشبودار اشیاء،شکر،تیل، لاکھ،

باریک کپڑا، آملہ، جوتا، ریشمی کپڑا، عرب، ایران اور افریقہ جاتے تھے، بھروچ سے تل، روئی، شکر، لاکھ، عمل اور دوسرے اعلی درجہ کے کپڑے عرب اور مصر جاتے تھے، پیتل، سنگھ، صندل اور دوسری قسم کی لکڑی ایران جاتی تھی، لاکھ بھی بہت زیادہ برآمد ہوتی تھی، کھنبایت سے اعلی درجے کے جوتے اور ہاتھی دانت جاتا تھا، تھانہ کے کپڑے مشہور تھے جن کو عرب بکثرت لے جاتے تھے، کھنبایت اور بھروچ سے ساگوان کی لکڑی بصرہ بھیجی جاتی تھی، تاجر فلسطین تک بندر، طوطا اور مور لے جاتے تھے، کاغذ اس ملک کا خاص تحفہ تھا جو عرب، شام، مصر تک جاتا اور لوگ اس کو بہت پسند کرتے تھے۔ (مقدمۂ مرآۃ احمدی) سولہویں صدی سے اٹھارہویں صدی تک ابریشم، زری، زربفت، مخمل، کمخواب، مشروع، تلوار، جمدھر، تیروکمان، مروارید، مرجان، گجرات سے باہر جاتے تھے، البتہ چاندی ایران اور روم سے آتی تھی۔ (چہار گلشن قلمی مصنفہ رائے چترمن منقولہ ۱۷۳ا ء) قاضی مرتضی حسن لکھتے ہیں: احمد آباد گجرات میں قلمدان، صندوقچہ، کمر بند، کم خواب، زربفت، مشروع، تافتہ، ٹاٹ بند، پارچہ زرتار اور مخمل بہت عمدہ درجہ کا بنتا تھا، اور تلوار، جمدھر، اور تیروکمان بھی اس جگہ کی مشہور تھی، میں نے خود اپنی آنکھ سے ان سب کو دیکھا ہے، واقعی بے نظیر ہیں۔ (حدیقۃ الاقالیم، اقلیم دوم) انہی ایام میں سرخیز (سرکھیج) سے بہ کثرت نیل باہر جاتی تھی، عرب کے

علاوہ یورپ میں بھی اس کی بہت مانگ تھی۔(ظفر الوالہ، ج:۱،ص: ۲۲۸)

سولہویں صدی کے آخر میں تمباکو کی کاشت گجرات میں بہت ہوتی تھی،۱۰۴۲ھ مطابق ۱۶۳۲ء میں سورت تمباکو جہازوں میں بھر کر جاتا تھا، چنانچہ ۱۶۲۰ء۱۰۳۰ھ میں مخہ (یمن) اوراراکان بھیجا گیا تھا۔(معاشی حالات ہند،ص:۱۱۶)

گجراتی جہاز رانوں کے نام

گجراتی جہاز رانوں کے ناموں کا شمار مشکل ہے، کیوں کہ سلطان احمد کے عہد حکومت سے مستقل طور پر سرکاری بیڑہ نظر آتا ہے، جس میں مسافری، تجارتی اور جنگی جہاز سب شامل ہیں، ان میں سے ہر جہاز پر متعدد افسر ہوتے تھے، سلطان مظفر ثانی کے عہد میں ایک ہزار مسافری اور ایک سو تجارتی جہازوں کی سالانہ آمدورفت تھی، اور دو سو جنگی جہاز مستقل طور پر بندر دیو میں رہتے تھے، اسی طرح بھروچ، راندیر، سوپارہ، چیمور، تھانہ، مہائم وغیرہ میں جہاز آتے جاتے رہتے تھے، ان جہازوں کے مالک زیادہ تر گجراتی تھے، ان میں کچھ تو اصلی تھے، اور بڑی تعداد ان عربوں اور ایرانیوں کی تھی، جو گجرات میں آکر بس گئے تھے، اب اگر ہر بندر کے شاہ بندر، امیر البحر، ناخدا، ربان (کپتان) اور معلم ہی کو لے لیا جائے تو کئی ہزار ہوں گے، ان میں سے چند جہاز رانوں کے نام جو آٹھویں، دسویں، بارہویں صدی کے ہیں؛ پیش کئے جاتے ہیں، کتابوں میں ان کے نام آجانے سے پتہ چلتا ہے کہ یہ سب اپنے وقت کے ماہر فن تھے، ان میں سے شاہ بندر اور امیر البحر کے کچھ نام اوپر آچکے ہیں اور کچھ نام اور دوسرے بعض افسروں کے نام یہ ہیں:

نویں صدی ہجری میں ناخدا اسماعیل نائتہ ایک مشہور شخص تھا، اس کی شہرت کے

باعث اس کو آخر میں شاہ بندر بنا دیا گیا تھا، آٹھویں صدی ہجری میں ابراہیم ناخدا بڑا نامور تھا، اس کے متعدد ذاتی جہاز تھے، اس کے بھائی کے پاس بھی کئی جہاز تھے، جو (گندھار) گجرات، بھروچ سے چین تک جاتے تھے، ۷۲۱ھ مطابق ۱۳۲۱ء میں معلم حسن تھا، جو ناندیر (راندیر متصل سورت) سے عرب جایا کرتا تھا۔

نویں صدی میں موسیٰ منڈل حبشی ناخدا تھا، یہ اپنے وقت کا بڑا ماہر فن تھا، اس کے جہاز بھی زیادہ تر عرب جاتے تھے، معلم حیواہ المہر ی بھی مشہور معلم تھا، ظفر الوالہ کے مصنف نے اس کا خاص طور سے نام لیا ہے، یہ دسویں صدی ہجری میں تھا اور گجرات سے عرب جانے والے جہازوں میں رہتا تھا، اسی صدی کا مشہور ناخدا محمد عیسی ہے، یہ بھی زیادہ تر عرب کے جہازوں سے تعلق رکھتا تھا، ۹۷۳ھ مطابق ۱۵۶۵ء میں حسن علوان مشہور ناخدا الغ خان کے جہاز پر تھا اور جہاز ڈوب جانے سے وفات پا گیا، تقریباً ۱۱۵۰ء میں شیخ ڈاکور مشہور معلم اور مصنف تھا، ۱۱۹۶ھ مطابق ۱۷۸۱ء کے قریب عنایت (عنایت اللہ) شیخ مذکور کا لڑکا بھی بہت بڑا معلم تھا، جزیرہ بمبئ میں رہتا تھا۔ (ڈاکور ایک مشہور قصبہ آنند گودھرہ لائن پر ہے۔)

کپتان ابن الماجد

یہ معلوم کر کے آپ کو تعجب ہوگا کہ دسویں صدی ہجری میں (سولہویں صدی عیسوی) پرتگالی جہاز جو یورپ کا سب سے پہلا جہاز تھا، اس کو ہندوستان لانے والا ایک گجراتی تھا، جس کا اصل وطن نجد (عرب) تھا۔ ابن ماجد نجدی (گجراتی) نے اس فن پر پچیس کتابیں لکھی تھیں، ان میں سے ایک کا نام ''قصیدۂ مکہ'' ہے، اس میں مکہ مکرمہ، جدہ، کالی کٹ، دیول، کوکن، گجرات اور ہرمز کے بحری حالات درج کئے ہیں، یہ ۸۹۵ھ ۱۴۷۹ء کی تصنیف ہے، اس کا نام ناخدا معلم احمد بن ماجد ہے، یہ بحر بربر سے لے کر بحر ہند، بحر عرب، بحر احمر اور

بحر فارس تک سب سے بڑا تجربہ کار جہاز ران اور جہاز رانی کے علوم اور آلات کا سب سے بڑا واقف کار تھا، یہی واسکوڈی گاما (پرتگیز) کو راستہ بتا کر ہندوستان لایا تھا، اس واقعہ کو عرب اور پرتگیزی دونوں تسلیم کرتے ہیں، چنانچہ گجرات کے مشہور عالم قطب الدین نہروالی (پٹنی) البرق الیمانی میں لکھتے ہیں:

''دسویں صدی کے شروع میں جو عظیم الشان واقعات پیش آئے، ان میں فرنگی اقوام میں سے پرتگالی قوم کا ہندوستان کے دربار میں پہنچنا ہے، اس میں سے ایک گروہ تنگنائے سبتہ (اسپین) سوار ہوتا تھا اور بحر ظلمات (اٹلانٹک) سے ہوکر ان جبال قمر کے پیچھے آجاتا تھا جو دریائے نیل کا منبع ہیں اور مشرق میں اس مقام پر پہنچ جاتا تھا جو ساحل کے قریب ایک تنگنائے میں ہے، جس کے ایک طرف پہاڑ اور دوسری طرف بحر ظلمات ہے، جس کی موجیں بہت شدید تھیں، وہاں جہاز ٹھہر نہیں سکتے تھے، بلکہ ٹوٹ جاتے تھے، کوئی بچتا نہیں تھا، وہ اسی طرح اس جگہ تباہ ہوتے رہے اور ان میں سے کوئی بچ کر بحر ہند واپس نہیں پہنچ سکا، یہاں تک کہ جہاز رانوں میں سے ایک ماہر جہاز ران نے جس کا نام احمد بن ماجد تھا، ان کی رہ نمائی کی، فرنگیوں کے افسر نے جس کو ہندی والمیر انتی یعنی امیر البحر کہتے تھے، اس کو اپنے ساتھ لیا، وہ نشہ کی حالت میں اس سے بہت بے تکلف ہوگیا، اور اسی نشہ کی حالت میں اس افسر کو راستہ بتا دیا، اور اس نے کہا: پہلے ساحل کے قریب نہ جاؤ، لیکن سمندر میں گھستے چلے

جاؤ اور پھر لوٹو، تب سمندر کی موجیں تمہیں نہ پائیں گی، جب اس نے اس پر عمل کیا تو ابن ماجد ہوش میں آ گیا، اس کے بعد پرتگالیوں کے بہت سے جہاز یکے بعد دیگرے بحر ہند میں پہونچنے لگے اور انہوں نے گوا میں اپنا بحری مرکز بنالیا۔''

واسکوڈی گاما

اس سے زیادہ واضح خود واسکوڈی گاما کے ہمراہیوں میں سے ایک بروس نامی نے لکھا ہے؛ وہ کہتا ہے:

جب واسکوڈی گاما مالندی میں تھا، تو کھنبایت واقع گجرات کے چند بنئے (تاجر) امیر البحر سے ملنے آئے، ان کے ساتھ گجرات کا ایک مورعرب مسلمان تھا جس کا نام مالی موکنا تھا، (معلم گنگا) یہ اسد البحرین ابن ماجد معلم کا ہندوستانی عرف تھا، یہ اس لطف کے خیال سے جو اس کو ہمارے آدمیوں کی صحبت میں ملتا تھا، نیز مالندی کے بادشاہ کو خوش کرنے کی غرض سے جو پرتگالیوں کے لئے ایک رہنما تلاش کر رہا تھا؛ ان کے ساتھ جانے کے لئے تیار ہو گیا تھا، واسکوڈی گاما نے اسے باتیں کیں تو اس کی بحری واقفیت پر اس کو بڑا اطمینان ہو گیا، اس مور نے واسکوڈی گاما کو ہندوستان کے پورے ساحل کا نقشہ دکھایا، جو قوم مور کے نقشوں کی طرح خطوط نصف النہار اور خطوط متوازی کی ترتیب کے ساتھ بہت مفصل طور پر بنا ہوا تھا، لیکن اس میں ہواؤں کے رخ کے نشانات نہ تھے، چوں کہ جو

مربعے ان خطوط نصف النہار وخطوط متوازی سے بنے تھے، وہ بہت چھوٹے تھے، اس لئے ساحل کی جو راہ ان خطوط سے معلوم ہوتی تھی وہ بہت صحیح تھی، البتہ اس پر ہواؤں کے رخ کے نشانات زیادہ نہ تھے، جیسا کہ ہمارے پرتگالی نقشوں میں ہوتے تھے، اور دوسروں کے لئے بنیاد کا کام دیتے تھے۔

واسکوڈی گاما نے اس مور (مسلمان عرب) کو لکڑی کا وہ اصطرلاب جو اس کے پاس تھا اور دھات کے اور چند اصطرلاب بھی دکھائے، جن سے آفتاب کی بلندی کا اندازہ کیا جاتا تھا، لیکن مور نے ان آلات کو دیکھ کر کسی حیرت کا اظہار نہیں کیا، اس نے بتایا کہ بحر عرب کے جہاز ران آفتاب اور قطب ستارہ کی بلندی کا اندازہ کرنے کے لئے؛ جس سے وہ جہاز رانی میں کام لیتے ہیں، پیتل کے آلات استعمال کرتے ہیں، جن کی شکل مثلث اور ربع دائرہ کی ہوتی ہے، اس نے یہ بھی بتایا کہ وہ خود کھنبایت (گجرات) اور ہندوستان کے تمام دوسرے جہاز ران جنوبی وشمالی اور بعض دوسرے ستاروں کی مدد سے جو آسمان پر مشرق سے مغرب تک پھیلے ہوتے ہیں، جہاز رانی کرتے ہیں، وہ لوگ آفتاب کی بلندی کا اندازہ اس قسم کے آلات سے نہیں کرتے تھے، جو واسکوڈی گاما نے اسے دکھائے تھے؛ بلکہ ایک دوسرے آلہ سے کرتے تھے، جو خود اس کے پاس بھی تھا اور وہ اسے استعمال بھی کرتا تھا، واسکوڈی گاما کو دکھانے کے لئے وہی آلہ فوراً لایا، یہ آلہ تین تختیوں کا بنا ہوا تھا۔

غرض اس گفتگو کے بعد جو ان لوگوں نے جہاز رانوں سے کی، واسکوڈی گاما کو احساس

ہوا کہ اس نے ایک بڑا خزانہ پا لیا اور یہ خیال کر کے کہ کہیں وہ اس کے ہاتھ سے نکل نہ جائے، جس قدر ممکن ہوسکا، لنگر اٹھا دیا اور جہاز روانہ ہوگیا اور ۲۴ / اپریل ۱۴۹۸ء مطابق ۹۰۴ھ کو کالی کٹ پہنچ گیا۔ (انسائیکلوپیڈیا آف اسلام مقالہ شہاب الدین بحوالہ عربوں کی جہاز رانی، ص: ۱۳۴، گجرات کی تمدنی تاریخ: ۳۰۵-۳۲۲)

گجرات سے برآمد ہونے والی اشیاء

بحری راستہ سے جو چیزیں گجرات سے برآمد کی جاتی تھیں، ان کی مکمل فہرست تو دستیاب نہیں ہوئی تاہم کچھ اشیاء مندرجۂ ذیل ہیں:

کھنبایت سے سونٹھ، کپاس، گوکھل، خوشبودار اشیاء، شکر، تیل، باریک کپڑا، لاکھ، آملہ، جوٹا، ریشمی کپڑا وغیرہ اشیاء ایران اور افریقہ جاتی تھیں۔

بھروچ سے تل، روئی، شکر، لاکھ، ململ اور دوسرے اعلی درجہ کے کپڑے عرب اور مصر جاتے تھے، نیز کھنبایت اور بھروچ سے ساگوان کی لکڑی بصرہ بھیجی جاتی تھی۔

تھانہ کے کپڑے بہت مشہور تھے، جسے عرب بکثرت لے جاتے تھے، اسی طرح کاغذ بھی گجرات کا بہترین تحفہ تھا، جو عرب، شام اور مصر لے جاتے تھے۔ (گجرات کی تمدنی تاریخ، ص: ۳۱۴)

کپڑوں کی تجارت

کپڑوں کی تجارت بھی عربوں کا محبوب مشغلہ تھا، یمن کپڑوں کی تجارت کا مرکز تھا، خود یمن کا کپڑا بہت مشہور تھا، چنانچہ اس زمانہ میں یمنی چادریں بہت مشہور تھیں اور یمن میں کپڑوں کے کارخانے بھی تھے؛ لیکن کپڑوں کے بعض نام ہندی الاصل ہونے کی وجہ سے گمان ہوتا ہے کہ ہندوستان سے بھی کپڑے جاتے تھے، ان میں ململ، چھینٹ اور رومال

خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں، جن کو عربی میں قرفس (کرباس یعنی روئی)، شیت (چھیٹ) اور فوطہ (تولیہ) کہتے ہیں، مصر کی ممی میں بعض کپڑے ہندوستان کے بنے ہوئے دریافت ہوئے ہیں، خود بھروچ میں بھی ایک صدی قبل مسیح تک اچھے کپڑے بنے جاتے تھے، پہلی صدی عیسوی میں مشہور مؤرخ ''پلینی رومی'' ایک مقام پر شکایۃً لکھتا ہے کہ روم کے ۲۰ ر لاکھ پاونڈ سالانہ ہندوستانی سامان کے عوض چلے جاتے تھے۔ (تاریخ گجرات، ص:۱۸۶)

تھانہ کے کپڑے مشہور تھے، جو یا تو تھانہ ہی میں بنے جاتے تھے یا اندرون ملک کسی جگہ سے آتے تھے؛ مگر اسی بندرگاہ سے باہر جاتے تھے؛ بہر حال ان کو تھانہ ہی کے کپڑے کہتے تھے۔ (عرب و ہند کے تعلقات، ص:۶۵)

کھنبایت کے جوتے تو اس قدر عمدہ ہوتے تھے کہ بڑے بڑے علماء اور محدثین اسے استعمال کرنے میں اپنی ثقاہت محسوس کرتے تھے، کیوں کہ یہ جوتے اپنی عمدگی کی وجہ سے بڑے دولت مندوں اور بادشاہوں کی پسند ہوا کرتے تھے۔

''پٹن'' کے بارے میں ابن بطوطہ نے لکھا ہے کہ پٹن کے راجہ کو بل کی عمل داری میں سمندر کے کنارے ایک بڑا شہر ہے، یہاں ناریل، سیاہ مرچ، چھالیہ، پان اور اروی بکثرت ہوتے ہیں۔ (عرب و ہند کے تعلقات:۳۹۴)

ساج (ساگوان): ساج کی لکڑی ہندوستان کی بڑی مضبوط اور عمدہ لکڑی ہے، تاریخ کی کتابوں سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ لکڑی بھروچ اور کولم پلی (کوکن) سے بیرونی ممالک کو جایا کرتی تھی، قدیم زمانہ میں عرب اس لکڑی کے دروازے، ستون اور چھت وغیرہ بناتے تھے، احادیث میں بھی اس لکڑی کا ذکر ملتا ہے، چنانچہ حدیث شریف میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے اسعد بن زرارہ نے جو تخت بھیجا تھا، اس کے پائے ساگوان کے تھے۔

"........فبعث الی رسول اللّٰہ صلی الله علیه و سلم بسریر لہ عمود و قوائمہ ساج" (عرب و ہند عہد رسالت میں، ص:۱۷۶، بحوالہ انساب الاشراف:۱/۵۲۵)

''اسعد بن زرارہ رضی اللہ عنہ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے پایہ دار تخت بھیجا تھا، جس کے پایے ساگوان کے تھے۔

طریحی نے ''مجمع البحرین'' میں لکھا ہے:

"فی الحدیث :یصلی علی السریر من ساج. قال فی المغرب : الساج شجر عظیم جدا و لا ینبت الا ببلاد الھند." (الادب المفرد: باب النساء)

حدیث شریف میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ساگوان کے تخت پر نماز پڑھا کرتے تھے،...... ''مغرب'' میں لکھا ہے کہ ساگوان بہت بڑا درخت ہوتا ہے جو صرف ہندوستان میں پایا جاتا ہے۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے حجرۂ مبارکہ کا کواڑ ساگوان کی لکڑی کا تھا، ''الادب المفرد'' میں امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے محمد بن ابوفدیک سے روایت بیان کی ہے، جس میں محمد بن ہلال نے حجرہ کے کواڑ کا حال بیان کیا ہے:

''..... کان بابا واحدا ، قلت : من ای شئی کان ؟ قال: من عرعر الساج. (عرب و ہند عہد رسالت میں بحوالہ مجمع البحرین، مادہ: ساج)

ایک ہی کواڑ تھا، میں نے پوچھا: کس چیز کا تھا؟ انہوں نے بتایا کہ ساگوان کی لکڑی کا تھا۔

نیز ے: عرب جانے والی اشیاء کی فہرست شمار کراتے ہوئے قاضی اطہر مبارک پوری

رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے:

''بروص (بھروچ) سے بھروچی نیزے، ان کے بانس اور کھنبایت اور سندان سے ناریل، اسی طرح تھانہ سے عمدہ کپڑا اور دیگر مختلف مقامات سے مختلف چیزیں عرب جایا کرتی تھیں۔ (عرب و ہند عہد رسالت میں، ص: ۲۹)

ہندی تلواروں کی طرح نیزے بھی عرب میں زیادہ مشہور تھے، اگرچہ یہ نیزے ''عمان'' سے لے کر ''بحرین'' تک کے علاقہ میں تیار کئے جاتے تھے، لیکن چونکہ ان کی بناوٹ میں جو بانس استعمال ہوتا تھا، وہ گجرات، سندھ اور بھروچ سے جایا کرتا تھا اور خالص اسی لکڑی سے نیزے بنائے جاتے تھے۔ اس کے بارے میں ''لسان العرب'' میں ہے:
"وقد کثر مجیئھا فی اشعارھا." "عرب میں اس کا ذکر بہت کثرت سے آیا ہے۔

مشہور شاعر فضل بن عبد الصمد نے کہا ہے:

انعت قوسا ذی انتقاء　　جاء بھا جالب بروصاء

میں نے اس صاف ستھری کمان کی تعریف کی ہے، جسے بھروچ سے منگانے والے نے منگایا ہے۔

من شفق اخضر بروا صیات　　صفر الحاء والخلوقیات

زرد، سبز بھروچی بانس، جن کے چھلکے بھی زرد ہیں۔ (عرب و ہند عہد رسالت میں، ص: ۴۴)

امام لغت جوہری کا قول ہے کہ ''خط'' یمامہ میں ایک مقام کا نام ہے، جس کی طرف خطی نیزے منسوب ہیں، اصل میں یہ نیزے بلاد ہند سے آتے تھے، لیکن چونکہ مقام ''خط'' میں لاکر اسے درست کیا جاتا تھا، اس لئے ان کا نام ''خطی'' مشہور ہو گیا، احادیث میں بھی اس کا ذکر ملتا ہے؛ چنانچہ ام زرع کی حدیث میں ہے:

"اخذ خطیا واراح علی نعما ثریا" وہ خطی نیزہ لے کر نکلا اور مجھ پر اچھی سے نعمتوں کی بارش کر دی۔

خلاصۂ کلام: یہ وہ چند اقتباسات ہیں، جو سیاحوں کے بیانات اور قدیم کتب تاریخ ہند سے معلوم ہو سکے ہیں، اگرچہ ان میں سے بہت ساری باتیں جو ذکر کی گئیں، مثلاً گجرات کی قدیم بندرگاہیں اور گجرات سے برآمد ہونے والی اشیاء وغیرہ تو وہ بعد مسیح سے تعلق رکھتی ہیں؛ لیکن کچھ قرائن ایسے ہیں جو قوم سبا اور اہل گجرات کے درمیان تجارتی تعلقات ہونے پر دلالت کرتے ہیں، جیسا کہ اس سلسلہ میں بعض صراحتیں گذر چکی ہیں، اس پس منظر میں ذیل میں چند مؤرخین کے اقوال تحریر کئے جا رہے ہیں، جن سے یہ بات مزید واضح ہو جائے گی۔

قاضی اطہر مبارک پوری رحمۃ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں کہ آمد و رفت کی سب سے پہلی اور مرکزی جگہ گجرات کی بندرگاہیں تھیں۔

مال تجارت ہندوستان کے مغربی سواحل سے جاتا تھا اور عرب کے مغربی سواحل پر اترتا تھا۔

قدیم زمانہ میں دخول گجرات کے لئے سات بندرگاہیں تھیں، ان میں سے کھنبایت کی بندرگاہ سے عرب تجار آتے تھے؛ چنانچہ پروفیسر ابوظفر ندوی رحمۃ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں:

''کھنبایت پہلی صدی عیسوی میں ترقی کے اعتبار سے بہت عروج پر تھا اور تجارتی منڈی کی حیثیت سے ابھر رہا تھا۔''

گجرات کے شمال میں ''دوارکا'' ۲۰۰ رق م سے بحری مرکز تھا اور جنوب گجرات میں ''رورکھ'' (بھروچ) ۹۵۰ قبل مسیح سے بحری مرکز تھا۔

عرب اور گجرات کے درمیان صرف بحر عرب کا حائل ہونا اور دونوں کی بندرگاہوں کی تجارتی منڈیاں ہونا، مزید یہ کہ قبل مسیح سے گجرات کے بحری مرکز بھروچ وغیرہ پر آریہ اور

عرب کے حضر موت اور یمن وغیرہ پر قوم سبا جیسی مہذب اور تاجر قوموں کا سکونت اختیار کرنا۔

تاریخ گجرات کے مصنف نے ''بدھ متی'' کے حوالہ سے مؤرخ 'جوزیفس' کا قول کرتے ہوئے لکھا ہے: ''سلیمان رحمۃ اللہ علیہ کے عہد میں ہاتھی دانت، بندر، مور وغیرہ گجرات کے سواحل ''سوپارہ'' اور ''رورکھ'' (متصل بھروچ) سے فلسطین جایا کرتے تھے۔

۲۵۰ قبل مسیح میں ''سوپارہ'' ہندوستان کے پر رونق شہروں میں شمار ہوتا تھا۔

نوٹ: فی الحال سوپارہ اگرچہ گجرات میں داخل نہیں، لیکن ۱۹۵۰ سے قبل چونکہ گجرات مہاراشٹر ہی میں شامل تھا، اس لئے سوپارہ کا بھی ذکر کردیا گیا ہے۔

''ہویت'' نامی مؤرخ نے مصر کی قبروں سے برآمد آثار سے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ ہند کے مغربی ساحل یعنی گجرات کی تجارتی جد وجہد ۳۰۰ سال قبل مسیح سے بھی پرانی ہے۔
(گجرات کا سانسکرتک اتہاس، ص: ۱۰۴۵)

ہندوستان کا سمندری دروازہ قدیم زمانہ میں ''گجرات'' ہی تھا۔

سولنکی راجاؤں کے زمانہ تک گجرات کی بندرگاہوں میں بھروچ خاص تھا؛ بلکہ ''پٹن کی بوہرہ قوم'' نامی کتاب کے مصنف نے تو یہاں تک لکھا ہے کہ عیسوی سن کے شروع تک تقریبا تمام ہندوستان کی بین الاقوامی تجارت بھروچ کی بندرگاہ ہی سے ہوتی تھی۔ (پٹن کی بوہرہ قوم، ص: ۲۸)

گجرات ہی کو عرب لوگ ''ہند'' کہتے تھے، جب کہ ''سندھ'' کو سند کہتے تھے۔
(گجرات کا سانسکرتک اتہاس، ص: ۱۰۵۲)

حضرت سلیمان علیہ السلام نے تقریباً ۹۶۰ قبل مسیح میں قوم اِرم کے تعاون سے عربوں کے لئے ہندوستان سے تجارت کرنے کے لئے کشتیاں تیار کرائی تھیں۔ (دنیا کی مختصر تاریخ: ۷۹)

حضرت سلیمان علیہ السلام کی کشتیاں (بیت المقدس کی تعمیر کے وقت تابوت،

شہادت قبلہ اور ہیکل مسجد کے لئے سونا، چاندی، ہاتھی دانت، مور وغیرہ جیسی قیمتی اشیاء لانے کی غرض سے) ہمیشہ دریائے ہند میں سفر کرتی رہتی تھیں۔ (احیاء علوم الدین، ج:۱،ص:۲۲۶)

مشہور یونانی مؤرخین ''آ گاتھر شیدس'' اور ''جوزیفس'' کے مذکورہ اقوال میں ان مؤرخین نے ''الہند'' کا لفظ استعمال کیا ہے، اگر مذکورہ بات کو سامنے رکھتے ہوئے اس سے بھی سواحل گجرات ہی مراد لیا جائے تو بعید از قیاس نہیں۔ (علماء گجرات کی خدمات حدیث:ص: ۴۲-۴۷)

عرب و گجرات کے دعوتی وسیاسی تعلقات
غزوۃ الہند سے متعلق احادیث

مسلمان آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات مبارکہ ہی میں ایک طرف بحرین کے اس علاقہ پر قابض ہو چکے تھے، جس سے ہندوستان اور چین کا قدیم زمانہ سے تجارتی تعلق چلا آ رہا تھا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت باسعادت سے پہلے ہی بہت سارے ہندوستانی عرب کے جنوبی اور مشرقی سواحل پر جمع ہو گئے تھے، تو دوسری طرف "خیر الناس قرنی، لا تسبوا اصحابی" اور "اللّٰہ اللّٰہ فی اصحابی، اصحابی امنة لامتی" کا تمغہ رکھنے والے اور رب العزت کی جانب سے ''رضی اللّٰہ عنھم و رضوا عنہ'' کا پروانہ حاصل کرنے والے درس گاہ نبوی سے فیض یافتہ صحابۂ کرام کے پاکیزہ گروہ کی نظریں ان احادیث پر تھیں، جن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہندوستان میں فاتحانہ پرچم لہرانے والوں کے لئے جنت کی بشارت سنائی تھی۔

امام نسائی رحمۃ اللہ علیہ نے ان احادیث کے لئے اپنی سنن میں ''باب غزوۃ الھند'' کا مستقل عنوان قائم کیا ہے اور طبرانی نے معجم میں حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ سے مروی روایت کی سند کو جید بتایا ہے:

عن ثوبان مولی رسول اللّٰہ ﷺ قال؛ قال رسول اللّٰہ ﷺ : عصابتان من امتی احرزھما اللّٰہ من النار، عصابة تغزو الھند ، وعصابة تکون مع عیسی ابن مریم علیھما السلام.

(سنن نسائی: کتاب الجھاد ، باب غزوۃ الھند، رقم الحدیث : ٣١٧٢،ج: ٦،ص:٤٣)

حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے آزاد کردہ غلام) سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میری امت کے دو گروہوں کو اللہ تعالیٰ نے جہنم کی آگ سے محفوظ رکھا ہے، ایک وہ گروہ جو ہندوستان میں جہاد کرے گا اور دوسرا وہ گروہ جو حضرت عیسیٰ بن مریم علیہما السلام کا ساتھ دے گا۔

غزوۃ الہند کی بشارت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم پر حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے ہندوستان کے جہاد میں شرکت کی آرزو ظاہر کی تھی اور جان و مال قربان کرنے کی پیش کش بھی کی تھی، چنانچہ مسند احمد اور سنن نسائی میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

عن ابی ھریرۃ قال : وعدنا رسول اللّٰہ ﷺ غزوۃ الھند ؛ فان ادرکتھا انفق فیھا نفسی ومالی ، فان اقتل کنت افضل الشھداء، فان ارجع فانا ابوھریرۃ المحرر. (سنن نسائی: کتاب الجھاد ، باب غزوۃ الھند، رقم الحدیث : ٣١٧٠،٣١٧١،ج: ٦،ص:٤٢،٤٣،ط:دارالفکر بیروت)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم سے غزوۃ الہند کا وعدہ فرمایا ہے، اگر میں اس میں شریک ہو سکا تو اپنا جان و مال اس میں قربان کردوں گا، اگر مارا گیا تو بہترین شہید بنوں گا اور اگر زندہ واپس

ہوا تو میں نار جہنم سے آزاد ابو ہریرہ بن جاؤں گا۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی طرح دیگر صحابۂ کرام کے قلوب میں بھی اس بشارت کو حاصل کرنے کی تمنا تھی کہ وہ غزوۃ الہند میں شریک ہو کر آخرت کی لامحدود زندگی کی کامیابی حاصل کرلیں؛ لیکن خلیفہ اول حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے زمانۂ خلافت میں داخلی فتنوں، مرتدین کی سازشوں اور نبوت کے جھوٹے دعوے داروں کی ریشہ دوانیوں نے غزوۃ الہند کی طرف متوجہ ہونے کا موقع نہیں دیا۔

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی وفات کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ خلافت پر فائز ہوئے، یہ وہ زمانہ تھا کہ اندرونی فتنے دب چکے تھے اور دین محفوظ ہو چکا تھا، چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ بیرونی ممالک کی طرف متوجہ ہوئے، اللہ تعالیٰ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانۂ خلافت میں فتوحات کا دروازہ کھول دیا؛ چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے خلافت پر فائز ہوتے ہی علاء حضرمی رضی اللہ عنہ کی جگہ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کو بحرین کا والی بنا دیا، ایک روایت میں ہے کہ حضرت علاء رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں ہی حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو یہ عہدہ دے کر ان کے ذمہ قضاء اور نماز کی امامت کے ساتھ ساتھ زکوٰۃ وخراج کی وصولی بھی کر دی گئی تھی۔

بحرین کی مرکزیت اور وہاں ہندوستانیوں کی کثرت اور ہندوستان سے تجارتی جہازوں کی آمد و رفت دیکھ کر ہوسکتا ہے کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بشارت یاد آ گئی ہو، لیکن حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی یہ تمنا دل میں ہی تھی کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ۱۵ ہجری میں ان کی جگہ حضرت عثمان بن ابو العاص ثقفی رضی اللہ عنہ کو بحرین کا حاکم مقرر فرما دیا، جنہوں نے ہندوستان پر فدائیان اسلام کے ذریعہ تین طرف سے فوج کشی کی۔

مجاہدین اسلام کے جہادی اسفار

پہلا سفر: حضرت عثمان بن ابوالعاص رضی اللہ عنہ کے تین بھائی تھے، (۱) حکم بن ابی العاص رضی اللہ عنہ (۲) مغیرہ بن ابوالعاص رضی اللہ عنہ اور (۳) حفص بن ابوالعاص رضی اللہ عنہ، حضرت عثمان بن ابوالعاص رضی اللہ عنہ کو آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے طائف کا حاکم مقرر کیا تھا، اس وقت سے خلافت صدیقی اور خلافت فاروقی کی ابتداء تک آپ طائف کے حاکم رہے؛ مگر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ۱۵ھ ہجری میں ان کو طائف کے بجائے بحرین اور عمان کا حاکم بنادیا، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے بحرین وعمان کی تولیت کے ابتدائی دور ہی میں اپنے بھائی حکم کو طائف سے بلاکر بحرین بھیج دیا اور خود عمان پہنچ کر جاں نثاران اسلام کی فوج تیار کی اور اپنے بھائی حکم کو اس فوج کا قائد بناکر ہندوستان روانہ کیا، اس مہم میں حکم بن ابوالعاص رضی اللہ عنہ نے اپنی فوج کو لے کر تھانہ (بمبئی) اور بھروچ (گجرات) دونوں ساحلی مقامات پر حملہ کیا اور فتح یاب ہوئے، اس حملہ کے وقت تھانہ میں وکبھی راجاؤں میں سے ''دھروسین دوم'' تخت نشین تھا اور بھروچ میں ''گوجروں'' کا راج تھا؛ مگر دکنی چالوکیہ ان تمام کے سردار سمجھے جاتے تھے، نیز حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اپنے دوسرے بھائی مغیرہ رضی اللہ عنہ کو ایک فوج دے کر دیبل (ٹھٹھ، سندھ) بھیجا، یہاں بھی اسلامی فوج فتح ونصرت سے ہم کنار ہوئی اور مظفر ومنصور واپس لوٹی۔

جب اسلامی لشکر کی ہندوستان سے واپسی ہوئی تو حضرت عثمان ثقفی رضی اللہ عنہ نے امیر المؤمنین حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اس کی پوری تفصیل لکھی، چوں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اس فوج کشی سے بے خبر تھے اور اس سے پہلے اسلامی فوج بحری راستہ سے ادھر نہیں آئی تھی؛ اس لئے آپ نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے اس اقدام کو ناپسند فرمایا اور تہدید آمیز

خط لکھ کر کہا کہ اگر اس خطرناک اور غیر منظّم مہم میں مسلمانوں کا جانی نقصان ہوا تو تمہارے قبیلے سے ایک ایک کا بدلہ لوں گا، الغرض وصال نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے چار سال بعد صحابۂ کرام اسلام کی دولت لے کر تھانہ اور بھروچ تشریف لائے اور اس سرزمین نے ان کا استقبال کیا، ان مہمات کا تذکرہ مشہور مؤرخ بلاذری نے ''فتوح البلدان'' کے باب ''فتوح السند'' میں یوں کیا ہے:

ولی عمر بن الخطاب رضی اللّٰہ عنه عثمان بن ابی العاص الثقفی رضی اللّٰہ عنه البحرین وعمان سنة خمس عشرة فوجه اخاه الحکم الی البحرین ومضی الی عمان، فاقطع جیشا الی تانه، فلما رجع الجیش، کتب الی عمر رضی اللّٰہ عنه علمه ذلك، فکتب الیه عمر: یا اخا ثقیف! حملت دودا علی عود، وانی احلف باللّٰہ ان لو اصیبوا لأخذت من قومك مثلهم، ووجه الحکم ایضا الی بروص، ووجه اخاه المغیرة بن ابی العاص الی خور الدبیل فلقی العدو وظفر. (فتوح البلدان،۴۲۰)

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ۱۵ ہجری میں عثمان بن ابو العاص ثقفی رضی اللہ عنہ کو بحرین اور عمان کا حاکم بنایا، عثمان رضی اللہ عنہ نے اپنے بھائی حکم کو بحرین روانہ کیا اور خود عمان پہنچ کر تھانہ کی طرف ایک مہم روانہ کی اور جب لشکر واپس ہوا؛ تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو خط لکھ کر اس کی اطلاع دی، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان کو لکھا: اے ثقفی بھائی! تو نے گویا کیڑے کو لکڑی پر سوار کر کے سمندر کے

حوالے کر دیا ہے، خدا کی قسم! اگر مسلمانوں پر کوئی مصیبت آئی تو
تمہاری قوم سے اس کا بدلہ لوں گا، نیز عثمان رضی اللہ عنہ نے اپنے
بھائی حضرت حکم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو بھروچ روانہ کیا اور دوسرے
بھائی مغیرہ رضی اللہ عنہ کو دیبل کی کھاڑی کی طرف روانہ کیا، جہاں
انہوں نے دشمن سے مقابلہ کر کے فتح پائی۔

بلاذری کے علاوہ حموی اور دوسرے مؤرخوں نے حکم رضی اللہ عنہ کے اس حملہ کا تذکرہ اپنی تاریخوں میں نہیں کیا ہے، شاید اس کی وجہ یہ ہوسکتی ہے کہ یہ ایک غیر منظّم جھڑپ تھی، کوئی مستقل فوج کشی اور جنگ نہیں تھی، نیز حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بھی اسے ناپسند فرماتے ہوئے کوئی اہمیت نہیں دی؛ بلکہ شدت سے منع فرمایا تھا، بہر حال گجرات وسندھ بلکہ پورا ہندوستان طائف اور اس کے قبیلہ بنوثقیف کا یہ احسان کبھی نہیں بھول سکتا ہے کہ اس نے ہندوستان کو اسلام کی روشنی سے منور فرمایا۔ (علماء گجرات کی خدمات حدیث: ۵۵-۶۰)

برصغیر پاک وہند کے مختلف مقامات میں مسلمان بغرض جہاد ۱۵ ہجری میں حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں آئے تھے، اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات پر صرف چار سال کا عرصہ گذرا تھا اور وہ صحابۂ کرام کا زمانہ تھا، بندرگاہ تھانہ، بھروچ، دیبل اور مکران کے دور دراز اور اجنبی علاقوں میں جہاد کا قصد دو چار آدمیوں ہی نے تو نہیں کیا ہوگا، ظاہر ہے اگر ہزاروں کی تعداد میں نہیں تو مجاہدین سینکڑوں کی تعداد پر ضرور مشتمل ہوں گے اور وہ سب کے سب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی تھے، ان خوش نصیب حضرات میں وہ بھی ہوں گے، جنہوں نے آں حضرت کی رؤیت وصحبت کی سعادت حاصل کی اور مخضرم اور مدرک صحابی بھی ہوں گے، جہاد، تجارت، محنت مزدوری، کاروبار، تبلیغ اسلام اور اشاعت دین کے سلسلہ میں صحابۂ کرام مختلف علاقوں اور مختلف بلاد وامصار میں پھیل گئے

تھے، ان کا مسکن مکہ یا مدینہ یا عرب کے بعض علاقے ہی نہ رہے تھے، تاریخ کی کتابوں سے ہمیں پچیس صحابۂ کرام کے اسمائے گرامی کا پتہ چل سکا ہے، جن کے مبارک قدم جہاد کے لئے برصغیر میں پہنچے، ورنہ خیال یہ ہے کہ بہت سے صحابۂ کرام یہاں تشریف لائے ہوں گے، جنہوں نے اس خطۂ ارض کے مختلف مقامات کو اپنا مسکن ٹھہرایا ہوگا۔ (برصغیر میں اسلام کے اولین نقوش: ۴۵،۵۶)

حضرت عثمان بن ابوالعاص ثقفی رضی اللہ تعالیٰ عنہ

قبیلۂ بنوثقیف سے تعلق رکھنے والے صحابۂ کرام میں حضرت عثمان بن ابوالعاص ثقفی رضی اللہ عنہ کا اسم گرامی خاص شہرت واہمیت کا حامل ہے، حافظ ابن حزم رحمۃ اللہ علیہ نے "جمهرة أنساب العرب" میں ان کے بارے میں جو الفاظ تحریر فرمائے ہیں، وہ ان کی جلالت قدر پر دلالت کرتے ہیں، ان کا تذکرہ کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں: كان من خيار الصحابة . یعنی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا شمار بلند مرتبت صحابہ میں ہوتا تھا۔

۱۵ رہجری کو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے انہیں عمان اور بحرین کے علاقوں کا گورنر بنادیا، اسی سال حضرت عثمان بن ابوالعاص رضی اللہ عنہ نے عمان میں ایک بحری بیڑا تیار کرایا اور اپنے چھوٹے بھائی حضرت حکم بن ابوالعاص ثقفی رضی اللہ عنہ کی قیادت میں اسے ہندوستان کی طرف روانہ کیا، اسلامی حکومت کا یہ پہلا بحری بیڑا تھا، جو ایک صحابی رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے تیار کیا گیا اور یہی وہ اولین بحری بیڑا تھا، جو موجودہ جغرافیائی اعتبار سے بمبئی کے قریب تھانہ اور بھروچ کی بندرگاوں پر حملہ آور ہوا، مجاہدین اسلام نے ان بندرگاہوں کو فتح کیا، لیکن ان پر قبضہ برقرار نہیں رکھا اور واپس عمان چلے گئے، ہندوستان کے کسی علاقے پر عرب مسلمانوں کا یہ پہلا حملہ تھا، یا یوں کہئے کہ پہلا کاروان تہذیب اسلامی اور اولین قافلۂ حاملین حدیث رسول تھا، جو عازم ہند ہوا۔

ان حضرات کا اصل مقصد اہل ہند کو ان پاکیزہ اخلاق وکردار، صاف ستھری تہذیب

وثقافت اور تعلیم وشائستگی کی ان بلند ترین اقدار سے بہرہ ور کرنا تھا، جن کو اسلام میں بنیادی اور اساسی حیثیت حاصل ہے۔

ہندوستان پر یہ حملہ ۱۵ ہجری میں ہوا تھا، جب کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رحلت پر صرف چار سال کا عرصہ گذرا تھا اور یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کا زمانہ تھا، تھانہ اور بھروچ کی بندرگاہوں پر جس بحری بیڑے کے ذریعہ حملہ کیا گیا، اس میں مجاہدین کا ایک لشکر سوار تھا، ان حضرات کی نہ تعداد کا علم ہوسکا ہے اور نہ ان کے نام کتب سیرت میں مل سکے ہیں، بحری بیڑا تیار کرنا اور پھر اس کے ذریعہ کسی ملک پر حملہ کرنا دو چار یا دس بیس آدمیوں کا کام نہیں ہے، یقیناً یہ حضرات سینکڑوں کی تعداد میں ہوں گے، جنہوں نے اپنے آپ کو شدید خطرے میں ڈال کر سمندر کی تند و تیز لہروں پر تیرتے ہوئے ایک دور دراز ملک پر چڑھائی کی تھی۔

ایک روایت میں بتایا گیا ہے کہ عثمان بن ابوالعاص رضی اللہ عنہ نے اس بحری بیڑے کی قیادت خود کی تھی اور انہی کی کمان میں تھانہ اور بھروچ کی بندرگاہوں کو فتح کیا گیا تھا۔

حضرت عثمان بن ابوالعاص رضی اللہ عنہ نے مختلف مقامات کی بہت سی جنگوں میں حصہ لیا اور متعدد عساکر اسلام کی قیادت کا فریضہ انجام دیا۔

آخری دور میں انہوں نے بصرہ میں سکونت اختیار کر لی تھی، ایک روایت کی رو سے ۵۱ ہجری میں اور ایک روایت کے مطابق ۵۵ ہجری میں آپ رضی اللہ عنہ نے وفات پائی۔
(جمہرۃ انساب العرب، ص:۲۶۶)

حضرت حکم بن ابوالعاص ثقفی رضی اللہ تعالیٰ عنہ

حضرت عثمان بن ابوالعاص ثقفی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے چھوٹے بھائی حضرت حکم بن ابوالعاص ثقفی رضی اللہ تعالیٰ عنہ تھے، جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی تھے، ۱۴ ہجری میں

جب حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضرت عثمان بن ابو العاص ثقفی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو معلم بصرہ کا منصب عطا کر کے بصرہ بھیجا اور پھر ایک سال بعد ۱۵ ہجری میں جب انہیں عمان اور بحرین کا والی بنایا تو عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنی جگہ اپنے اس بھائی حضرت حکم بن ابو العاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو طائف کا امیر مقرر کر دیا تھا، اس لئے کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے طائف سے مدینہ منورہ بلاتے وقت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو لکھا تھا کہ جس کو آپ مناسب سمجھیں؛ اپنی جگہ اس کو طائف کا والی بنادیں اور خود میرے پاس تشریف لے آئیں، چنانچہ عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ طائف کی امارت اپنے بھائی حکم کے سپرد کر کے خود امیر المؤمنین حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خدمت میں مدینہ منورہ پہنچ گئے۔

اس سے کچھ عرصہ کے بعد اپنے بڑے بھائی حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس چلے گئے، حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے انہیں بحرین کا امیر مقرر کیا اور انہوں نے امیر کی حیثیت سے کئی علاقوں پر فوج کشی کی اور فتح یاب ہوئے۔

حضرت حکم رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے حکم سے بلاد سندھ و ہند میں سے بندرگاہ **تھانہ، بھروچ**، دیبل، مکران اور اس کے نواحی علاقوں پر بھی یلغار کی اور جہاں گئے کامیاب رہے۔

یہاں یہ وضاحت کرنا ضروری ہے کہ حضرت عثمانؓ نے بلاد ہند پر حملہ کے لئے دربار خلافت سے اجازت نہیں لی تھی، فوجوں کی واپسی کے بعد جب انہوں نے حضرت عمرؓ کو اس کی اطلاع دی اور اپنی کامیابی سے مطلع فرمایا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس پر ناپسندیدگی کا اظہار فرمایا، ان کا نقطۂ نظر یہ تھا کہ عثمان رضی اللہ عنہ نے اتنے دور دراز علاقے پر سمندری حملہ کر کے مجاہدین کی جانوں کو خطرہ میں ڈال دیا تھا، چنانچہ انہوں نے عثمان رضی

اللہ عنہ کو ایک تہدید آمیز خط لکھا، اس خط کے کچھ الفاظ بلاذری نے اپنی کتاب ''فتوح البلدان'' میں درج کئے ہیں، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں امیر المؤمنین کے نزدیک ہندوستان کو سیاسی اور فوجی اعتبار سے کس درجہ اہمیت حاصل تھی، وہ لکھتے ہیں:

یاأخا ثقیف ! حملت دودا علی عود ، وانی احلف باللّٰہ ان لو اصیبوا لأخذت من قومك مثلهم.

یعنی اے ثقفی بھائی! تو نے کیڑے کو لکڑی پر چڑھا دیا، میں اللہ کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ اگر یہ فوجی مارے جاتے تو تجھ سے تیری قوم میں سے اتنے ہی آدمی لے لیتا۔

حضرت حکم بن ابو العاص ثقفی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نہایت زیرک، انتہائی معاملہ فہم، حلیم الطبع، دور اندیش، پیکر عفت، جنگی معاملات سے باخبر اور امور حرب وضرب سے خوب آگاہ تھے، تقوی وصلاحیت کا یہ عالم تھا کہ ایک مرتبہ زیاد بن ابوسفیان نے ان کو اپنے یہاں بلایا، ملاقات ہوئی اور باتیں کیں، تو زیاد نے ان کے بارے میں لوگوں سے کہا: ''یہ صالحیت اور تقوی کا مجسمہ ہے، ان کی عظمت کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی ہیں۔''

زیاد نے ان کی زیارت کو اپنے لئے باعث برکت قرار دیا اور انہیں خراسان کا والی مقرر کیا، ہندوستان کے بعض علاقوں میں بغرض جہاد آنے والے یہ صحابیٔ رسول صلی اللہ علیہ وسلم زندگی کے آخری دور میں بصرہ میں سکونت پذیر ہوگئے تھے اور وہیں ۴۵ رہجری میں وفات پائی۔ (جمہرۃ انساب العرب، ص:۲۶۶، برصغیر میں اسلام کے اولین نقوش:۵۲-۵۵)

تاریخی روایات سے پتہ چلتا ہے کہ بعض صحابہ کچھ کے علاقے میں بھی تبلیغ اسلام اور

جہاد کے لئے تشریف لائے، جسے عربی زبان کی کتب تاریخ میں ''کس'' لکھا گیا ہے، حضرت سمرہ بن عبدالرحمٰن قرشی رضی اللہ عنہ انہیں خوش نصیب صحابۂ کرام میں سے ہیں۔

حضرت عبدالرحمٰن بن سمرہ قرشی رضی اللہ تعالیٰ عنہ

جن حضرات نے فتح مکہ کے دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دست مبارک پر اسلام قبول کیا، ان میں حضرت عبدالرحمٰن بن سمرہ قرشی رضی اللہ عنہ کا اسم گرامی شامل ہے، ایک روایت کے مطابق قبول اسلام سے قبل ان کا نام ابن کعبہ تھا اور دوسری روایت کے مطابق انہیں عبدکلاں کہا جاتا تھا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا نام عبدالرحمٰن رکھا، منقول ہے کہ دائرۂ اسلام میں داخل ہونے کے بعد یہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جنگ تبوک میں شریک ہوئے۔

عبدالرحمٰن کی کنیت ابوسعید تھی، سلسلۂ نسب یہ ہے: ابوسعید عبدالرحمٰن بن سمرہ بن حبیب بن عبدشمس بن عبدمناف بن قصی القرشی العبشمی۔

حضرت عبدالرحمٰن بن سمرہ رضی اللہ عنہ کو آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے احادیث کی سماعت وروایت کا شرف بھی حاصل ہوا، خود ان سے متعدد مشہور تابعین نے حصول علم کیا، ان میں حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ، محمد بن سیرین، عمار بن ابی عمار اور سعید بن مسیّب کے اسمائے گرامی لائق ذکر ہیں۔

عبدالرحمٰن بن سمرہ رضی اللہ عنہ نے فتوحات عراق اور فارس کی بعض جنگوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا، ۲۳ھ/ہجری میں انہیں سجستان کا والی مقرر کیا گیا اور شہادت عثمان رضی اللہ عنہ تک اس منصب پر فائز رہے، کابل اور خراسان کی جنگوں میں بھی اہم کردار ادا کیا۔

ہندوستان کے سرحدی علاقوں پر حملے کئے اور رن کا کچھ کا علاقہ جو ہندوستان میں

واقع ہے اور گجرات کاٹھیاواڑ اورراجستھان کی سرحدوں کے درمیان پڑتا ہے، اس صحابیؓ رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے بزورشمشیر فتح کیا، اس زمانے میں رن کچھ کے نواح میں ایک اورمقام تھا، جسے عرب مؤرخین ''داور'' کے نام سے موسوم کرتے ہیں، جنگی نقطۂ نگاہ سے یہ ایک اہم مقام تھا، حضرت عبدالرحمٰن بن سمرہ رضی اللہ عنہ نے اسے فتح کرکے اسلامی مقبوضات میں شامل کیا۔زندگی کے آخری دور میں حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ نے بصرہ میں سکونت اختیارکرلی تھی اور باختلاف روایت ۵۰ یا ۵۱ ہجری کو وہیں وفات پائی۔(برصغیر میں اسلام کے اولین نقوش:۲،۷۲،۷۳)

عباد بن زیاد اموی رحمۃ اللہ علیہ
دوسرا جہادی سفر

عباد بن زیاد بن ابوسفیان،عباد کے والد وہی زیاد ہیں، جو دراصل ابوسفیان کے بیٹے تھے اور پہلے انہیں زیاد بن ابیہ کہا جاتا تھا، بعد میں زیاد بن ابوسفیان کہلائے ،زیاد کی کنیت ابو حرب تھی اور یہ عبیداللہ بن زیاد کے بھائی تھے۔

عباد تابعی تھے،انہوں نے عروہ بن مغیرہ بن شعبہ اورحمزہ بن شعبہ دونوں بھائیوں سے روایت حدیث کی،خود ان سے زہری اور مکحول نے روایت کی،جن کا شمار اکابر ائمۂ حدیث میں ہوتا ہے،مسح علی الخفین کی حدیث عباد بن زیاد سے مروی ہے،ابن حبان کا کہنا ہے کہ یہ ثقات میں سے تھے۔

بقول خلیفہ کے ۵۳ھ میں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے ان کو سجستان کا والی مقرر کردیا تھا،ایک روایت کے مطابق سجستان سندھ میں تھا اور اس کے کچھ حصے کو اب سیون شریف کہا جاتا ہے،حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے ۵۳/ہجری میں عبیداللہ کو اس منصب سے علیحدہ کردیا تھا اوران کی جگہ عباد کا تقرر عمل میں لایا گیا تھا۔

عباد نے افغانستان کے شہر قندھار اور اس کے گردونواح میں دشمنان اسلام سے جہاد کیا اور ہندوستان کے بعض علاقوں میں جو بت خانوں کی حیثیت سے مشہور تھے یا ان کے قرب وجوار میں تھے؛ جنگیں لڑیں، جن میں یہ کامیاب رہے اور اہل ہند کو ہزیمت کا سامنا کرنا پڑا۔

بلاذری نے لکھا ہے کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے پہلے عباد کے والد زیاد کو سجستان کا والی بنایا تھا، ان کی وفات کے بعد یہ عہدہ ان کے بیٹے عباد کے سپرد کیا گیا، عباد سات سال سجستان کے عہدۂ ولایت پر متعین رہے۔

عباد نے حدود سجستان اور حدود ہند کے کئی مقامات میں سلسلۂ جہاد جاری رکھا، ایک مرتبہ وہ دریائے سندھ عبور کرکے ہندوستان کے بعض علاقوں میں داخل ہوئے اور ''رن کچھ'' تک پہنچے، اس نواح میں کچھ عرصہ ان کا قیام رہا، وہاں سے گندھار کا عزم کیا۔

ابن المفرغ نے ان کے بارے میں جو اشعار کہیں ہیں، ان میں سے دو شعر یہ ہیں:

کم بالحروم وارض الهند من قدم
ومن سرائنك قتلى لاهم قبروا
بقندهار ومن يكتب منيته
بقندهار يرجم دونه الخبر

عباد بن زیاد اموی نے ۱۰۰ھ میں وفات پائی۔ (برصغیر میں اسلام کے اولین نقوش: ۱۲۷)

علامہ بلاذری فتوح البلدان میں لکھتے ہیں:

وغزا عباد بن زياد ثغر الهند من سجستان، فاتى سنارو ثم أخذ على حوى كهز الى الروذبار من ارض سجستان الى الهند مند ، فنزل كش وقطع المفازة ، حتى أتى القندهار فقاتل اهلها فهزمهم وفلهم وفتحها بعد ان اصيب

رجـال مـن الـمسلمين و رآى قلانس اهلها طوالا فعمل عليها فسميت العبادية و قال ابن مفرغ ۔

عباد بن زیاد نے سجستان سے ہند کی سرحد پر حملہ کیا اور سنارو پہنچے، پھر کہز کی سمت سے سجستان میں روذبار تک اور ہندمند (ہلمند) تک بڑھ گئے اور کُچھ میں ٹھہرے اور صحرا طے کر کے قندھار پہنچے، قندھار والوں نے جنگ کی؛ مگر عباد نے ان کو شکست دی اور بہت سے مسلمانوں کے کام آنے کے بعد قندھار فتح ہوا، عباد نے وہاں لوگوں کی لمبی ٹوپیاں دیکھ کر اس قسم کی ٹوپیاں بنوائیں، اسی لئے ان ٹوپیوں کا نام عبادیہ پڑ گیا۔ ابن مفرغ شاعر نے کہا ہے جس کا مضمون یہ ہے ۔

سخت گرم علاقوں اور سرزمین ہند میں کتنے بہادر اور سردار شہید ہوئے؛ مگر انہیں قبر نصیب نہ ہوئی۔

قندھار میں جس کی موت مقدر ہو تو سمجھنا چاہئے کہ اس کی کوئی خبر نہ مل سکے گی۔ (فتوح البلدان:۴۲۲)

یزید بن مِفرغ حِمُیَری

یزید بن زیاد بن ربیعہ بن مفرغ بن ذی العشیر ہ بن حارث حمیری، یزید کی کنیت ابو عثمان تھی اور یہ تابعی تھے، دور بنوامیہ کے قادرالکلام شاعر اور ادیب تھے، انہوں نے ایک مرتبہ عبیداللہ بن زیاد کی ہجو کی، جس کی پاداش میں عبیداللہ نے سخت سزا دی تھی اور کچھ عرصہ جیل میں رکھا تھا۔

یزید بن مفرغ بہت سی خوبیوں کے مالک تھے، پیکر صبر وقناعت، باہمت اور مجاہد تھے، جن دنوں عباد بن زیاد ہندوستان اور قندھار کے علاقوں میں غیر مسلموں کے خلاف مصروف جہاد تھے؛ یزید بن مفرغ ان کے ہم رکاب تھے، اس مرد مجاہد نے ہندوستان کے علاقے رن کُچھ میں بھی کفار کے ساتھ جہاد کیا۔

ایک روایت کے مطابق حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے ان کو علاقۂ ہند کی طرف روانہ کیا تھا، انہوں نے ٦٩ ہجری میں وفات پائی۔ (برصغیر میں اسلام کے اولین نقوش:١٢٨)

محمد بن قاسم کا سندھ پر حملہ
راجہ داہر سے جنگ اور اس کا قتل

تیسرا جہادی سفر: مسلمانوں نے ہندوستان کے جس علاقہ پر سب سے پہلے فوج کشی کی وہ پاکستان کا مشہور صوبہ سندھ ہے، مسلمانوں کے متعلق یہ کہا جاتا ہے کہ انہوں نے سندھ کے علاقہ پر محض اس لئے حملہ کیا تھا چونکہ مسلمان ہندوستان میں تلوار کے ذریعہ اشاعتِ اسلام کیلئے مُضطرب تھے لیکن حقیقت اس سے بالکل مختلف ہے، امرِ واقعہ یہ ہے کہ فاتحین عرب اپنی دوسری فتوحات میں اس قدر مصروف تھے کہ وہ شاید سندھ کی جانب کبھی توجہ ہی نہ کرتے لیکن سندھ کے حکمرانوں اور راجاؤں نے مسلمانوں کے مخالفین کی امداد کر کے اور مسلم حکومتوں کے خلاف شورشیں برپا کر کے مسلمانوں کو اس چیز کے لئے مجبور کر دیا کہ وہ سندھ پر ضرور حملہ کریں۔

سندھ کے حکمرانوں کی شورش پسندی

سندھ کے راجاؤں اور ایران کے بادشاہوں میں اگرچہ دیرینہ دشمنی چلی آرہی تھی اور ان میں کئی لڑائیاں بھی ہو چکی تھیں؛ لیکن جب مسلمانوں نے ایران پر حملہ کیا تو سندھ کے راجہ اور ایران کے بادشاہ دونوں مسلمانوں کے مقابلہ کے لئے متحد ہو گئے، چنانچہ یزدجرد شاہ ایران سے عرب کے مسلمانوں کی جو تاریخی اور فیصلہ کن جنگ ہوئی ہے، اس جنگ میں سندھ کے راجہ نے ایرانیوں کے ساتھ مل کر نمایاں حصّہ لیا تھا۔ راجہ نے نہ صرف اپنی فوج شاہ ایران کی امداد کے لئے بھیجی تھی بلکہ اپنے تمام جنگی ہاتھی بھی اس جنگ میں جھونک دیئے تھے، ان

ہاتھیوں نے اس جنگ میں مسلمانوں کو شدید نقصان پہنچایا، یہاں تک کہ اسلامی فوج کے سپہ سالار حضرت ابوعبیدہ ثقفی رضی اللہ عنہ کو ایک ہاتھی ہی نے شہید کیا تھا، اسی طرح ایران کے بعد جب مسلمانوں نے مکران پر حملہ کیا تو ایرانیوں کے ساتھ سندھیوں نے بھی اسلامی لشکر کا مقابلہ کیا تھا، یہ حملہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے عہد حکومت میں ہوا تھا، سندھیوں کی یہ شورش پسندیاں اس کے بعد بھی برابر جاری رہیں، چنانچہ مکران کے اسلامی حاکم نے ان کی فتنہ پردازی کو دیکھتے ہوئے سندھ کے راجہ ساہسی پر حملہ کرنے کی حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے اجازت چاہی تھی لیکن آپ نے اجازت نہیں دی۔

حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں یعنی ۲۴ھ ۶۴۴ء میں جبکہ سندھ میں راجہ چچ کی حکومت تھی، سندھی فوجوں نے مکران کی سرحد پر پے در پے حملے شروع کردیئے تھے، ان حملوں میں ایران کے اُن آتش پرستوں کا بھی ہاتھ تھا جنہوں نے ایران سے فرار ہونے کے بعد سندھ میں پناہ لی تھی، اور سندھ کا راجہ ان کو دوبارہ ایران فتح کرنے کی برابر ترغیب دیتا رہتا تھا، چنانچہ جب سندھیوں کی یہ شورش پسندی خطرناک حد تک بڑھ گئی تو بصرہ کے حاکم عبداللہ بن عامر نے عبدالرحمٰن بن سمرہ حاکم کرمان کو اس شورش کے دبانے کا حکم دیا، عبدالرحمٰن بن سمرہ نے سندھی فوجوں پر حملہ کر کے بھگا دیا اور مکران سے سرحد کیکانان تک کا تمام علاقہ چھین لیا، اس کے بعد ۳۸ھ/ ۶۵۸ء میں راجہ سندھ نے بلوچستان کی سرحد پر اسی قسم کی ایک اور بغاوت برپا کردی جس کو حارث بن مرہ نامی ایک سردار نے فوراً دبا دیا تھا، اس واقعہ کے تین سال بعد ۴۱ھ/ ۶۶۱ء میں امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے دورِ حکومت میں پھر راجہ سندھ کی عنایت سے اسی علاقہ میں شورش برپا ہوئی جس کو راشد بن عمر نے فرو کیا، لیکن چند ہی روز بعد پچاس ہزار کے ایک لشکر نے جو باغیوں اور سندھیوں پر مشتمل تھا دوبارہ حملہ کردیا، اس حملہ پر مسلم سپہ سالار راشد شہید ہوگئے، لیکن سنان بن سلمہ نے جرأت کا

ثبوت دیتے ہوئے اس شورش کو دبا دیا تھا۔

کابل قندھار جو اس زمانہ میں خلافتِ اسلامیہ کے ماتحت تھے وہاں ۴۲ھ/۶۶۴ء میں شدید بغاوت برپا ہوگئی، اور اس بغاوت کے بعد ان صوبوں نے اپنی خودمختاری کا اعلان کیا، چنانچہ امیر مہلب ان کی سرکوبی کے لئے گیا، امیر مہلب کے مقابلہ کی تاب نہ لاکر کابل وقندھار کے باغی بھاگ کھڑے ہوئے اور ان کو بھی سندھ کے راجہ چچ نے ہی پناہ دی تھی، امیر مہلب نے ان باغیوں کا تعاقب برابر جاری رکھا یہاں تک کہ اس نے دریائے سندھ کو عبور کر کے ملتان تک ان کا پیچھا کیا، اور ملتان کو جو اس زمانہ میں سندھ کا ایک صوبہ تھا فتح کرلیا، لیکن امیر مہلب ابھی سندھ کے اس مفتوحہ علاقہ کا کوئی انتظام نہ کرسکا تھا کہ اس کو ایک دوسری مہم کے لئے بلخ جانا پڑا، مہلب کے جاتے ہی سندھ کے راجہ نے پھر اپنا علاقہ سنبھال لیا۔

۵۵ھ/۶۷۵ء میں سندھ کا راجہ چچ فوت ہوگیا اور اس کا بڑا لڑکا چندر تخت پر بیٹھا جس کا سلوک مسلمانوں کے ساتھ نہایت اچھا تھا، اسی لئے راجہ چندر کے زمانہ میں مسلمانوں نے سندھ کی جانب کوئی توجہ نہیں کی لیکن ۶۳ھ/۶۸۳ء میں چندر کے مرنے کے بعد جب اس کا چھوٹا بھائی داہر تخت پر بیٹھا تو اس نے پھر مسلمانوں کے ساتھ چھیڑ چھاڑ شروع کردی؛ چنانچہ راجہ داہر نے مسلمانوں کے خلاف ایک اسکیم تیار کی جس کا منشا یہ تھا کہ مسلمانوں کے مشرقی مقبوضات پر حملہ کر کے ان کو مشرقی ممالک سے قطعی بے دخل کردیا جائے، اس اسکیم کے ماتحت راجہ داہر کے ملتان کے گورنر نے قندھار پر حملہ کردیا، لیکن عامل قندھار نے راجہ داہر کی فوج کو پسپا کر کے اسے ملتان تک فرار ہونے پر مجبور کردیا۔

سندھ کے راجاؤں کی ان پے درپے یورشوں سے یہ اندازہ لگانا دشوار نہیں ہے کہ کسی طرح سندھ کے راجہ برابر خلافت اسلامیہ کو مقابلہ کا چیلنج دیتے رہے تھے لیکن خلافت اسلامیہ

اوراس کے نائبین نے برابر درگذر سے کام لیا، اس لئے نہیں کہ خلافتِ اسلامیہ کمزور تھی بلکہ اس لئے کہ خلافتِ اسلامیہ اپنی وسیع حکومت میں مزید توسیع کی خواہشمند نہ تھی، اور وہ عراق وایران کے سرسبز وشاداب ممالک کے مقابلہ میں صوبہ سندھ کے بنجر علاقہ کو کچھ زیادہ اہمیت نہیں دیتی تھی، خلافتِ اسلامیہ کی طاقت اورقوت کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ جب بھی خلافتِ اسلامیہ کی فوجیں سندھ کے راجاؤں سے نبرد آزما ہوئیں تو سندھ کے راجاؤں کو شکست کا منہ دیکھنا پڑا۔

مکران میں علافیوں کی بغاوت

اموی خلیفہ عبدالملک بن مروان اورممالک شرقیہ کے اسلامی وائسرائے حجّاج بن یوسف کے عہدِ حکومت میں اچانک مکران میں پھر بغاوت برپا ہوگئی، جس کو دبانے کے لئے سعید بن مسلم کلابی کومکران کا عامل مقررکر کے بھیجا گیا، مسلم کلابی نے شورش پسندوں کوسخت سزائیں دیں اوراس بغاوت کو چندروز میں دبادیا لیکن سندھ کے راجہ داہر کے دوست محمد بن علافی اورمعاویہ بن علافی نے شورش پسندوں کواپنے گردجمع کر کے پھر نئے سرے سے مکران میں بغاوت برپا کرادی اورعلاقہ مکران کے کئی شہروں پر قبضہ جمالیا، علافیوں کی اس شرارت کو دبانے کے لئے جب سعید بن مسلم کلابی نے ان پرحملہ کیا تو اس حملہ میں کلابی کوشکست ہوئی اوروہ علافیوں کے ہاتھوں گرفتار ہوگیا، علافیوں نے مسلم کلابی کوقتل کر کے اس کی کھال اتروائی اوراچھی طرح لاش کی بےحرمتی کی، پھرانہوں نے مکران میں اپنی خودمختاری کا اعلان کردیا۔

علافیوں کی اس خودمختاری کے اعلان کے بعد خلافتِ اسلامیہ کے لئے یہ ضروری ہوگیا کہ وہ اس بغاوت کوفروکرنے کے لئے فوری قدم اٹھائے، چنانچہ سعید تمیمی اوراس کے بعد محمد بن ہارون کوحجاج نے عامل بنا کر علافیوں کی سرکوبی کے لئے ماموکیا، محمد بن علافی اورمعاویہ بن علافی لشکراسلامی کے مقابلہ کی تاب نہ لاکر پہاڑوں میں کئی سال تک رُوپوش

رہے، آخر پانچ سال کے بعد محمد بن ہارون نے معاویہ بن علافی کو گرفتار کر کے قتل کر دیا، لیکن محمد بن علافی پانچ سو سپاہیوں کی جمعیت کے ساتھ بچ کر نکل گیا اور راجہ داہر کے پاس چلا گیا۔

راجہ داہر جس کا اس فتنہ میں بہت بڑا ہاتھ تھا اس نے اپنی حکومت میں محمد بن علافی کو ایک بڑا عہدہ دے دیا، اور بعد میں تو راجہ داہر نے محمد بن علافی کو نہ صرف وزارتِ عظمیٰ کا اہم عہدہ عطا کر دیا، بلکہ اس کی اتنی عزت افزائی کی کہ داہر کی حکومت کے سکّوں کی پشت پر علافی کا نام تک مضروب ہونے لگا، یہ واقعہ اس بات کا کھلا ہوا ثبوت ہے کہ راجہ داہر خلافتِ اسلامیہ کے باغیوں اور دشمنوں کی ہمّت افزائی میں کس طرح پیش پیش تھا۔

داہر کے گورنر نے اسلامی جہازوں کو لوٹ لیا

جس زمانہ میں سندھ کا راجہ داہر خلافت اسلامیہ کے مشرقی مقبوضات میں بغاوتیں پیدا کر رہا تھا اور خلافتِ اسلامیہ کے باغیوں کو اپنی حکومت میں نواز رہا تھا، اسی زمانہ میں مسلمانوں کی تعداد برابر جنوبی ہند میں بڑی تیزی کے ساتھ بڑھ رہی تھی چنانچہ لنکا دیپ، مال دیپ، سراندیپ اور مالا بار میں مسلمان بکثرت موجود تھے، جنوبی ہند کے اکثر راجاؤں نے بھی اسلام قبول کر لیا تھا، سراندیپ کے نومسلم راجہ کے تعلقات خلافتِ اسلامیہ کے ساتھ نہایت ہی خوشگوار تھے، اس راجہ نے اسلامی مرکز سے اپنے تعلقات کو اور زیادہ اسطوار کرنے کے لئے قیمتی تحائف بھرا ہوا آٹھ جہازوں کا ایک بیڑا مشرقی ممالک کے اسلامی وائسرائے حجاج بن یوسف کی خدمت میں روانہ کیا تھا، ان جہازوں میں قیمتی تحائف کے علاوہ سیکڑوں عازمین حج اور سراندیپ میں فوت ہو جانے والے عرب سوداگروں کی بیوہ عورتیں اور یتیم بچے بھی سوار تھے۔

جہازوں کا یہ بیڑا اچانک طوفان میں پھنس گیا اور باد مخالف کے تھپیڑوں سے سندھ کی

بندرگاہ دبیل (کراچی) سے جالگا، اس زمانہ میں راجہ داہر کا ایک گورنر دبیل میں رہتا تھا، جب اسے یہ معلوم ہوا کہ ان جہازوں میں مسلمان ہیں اور خلافتِ اسلامیہ کے لئے تحائف بھی ہیں تو اس نے ان جہازوں کو بڑی بے دردی کے ساتھ لوٹا اور مسلمان مردوں، عورتوں اور بچوں کو گرفتار کر کے جیل خانہ میں ڈال دیا۔

مشرقی ممالک کے اسلامی وائسرائے حجاج بن یوسف کو جب راجہ داہر کے گورنر کی اس ناشائستہ حرکت کا علم ہوا تو خلافتِ اسلامیہ کی جانب سے بذریعہ قاصد شدید احتجاج کیا گیا اور مطالبہ کیا گیا کہ مسلمان قیدیوں کو رہا کیا جائے اور لوٹا ہوا سامان واپس کر دیا جائے لیکن راجہ داہر نے قاصد کو لاپرواہی کے ساتھ جواب دے دیا کہ ''جہازوں کو لوٹنے والے ہمارے قبضہ کے نہیں ہیں، تم خود ان سے آکر اپنے قیدی چھڑالو اور اپنا مال واسباب لے لو''۔

راجہ داہر کا یہ ذلّت آمیز اور مضحکہ انگیز جواب خلافت اسلامیہ کیلئے ایک ایسا کھلا چیلنج تھا جسے کوئی بھی خوددار حکومت گوارہ نہیں کرسکتی، چنانچہ حجاج بن یوسف کو سندھ کے راجہ داہر کی سرکوبی کے لئے خلیفہ ولید بن عبدالملک سے اجازت لینی پڑی۔

سندھ پر عربوں کے ناکام حملے

راجہ داہر کے ذلّت آمیز جواب کے بعد حجاج بن یوسف نے عبداللہ السلمی کو ایک مختصر سی فوج دیکر دبیل کی جانب روانہ کر دیا، عبداللہ السلمی ابھی جنوبی بلوچستان ہی میں تھا کہ راجہ داہر کے بیٹے کیتسپ (جے سیہ) نے بلوچستان میں پیش قدمی کر کے اسلامی لشکر کو بری طرح شکست دے دی، اس جنگ میں عبداللہ السلمی شہید ہو گئے۔

اس ناکامی کے بعد حجاج بن یوسف نے چار ہزار فوج بدیل مجالی کی سرکردگی میں دوبارہ دبیل پر حملہ کرنے کے لئے روانہ کی اور محمد ہارون عامل مکران کو بھی ہدایت کی کہ وہ

بدیل مجال کی ہر ممکن امداد کرے لیکن راجہ داہر کے بیٹے جے سیہ نے جس کی ہمت پچھلی فتح سے بڑھ گئی تھی راستہ ہی میں اسلامی فوج کو گھیر لیا ، جے سیہ کے ساتھ بے اندازہ فوج اور جنگجو ہاتھیوں کا پورا غول تھا، دونوں لشکروں میں بڑے معرکہ کی جنگ ہوئی لیکن اس جنگ میں بھی مسلمانوں کو ناکامی کا منھ دیکھنا پڑا، چنانچہ اسلامی لشکر کا بیشتر حصہ کام آ گیا اور اسلامی سپہ سالار بھی شہید ہو گیا، جب حجاج کو اس دوسری ناکامی کا علم ہوا تو اس کی آنکھیں کھلیں اور اسے پتہ چلا کہ سندھ کا راجہ مقابلہ کی کافی تیاری کر چکا ہے۔

محمد بن قاسم کا سندھ پر حملہ

گذشتہ ناکامیوں کو دیکھتے ہوئے حجاج بن یوسف نے خلیفہ کی منظوری کے بعد سندھ پر یورش کرنے کے لئے نہایت ہی وسیع پیمانے پر انتظامات شروع کر دیئے، اس مہم کی سرکردگی کے لئے حجاج نے اپنے سترہ سالہ داماد محمد بن قاسم گورنر فارس کو منتخب کیا، محمد بن قاسم نوعمر ہونے کے باوجود فارس میں بڑی قابلیت کا ثبوت دے چکے تھے، اس لئے یہ اہم کام بھی ان کے سپرد کیا گیا۔

محمد بن قاسم چھ ہزار اسپ سواروں اور چھ ہزار شتر سواروں کے لشکر کو لے کر شیراز و کرمان ہوتا ہوا سندھ کی جانب بڑھا، کرمان میں عامل کرمان محمد بن ہارون مع اپنی تین ہزار فوج کے محمد بن قاسم کے ہمراہ ہو گیا، ادھر ارمن بیلہ میں راجہ داہر کا لشکر مقابلہ کے لئے تیار کھڑا تھا، چنانچہ ۹۳ھ/۷۱۲ء میں ارمن بیلہ کے مقام پر دونوں لشکروں کی مڈھ بھیڑ ہوئی مگر اس جنگ میں راجہ داہر کی فوج کو بُری طرح شکست ہوئی، محمد بن قاسم ارمن بیلہ کی فتح کے بعد دبیل (کراچی) کی جانب بڑھا، دبیل زمانہ قدیم کی بہت بڑی بندرگاہ تھی، دبیل پر حملہ کے وقت مسلمانوں کا ایک بہت بڑا سمندری بیڑا بھی دبیل پہنچ گیا تھا جس سے لشکر اسلام کو

بہت زیادہ تقویت پہنچی، غرضیکہ دبیل کی بندرگاہ پر راجہ اور مسلمانوں کی فوج میں بڑی گھمسان کی لڑائی ہوئی، اس لڑائی میں مسلمان فتح یاب ہوئے اور راجہ داہر کے بیٹے جے سیہ عرف کیشب کو میدانِ جنگ سے فرار ہونا پڑا اور اس طرح دبیل اور گردوپیش کے علاقہ پر مسلمانوں کا قبضہ ہو گیا۔

محمد بن قاسم نے جب دبیل پر حملہ کر کے اسے فتح کر لیا تو راجہ داہر وہاں سے بھاگ گیا تھا اور حدودِ سندھ سے نکل کر راجہ راسل کی راجدھانی میں ''کچھ'' کے مقام پر پہنچ گیا تھا، یہ علاقہ ہندوستان میں شامل تھا جو موجودہ دور میں گجرات کاٹھیاواڑ کا حصہ ہے، راجہ داہر نے راجہ راسل سے مل کر محمد بن قاسم کے خلاف وسیع پیمانے پر جنگی تیاریاں شروع کر دی تھیں، محمد بن قاسم سندھ کے بڑے اور مشہور شہروں کو زیرنگیں کر کے اپنی فوج کا رخ ہندوستان کے اس علاقے کی طرف موڑنا چاہتے تھے؛ جہاں راجہ داہر اسلامی لشکر کے خلاف معرکۂ آراء ہونے کی تیاریوں میں مصروف تھا، چنانچہ ہنگامی طور سے دریائے سندھ پر لکڑی کا پل باندھ دیا گیا، جسے عبور کر کے مسلمان فوج کچھ کے علاقہ میں داخل ہوگئی، راجہ داہر جو دبیل کی شکست کا بدلہ لینے کے لئے ایک مدت سے یہاں بیٹھا حربی ساز و سامان جمع کر رہا تھا، نہایت عزم و ہمت اور انتہائی تیزی اور مستعدی کے ساتھ بہت بڑے لشکر کی معیت میں میدان جنگ میں نمودار ہوا، وہ ایک جنگی ہاتھی پر سوار تھا، مؤرخین کے بیان کے مطابق مزید ستائیس ہاتھی اس کے آگے پیچھے چل رہے تھے اور یہ وہ ہاتھی تھے؛ جنہیں خاص طور سے جنگی تربیت دی گئی تھی۔

راجہ داہر اس جنگ کو فیصلہ کن جنگ کی حیثیت دینا چاہتا تھا اور یہ جنگ واقعی فیصلہ کن ثابت ہوئی، اس میں ٹھاکروں کی فوج بھی ہزاروں کی تعداد میں داہر کے زیر کمان تھی، یہ بڑی بہادر فوج تھی؛ جس نے مسلمانوں کا مقابلہ جرأت و بے جگری سے کیا، تاریخ کی کتابوں میں

بتایا گیا ہے کہ اس جنگ کی شدت کا یہ عالم تھا کہ اس نواح میں اس سے قبل کبھی ایسی شدید اور زوردار جنگ نہیں ہوئی تھی۔

منصور بن حاتم نخوی کے حوالہ سے ہندوستان کے ممتاز مؤرخ قاضی اطہر مبارک پوری رحمۃ اللہ علیہ رقم طراز ہیں:

''راجہ داہر اور اس کے قاتل دونوں کی تصویریں یا مجسمے شہر بھروچ میں بنے ہوئے ہیں، ہندوستان میں قدیم زمانہ سے نامور افراد کے مجسموں اور تصویروں کے ذریعہ ان کی یادگار قائم کرنے کا رواج ہے، چوں کہ سندھ کا راجہ داہر سوراشٹر اور گجرات کے علاقے کچھ میں قتل ہوا، جو راجہ راسل کی ملکیت تھا، اس لئے اس کی اور اس کے قاتل دونوں کی یادگار گجرات کے قدیم شہر بھروچ میں قائم کر کے دونوں بہادروں کے کارناموں کو یادر کھا گیا، دونوں اپنے اپنے کارناموں میں بہادر تھے، راجہ داہر نے عرب کی عظیم فوج کا جم کر مقابلہ کیا اور قشعم نے اس عظیم راجہ کا کام تمام کیا، راجہ داہر کے مرنے کے بعد پورے سندھ پر محمد بن قاسم کا مکمل قبضہ ہو گیا اور وہ اطراف وجوانب کے قریہ قریہ اور شہر شہر کو فتح کرتے ہوئے ارور جا پہنچے۔''

راجہ داہر سے لڑنا اور اس کو قتل کر دینا بہت بڑا کارنامہ تھا، جو محمد بن قاسم کی قیادت میں عرب فوج نے سرانجام دیا، جب راجہ داہر کا سر عراق پہنچا تو کئی شاعروں نے محمد بن قاسم اور ان کی بہادر فوج کی تعریف میں شعر کہے، یہ شعر کہنے میں وہ بلاشبہ حق بجانب تھے۔

حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ کے فرزند گرامی حضرت کہمس جو نامور تابعی تھے،

اس جنگ میں فوجی کی حیثیت سے محمد بن قاسم کے لشکر میں شامل تھے، وہ اس جنگ کا حال بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ راجہ داہر بہت بڑی فوج لے کر ہمارے مقابلہ میں آیا، ستائیس جنگی ہاتھی اس کے ساتھ تھے، دریائے سندھ عبور کر کے ہم اس کے لشکر جرار کا مقابلہ کرنے کے لئے گئے اور پھر شدید جنگ ہوئی، جس میں عددی اعتبار سے بھی داہر کی فوج بہت زیادہ تھی، حربی ساز وسامان کا بھی کوئی حساب نہ تھا، سب سے بڑی بات یہ کہ جہاں جنگ ہورہی تھی اس کے گرد وپیش کا تمام علاقہ خود اس کی یا اس کے ہم مذہب راجہ مہاراجوں کی قلم رو میں شامل تھا، لیکن اس کے باوجود دشمن کو ہزیمت اور مسلمانوں کو کامیابی ہوئی، یہ سب اللہ تعالیٰ کی مہربانی اور اس کی رحمت تھی۔

سندھ اور ملتان کی فتح کے بعد محمد بن قاسم نے ان شہروں اور علاقوں کو مرکز توجہ ٹھہرایا؛ جو سندھ سے ملحق ہیں اور ہندوستان کے موجودہ جغرافیہ کے لحاظ سے راجستھان اور گجرات کاٹھیاواڑ میں شامل ہیں، اس نواح کے بعض مقامات مثلاً کچھ وغیرہ اس سے تھوڑا عرصہ قبل راجا داہر کے ساتھ لڑائی کے نتیجے میں فتح ہو چکے تھے، اب باقی علاقوں اور شہروں کو فتح کرنے کا عزم کیا گیا، اس کے لئے انہوں نے سب سے پہلے بھیلمان پر فوج کشی کی، جسے عربی کتب تاریخ میں بیلمان لکھا گیا ہے، یہ شہر اس زمانہ میں گوجر قوم کا مرکزی مقام تھا، جو اچھی خاصی تعداد میں اس نواح میں آباد تھے، بھیلمان کے باشندوں نے مسلمان فوج کا مقابلہ نہیں کیا اور اس کی شرائط کے مطابق صلح کر لی۔

اس کے بعد محمد بن قاسم کی فوج اس علاقے کے ایک شہر سورٹھ کی طرف بڑھی، جسے عرب مؤرخوں نے ''سرست'' تحریر کیا ہے، یہاں کے لوگوں نے بھی لڑائی سے گریز کیا اور کسی قسم کی مزاحمت کے بغیر مسلمانوں کی اطاعت گزاری کا اعلان کر دیا۔

کھیڑا کی جنگ اور فتح

بھیلمان اور سورٹھ کو بلا مقابلہ زیر نگیں کر لینے کے بعد اسلامی فوجوں نے کھیڑا کا رخ کیا، جو علاقۂ گجرات کے وسط میں واقع ہے اور جسے عربوں کی تاریخ میں ''کیرج'' کے نام سے موسوم کیا گیا ہے، اس شہر اور اس کے گرد ونواح کا حکمران راجہ دوہر تھا، اسے محمد بن قاسم کی آمد کا پتہ چلا تو مقابلہ کے لئے میدان میں اترا، دونوں طرف فوجیں آمنے سامنے آئیں اور قدم جما کر لڑنے لگیں، کچھ دیر بعد راجہ دوہر کی فوج کے پاؤں اکھڑ گئے اور راجہ میدان چھوڑ کر بھاگ کھڑا ہوا۔

ایک روایت کے مطابق راجہ دوران جنگ میں مارا گیا اور شہر کے لوگوں نے محمد بن قاسم کی خدمت میں حاضر ہو کر امان طلب کیا، جن لوگوں نے لڑائی میں حصہ نہیں لیا تھا، انہیں امان دی گئی اور جو لوگ شریک جنگ تھے؛ ان میں سے بعض کو قتل کر دیا گیا اور بعض کو قید میں ڈال دیا گیا۔

محمد بن قاسم نے پورے سندھ کو مسخر کیا، ملتان پر تسلط جمایا اور راجستھان اور گجرات کاٹھیاواڑ کے بہت سے شہروں کو زیر کیا، مفتوحہ علاقوں میں مسجدیں تعمیر کرائیں، مدرسے قائم کئے اور قرآن وحدیث کی تعلیم کے لئے اساتذہ مقرر کئے۔

گجرات کے ایک شہر کھیڑا میں اس کا مجسمہ بنا کر وسط شہر میں نصب کیا گیا، یہ اس کے بہت بڑے اور عادل امیر ہونے کی دلیل تھی، اس ضمن میں بلاذری کے الفاظ لائق مطالعہ ہیں: فبکی اھل الھند وصوروہ بالکیرج. یعنی محمد بن قاسم کی موت پر ہندوستان کے لوگ روئے اور کیرج (کھیڑا) میں اس کی تصویری یادگار قائم کی گئی۔

یہ اس کے ساتھ باشندگان ہند کی محبت وعقیدت کی انتہا تھی اور اس کی ہر دل عزیزی، معدلت گستری اور انصاف کے تقاضوں پر عمل پیرا ہونے کا واضح ثبوت تھا، مدتوں یہ صورت

حال رہی اور عرصۂ دراز تک لوگ اسے یاد کرتے اور آنسو بہاتے رہے، وہ بہت بلند مرتبہ امیر تھا، سندھ اور ہند کی فتوحات میں ایک طرف اگر اس نے اپنے آپ کو رستم و اسکندر سے بڑھا ہوا ثابت کیا تو دوسری طرف عدل وانصاف، رعایا پروری اور ہمدردیٔ خلائق میں نوشیرواں سے بازی لے گیا۔ (برصغیر میں اسلام کے اولین نقوش:۱۵۳،۱۵۶،۱۶۳)

علامہ بلاذری فتوح البلدان میں رقم طراز ہیں:

حجاج کے انتقال کی خبر جب محمد بن قاسم کو ہوئی تو وہ ملتان سے رورو بغرور واپس چلے آئے اور لوگوں کو داد و دہش کی، ان دونوں شہروں کو وہ پہلے فتح کر چکے تھے، پھر بھیلمان کی طرف ایک لشکر بھیجا؛ مگر جنگ کی نوبت نہیں آئی اور بھیلمان والوں نے اطاعت قبول کر لی، کاٹھیاوار کے لوگوں نے بھی صلح کر لی، اس زمانہ میں وہ اہل بصرہ کا جولانگاہ ہے، یہاں کے باشندے مید ہیں، جن کا کام سمندروں میں ڈاکہ ڈالنا ہے، اس کے بعد محمد کیرج کی طرف بڑھے تو دوہر مقابلہ میں آیا، مگر دشمنوں کو شکست فاش ہوئی اور دوہر کہیں بھاگ نکلا، یہ بھی کہا جاتا ہے کہ وہ قتل کر دیا گیا تھا اور اہل شہر محمد بن قاسم کے فیصلے پر رضامند ہو گئے، چنانچہ محمد نے جنگ آزما لوگوں کو قتل اور بقیہ اشخاص کو قید کر لیا۔ شاعر کہتا ہے ؎

نحن قتلنا داهر ا و دهورا　　　والخيل تردی منسرا فمنسرا

ہم نے داہر اور دہور کو قتل کیا اور ہمارے گھوڑسوار دشمنوں کے غول کے غول ٹھوکروں سے مار گرا رہے تھے۔

محمد بن قاسم کے جانے پر اہل ہند نے افسوس کیا، چنانچہ بلاذری لکھتے ہیں: فبکی اھل الھند علی محمد و صوروہ بالکیرج ، فحبسہ صالح بواسط. اہل ہند نے محمد کے غم میں گریہ وزاری کی اور اس کا ایک مجسمہ کیرج میں تیار کیا، صالح نے انہیں واسط کے قید خانہ میں قید کر کے رکھا، محمد نے یہ شعر کہے ۔

اگر مجھے بیڑیاں اور زنجیریں پہنا کر واسط میں قید کر دیا گیا ہے، تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے، اس لئے کہ اس سے پہلے کتنے نوجوان شہ سواروں کے دل میں میری دھاک رہ چکی ہے اور کتنے بہادروں اور سرداروں کو میں نے مردہ کر کے چھوڑ دیا ہے۔ (فتوح البلدان: ۴۲۷، ۴۲۸)

بھیلمان وغیرہ کی فتح

مولانا ابوالظفر ندوی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

اس اثناء میں ایک فوج بھیلمان (بھیل مان اس کو عرب مؤرخ بلاذری نے بیل مان لکھا ہے، کامل، ج:۴/۴۶۱) روانہ کر دی، جو سندھ، گجرات کاٹھیاواڑ اور ماڑواڑ کی سرحد پر واقع تھا اور کسی زمانہ میں بھیلوں اور پھر گوجروں کا پایۂ تخت تھا، یہاں کے لوگوں نے جنگ کرنا نامناسب سمجھ کر اطاعت قبول کر لی اور سرست کے لوگوں نے بھی آ آ کر اطاعت کا اظہار کیا۔

سورٹھ: کاٹھیاواڑ کا قدیم نام ہے، غالبا سورٹھ کے اس علاقہ کے کسی ٹھاکر نے اطاعت قبول کر لی ہوگی، جو علاقہ بھیلمان سے ملتا ہوا ہوگا، ورنہ سورٹھ میں محمود غزنوی سے پہلے کوئی مسلمان حاکم نہیں آیا اور پایۂ تخت سورٹھ کو محمد تغلق سے پہلے کسی نے فتح نہیں کیا۔

محمد بن قاسم ان ممالک کو بآسانی فتح کر کے کیرج یا کورج (جے پور) کی طرف بڑھا اور حملہ آور فوج کی کمان خود لی، یہاں کے راجہ کا نام دوہر تھا، جو ہندوستانی راجاؤں میں مشہور تھا، دوہر بھی اپنی فوج لے کر بڑھا اور سخت خون ریز جنگ کے بعد اس کو شکست ہوئی اور عین

معرکۂ کارزار میں بہادری کے ساتھ اس نے جان دی۔ایک عربی شاعر نے فخریہ طور پر کہاہے۔

نحن قتلنا داهراو دهورا　　　والخيل تردى منسرا فمنسرا

ہم نے داہراور دہور کوقتل کیااور ہمارے گھوڑسوار دشمنوں کے غول ٹھوکروں سے مارگرار ہے تھے۔

مسلمانوں نےغنیم کوشکست دی اورشہر پرمسلمانوں کاقبضہ ہوگیا۔

جنید بن عمر والعدوانی المکی رحمۃ اللہ علیہ

جنید بن عمر والعدوانی المکی رحمۃ اللہ علیہ اہل مکہ کے ممتاز ومشہور قاری تھے،علم حدیث میں بھی ان کا مرتبہ بڑااونچا تھا،ثقہ اور کثیر الحدیث راوی تھے،آل زبیر بن عوام رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے آزاد کردہ غلام تھے،انہوں نے حمید بن قیس سے روایت کی اور خود ان سے محمد بن عبداللہ بن قاسم نے درس حدیث لیا۔

قرأت مجاہد سے سیکھی ،منقول ہے کہ مکہ مکرمہ میں جنید بن عمرواور عبداللہ بن کثیر سے بڑھ کرکوئی قاری نہ تھے۔

جنید بن عمرو وہ تبع تابعی تھے، جوفتح سندھ کے موقع پرمحمد بن قاسم کے ساتھ وارد بر صغیر ہوئے ،محمد بن قاسم ساوندری کے مقام پر پہنچے تھےتو ہراور میں قیام کیا تھا،ہراور سے انہوں نے جنید بن عمروکوفوج کےایک دستے کا کمانڈر بنا کرمخالفین اسلام کےخلاف جہاد کے لئے بھروچ روانہ کیا تھا۔(رجال السند والہند،ص:۳۷۳،العقد الثمین :۲۱۲،برصغیر میں اسلام کے اولین نقوش:۲۰۵)

محمد بن قاسم کا ہندو رعایا سے سُلک

سندھ کا راجہ اوراس کے ملک کے وہ باشندے جو زمانۂ دراز سے خلافتِ اسلامیہ اورمسلمانوں کے لئے مستقل خطرہ بنے ہوئے تھے ان کا خیال تھا کہ ان پر فتح پانے کے بعد خلافتِ اسلامیہ کا سپہ سالاران کے ساتھ نہایت ہی سختی کا برتاؤ کرے گا، لیکن سندھ کے باشندے یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ دبیل کی فتح کے بعد محمد بن قاسم نے عام معافی کا اعلان کردیا، اس علاقہ کے باشندوں کو مکمل مذہبی آزادی دے دی گئی کہ وہ جس طرح بھی چاہیں عبادت کریں، ان سے کوئی تعرض نہیں کیا جائے گا، اس کے علاوہ شہر کا انتظام خود ہندوؤں ہی کے ہاتھوں دے دیا گیا، چنانچہ دبیل کا حاکم اعلی ایک پنڈت کو بنادیا گیا، جو اس سے قبل جیل خانوں کا محافظ تھا اور جس نے مسلمان قیدیوں کے ساتھ نہایت ہی شریفانہ سلوک کیا تھا، ہندو حاکمِ اعلی کے ماتحت حمید بن ذرائع کو دبیل کا شحنہ یعنی انسپکٹر جنرل آف پولس مقرر کیا گیا اوراس کو ہدایت کی گئی کہ ہندوشہریوں کی جان، مال اور جائداد کی پوری حفاظت کی جائے، چنانچہ دبیل (کراچی) لوٹ ماراور غارتگری سے بالکل محفوظ رہا۔

دبیل کی فتح اورانتظام سے فارغ ہونے کے بعد محمد بن قاسم شہر بیرون کی جانب متوجہ ہوا، لیکن اس شہر کے امراء نے پہلے ہی حجاج بن یوسف کے پاس اپنا ایلچی بھیج کر امان طلب کرلی تھی، ان امراء نے شہر سے باہر آکر محمد بن قاسم اوراس کی فوج کا نہایت ہی پُر جوش خیر مقدم کیا، اور بے اندازہ رسد اور تحائف اسلامی سپہ سالار کی خدمت میں پیش کئے، محمد بن قاسم بھی اُن لوگوں کے ساتھ بڑی محبت اوراخلاق کے ساتھ پیش آیا۔

اس کے بعد محمد بن قاسم نے شہر بھروچ کی جانب رخ کیا، یہاں راجہ داہر کے بھتیجے سے مقابلہ کے بعد یہ شہر بھی فتح ہوگیا لیکن رات کے وقت جاٹوں نے اسلامی فوج پر

شبخون مارنے کی کوشش کی جس میں انہیں کامیابی نہیں ہوئی اور جاٹ گرفتار ہو گئے، جب ان جاٹوں کو محمد بن قاسم کی خدمت میں پیش کیا گیا تو محمد بن قاسم نے ان کو سزا دینے کے بجائے نصیحت کر کے رہا کر دیا، محمد بن قاسم کے اس رحم و مروّت کا یہ اثر ہوا کہ وہ تمام جاٹ بخوشی مسلمان ہو گئے۔

سندھ کے باشندوں کا قبول اسلام

یوں تو اسلام محمد بن قاسم کے حملہ سے قبل ہی سندھ میں پھیلنا شروع ہو گیا تھا، لیکن محمد بن قاسم کے سندھ کی سرزمین پر قدم رکھنے کے بعد سندھ کے باشندوں کی اسلام سے دلچسپی اور بھی بڑھ گئی، اور اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ محمد بن قاسم اور اس کے عمال نے سندھ کے ہندو باشندوں کے ساتھ اس قدر شریفانہ اور نرمی کا برتاؤ کیا تھا کہ ان کے دلوں میں محمد بن قاسم اور مسلمانوں کی عزّت اور محبت خود بخود پیدا ہو گئی تھی، چنانچہ محمد بن قاسم کے سرزمین سندھ پر قدم رکھنے کے بعد سے لیکر فتح ملتان تک سندھ کے لاکھوں باشندے بخوشی اسلام قبول کر چکے تھے۔

محمد بن قاسم نے جس وقت سندھ کا معرکہ شروع کیا تھا اس وقت محمد بن قاسم کے ساتھ بارہ ہزار شامی اور عراقی سپاہی تھے، جن کی بڑی تعداد مختلف جنگوں میں کام آچکی تھی لیکن پھر بھی فتح ملتان کے وقت محمد بن قاسم کی فوج میں پچاس ہزار سپاہی موجود تھے، جس کے معنی یہ ہیں کہ یہ سب کے سب تقریبا نو مسلم تھے، جنہوں نے بخوشی اسلام قبول کرنے کے بعد اپنی زندگیاں اسلامی سلطنت کے لئے وقف کر دی تھیں، محمد بن قاسم کے دور حکومت کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس نے یا اس کے عمال نے کسی ایک ہندو کو بھی اسلام قبول کرنے کے لئے مجبور نہیں کیا، اور اس کی وسیع نظری کا یہ عالم تھا کہ عمال مقرر کرتے وقت اس کے سامنے ہندو یا مسلم کا کوئی سوال نہ تھا، چنانچہ اس نے دیبل یعنی کراچی کا حاکم ایک پنڈت

کو مقرر کیا جو بعد میں بخوشی مسلمان ہوگیا اور مولانا اسلامی کہلایا، اس پنڈت کے علاوہ کاکا،موکا،سی ساگر، کاکساوغیرہ کو غیر مسلم ہونے کے باوجود بڑے سے بڑے عہدے عطا کئے گئے ،محمد بن قاسم کو اپنے ان ہندووزراءاور عمال پر اس قدر اعتماد تھا کہ ان کے مشورہ کے بغیر محمد بن قاسم ایک قدم بھی نہیں اٹھاتا تھا۔

یہ حقیقت ہے کہ محمد بن قاسم نے جس رواداری کا ثبوت دیا ہے، وہ اس کی سیاست دانی کا بہترین نمونہ ہے،محمد بن قاسم کی اس رواداری ، مذہبی آزادی اور حسنِ سلوک ہی کا یہ نتیجہ تھا کہ مٹھی بھر مسلمانوں نے ایک بہت بڑے ملک کے لئے کئی کروڑ باشندوں کو اپنا ہم نوا بنالیا تھا، محمد بن قاسم نے اگر رحم ومروت اور رواداری کے بجائے بزورِ شمشیر لوگوں کو مسلمان کیا ہوتا تو اسے نہ تو اپنی فاتحانہ پیش قدمی میں کامیابی ہوتی اور نہ اس کے چلے جانے کے بعد نومسلم دائرہ اسلام میں قائم رہتے ، چنانچہ محمد بن قاسم کے سندھ سے جانے کے بعد ایک بھی ایسی مثال نہیں ہے کہ کسی نومسلم نے دین اسلام چھوڑا ہو بلکہ دین اسلام کے ماننے والوں کی تعداد محمد بن قاسم کے چلے جانے کے بعد اور بھی زیادہ بڑھتی چلی گئی، محمد بن قاسم نے اپنے دورِ حکومت میں جہاں سندھ کے تمام بڑے بڑے شہروں میں مسجدیں تعمیر کرائیں وہاں مندروں کی تعمیر میں بھی کھلے دل کے ساتھ امداد دی ، غرضکہ محمد بن قاسم ایک ایسا لائق سیاستداں تھا جس کی رواداری کو مسلمانوں کے مخالفین بھی تسلیم کرتے تھے۔

مذہبی رواداری

جادوناتھ سرکار اپنی مشہور تصنیف ’’تاریخ اورنگ زیب‘‘ میں ایک جگہ ضمنی بحث میں یہ لکھ گئے ہیں:-

’’شروع کے عرب فاتحوں خصوصا سندھ کے فاتحوں نے یہ عقلمندانہ اور مفید حکمت عملی

اختیار کررکھی تھی کہ وہ غیر مسلموں کی عبادتگاہوں اور مذہبی مراسم کو مطلق نہ چھیڑتے ، جب وہ کسی شہر پر قبضہ کر لیتے تو وہاں کی غیر مسلم آبادی کو اسلام قبول کرنے کو کہتے ، اگر وہ قبول کر لیتے تو انکو وہی حقوق حاصل ہو جاتے جو فاتحوں کو ہوتے ، ورنہ پھر ان کو جزیہ ادا کرنا پڑتا جس کے بعد انکو اپنے مذہب کے مراسم ادا کرنے کی آزادی ہوتی ۔'' (ج:۳،ص/۲۵۳)

الہ آباد یونیورسٹی کے سابق پروفیسر ڈاکٹر ایشوری پرشاد نے محمد بن قاسم کے کار ناموں پر جہاں تنقیدیں کی ہیں وہاں یہ بھی لکھتے ہیں: سندھ پر محمد بن قاسم کا حملہ تاریخ کی رومانی داستانوں میں سے ایک ہے، اس کی شگفتہ نوجوانی ،اس کی جرأت مندی ،اس کی بہادری اور فوجی مہمات کے درمیان اس کے شریفانہ برتاؤ اور آخر میں اس کے زوال کی المنا کی سے اس کی ذات کے گرد شہادت کا ہالہ دکھائی دیتا ہے، اس نے اپنی نوجوانی میں سپہ گری کا جو جوہر دکھایا اس سے اس کی ذات سے بڑی امیدیں بندھ گئیں ،اسی لیے وہ ہندوستان کی مہم پر بھیجا گیا، حجاج نے اس کے ساتھ چھ ہزار منتخب شامی اور عراقی سپاہی کئے ، اس کی معیت میں اتنے ہی اونٹوں کے مسلح سوار تھے، تین ہزار اونٹوں پر حربی سامان لادے گئے ......محمد مکران پہنچا تو یہاں کے حاکم محمد ہارون نے اور فوجی سامان اور پانچ منجنیق مہیا کیے، جو دبیل بھیج دیئے گئے ،ان عرب سپاہیوں کے علاوہ محمد بن قاسم نے اپنے جھنڈوں کے نیچے ان جاٹوں اور میدیوں کو جمع کیا جو ہندوؤں کی غیر روادارانہ حکومت سے عاجز تھے اور بہت ذلت برداشت کررہے تھے، وہ گھوڑے پر سوار نہیں ہو سکتے تھے، ان کو اچھے کپڑے پہننے کی ممانعت تھی، ان کو ننگے سر رہنے کا حکم تھا، ان ذلتوں سے وہ محض لکڑ ہارے اور پن بھرے بنکر رہ گئے تھے، ان کے دلوں میں ایسا عناد بھرا ہوا تھا کہ انہوں نے اپنی قسمت کو فوراً ایک اجنبی کے سپرد کر دیا۔ (ہسٹری آف مڈیول انڈیا: ص:۵۵-۵۶)

عربوں کی عام رواداری

سندھ میں عربوں اور سندھی عربوں کی حکومت ۹۰ھ سے ۴۱۶ھ تک یعنی ۳۲۶ برس

تک رہی، اس مدت میں زراعت سندھی باشندوں ہی کے سپرد رہی ،کاشتکاروں سے مالگذاری وصول کرنے کیلئے سندھی ہی مقرر کیے جاتے ،انکی ملازمت موروثی ہوتی ،شروع میں مالگذاری عموماً اتنی ہی وصول کی گئی جو وہ پہلے کرتے آئے تھے، ہندؤوں کے رسم ورواج میں کوئی مداخلت نہیں کی گئی ، ہندؤوں کے باہمی جھگڑوں کا فیصلہ انکی پنچایت میں ہوا کرتا تھا، ہندؤوں کی عبادت گاہیں لڑائی کے زمانہ میں تو مسمار ہوئیں یا جن میں بیشمار دولت پوشیدہ رکھی جاتی تھی انکے خلاف فتح وتسخیر کے سلسلے میں فوج کشی ضروری ہوئی مگر امن کے زمانہ میں انکو وہی درجہ دیا گیا جو اسلامی مما لک میں عیسائیوں کے گرجوں اور آتش پرستوں کے آتش کدوں کو دیا گیا تھا۔ڈاکٹر بینی پرشاد لکھتے ہیں:

> ہندوستان میں کسی حکومت کے مقبول ہونے کے لیے ایک ضروری شرط یہ بھی ہے کہ اس کے باشندوں کو مذہبی فرائض انجام دینے اورعبادت کرنے میں آزادی ہو، ہندوستان کے مسلم حملہ آوروں نے مذہبی رواداری کی اہمیت کو بہت جلد محسوس کرلیا تھا، اوراپنی حکمت عملی اسی کے مطابق بنائی،آٹھویں صدی میں محمد بن قاسم نے سندھ میں اپنی حکومت کا جونظم ونسق قائم کیا وہ اعتدال اور رواداری کی روشن مثال ہے۔(ہسٹری آف جہانگیر:ص:۸۸،۸۹)

چوتھا جہادی سفر

جنید کی حکومت

خلیفہ حضرت عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ عنہ کے مقرر کردہ والیٔ سندھ عمر بن مسلم باہلی نے سندھ میں آکر امن وامان قائم کیا، پھر ہندوستان کے ملکوں پر(غالبا دریائے راوی کے آس پاس)حملہ آور ہوااورفتوحات حاصل کر کے واپس گیا،اس کے بعد سندھ کے شمالی علاقہ

سے متصل (قصہ یا کش) کچھ پر حملہ کیا، جو جالندھر سے ملا تھا اور جہاں کے راجہ کو بلہرا (وَلبھی رائے) کہتے تھے، باہلی نے ''آخرکش'' (کچھ) پر فتحیابی حاصل کر لی اور اپنے ممالک مفتوحہ میں اس کو بھی شامل کر لیا۔

۱۰۷ھ میں عراق کے حاکم خالد نے عمر بن مسلم باہلی کو سندھ کی حکومت سے الگ کر کے جنید بن عبدالرحمٰن کو سندھ کا حاکم بنایا۔ (تاریخ سندھ: ۱۲۰، ۱۲۱، ۱۲۵)

جنید کا ماڑواڑ اور گجرات پر حملہ

جنید جے پور (سندھ) سے براہ ریگستان خردمد (ماڑواڑ) میں پہنچا، معلوم ہوتا ہے کہ اس عہد میں یہی راستہ بڑا بارونق اور آباد تھا، یہاں اس نے اپنی فوج کو آرام دیا، کیوں کہ ایسے ریگستانی علاقے کو طے کرنے کے بعد فوج کا آرام لینا نہایت ضروری تھا، غرض یہاں سے عربی فوج چل کر مانڈل پہنچی، یہ مقام آج بھی ویرم گام کے پاس چھوٹا سا گاؤں ہے، ممکن ہے اس عہد میں شہر کی حیثیت رکھتا ہو۔

نقشہ دیکھنے سے میرا خیال ہوتا ہے کہ یہاں پہلی جنگ ہوئی ہوگی، کیوں کہ مرمد پہنچنے کے بعد یقیناً غنیم نے مدافعت کی پہلی کوشش کی ہوگی اور پھر مانڈل میں دونوں عربی فوجوں کا تصادم ہوا ہوگا اور فتح پانے پر ہی آگے بڑھ سکا ہوگا، یہاں سے چل کر جنید ''دھنج'' پہونچا، جو نہروالا پٹن اور پنچاسر کے پاس ہے۔

پنچاسر: چوڑا (چاوڑا) راجہ کا پایۂ تخت تھا، جو گجرات کاٹھیاواڑ اور کچھ کے رن کے درمیان رادھن پور کے پاس تھا، سولنکی (گوجر) کے عہد میں وہی پایۂ تخت رہا، عربوں سے شکست کھانے کے بعد یہ شہر بے رونق ہوگیا، لیکن اصل ویرانی کا سبب یہ ہوا کہ عربوں نے جب سولنکیوں کی طاقت توڑ دی، تو چاوڑا خاندان کا شاہزادہ پھر اٹھ کھڑا ہوا اور آخر بن راج

نے اپنے باپ کی کھوئی ہوئی سلطنت پھر حاصل کر لی اور سیاسی مصالح کی بناء پر انہل واڑہ (نہروالا پٹن) آباد کر کے پایۂ تخت بنایا، جس کے سبب پنچاسر ویران ہو گیا۔

پنچاسر اس عہد میں شمالی گجرات کا پایۂ تخت تھا اور چاوڑا (چوڑا) خاندان سے چھن کر سولنکی (دکن) کے قبضہ میں آ چکا تھا، سولنکی خاندان تمام کاٹھیاواڑ، کچھ، شمالی اور جنوبی گجرات اور دکن کے بڑے علاقے پر قابض تھا اور شہنشاہیت کا درجہ رکھتا تھا، اس خاندان کے حکمران بڑے مغرور تھے، فقط اتنی سی بات پر کہ ایک برہمن شاعر نے اس کے دربار میں چاوڑا راجہ کی بڑی تعریف کی اور اس کے سوال کرنے پر وزیر نے کہا کہ وہ اپنے ماتحت راجاؤں میں سے نہیں ہے، اس ملک پر حملہ آور ہو کر اس ملک کو چھین لیا، اس کا پایۂ تخت کلیان تھا، جو آج بھی نظام کے ماتحت بیدر ضلع میں ایک گاؤں کی شکل میں موجود ہے، اس کی سرحد سندھ سے متصل تھی اور اکثر سرحدی جھگڑے دونوں میں ہو جاتے تھے، افسوس ہے کہ مؤرخوں نے صاف طور پر جنید کے حملہ کے متعلق کوئی سبب تحریر نہیں کیا ہے، مگر غور کرنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ کسی سرحدی تنازعہ کے متعلق سولنکی راجہ نے سخت رویہ اختیار کر لیا تھا اور صورت نازک حالت تک پہنچ گئی تھی اور اسی لئے جنید کو یہاں آنے کی ضرورت محسوس ہوئی، غرض اسی دھنج کے مقام پر دونوں فوجیں جنگ آزما ہوئیں اور گجراتی فوج شکست کھا کر بھاگی اور جنید نے آگے بڑھ کر پایۂ تخت گجرات پنچاسر پر قبضہ کر لیا اور ایک ہی جنگ میں سولنکی طاقت کا شیرازہ بکھر گیا۔

معلوم ہوتا ہے کہ سولنکی فوج یہاں سے بھاگ کر برائے امداد جنوبی گجرات پہنچی اور بھروچ میں جنگی تیاری کرنے لگی، جنید کو جب اس کی خبر ہوئی تو فوراً بھروچ پہنچا اور ایک ہی جنگ میں اس کا بھی خاتمہ کر دیا، اب اس کو معلوم ہوا کہ اُجین (مالوہ) میں حملہ کی تیاریاں

ہورہی ہیں تو اس نے اپنے ایک افسر حبیب نامی کو اس طرف بھیج دیا، جس نے اجین اور مالوہ کو گھوڑوں کی ٹاپوں کے نیچے روند ڈالا، اب فاتح اپنے ملک سے بہت دور نکل آئے تھے اور دشمنوں نے دوسری طرف اسی موقع سے فائدہ اٹھایا ہوگا، یعنی بھیلمان میں جو گوجروں کی ایک بڑی طاقت ان کو روکنے کے لئے جمع ہوگئی، جنید نے دیکھا کہ اب آگے بڑھنے میں خدشہ ہے اور بھیلمان میں اگر گوجروں کی طاقت زیادہ جمع ہوگئی تو واپسی میں دشواری ہوگی، اس لئے بھروچ سے خود بھی بھیلمان کی طرف واپس ہوگیا اور ادھر حبیب نے بھی مالوہ سے بہریمید (ماڑواڑ) اور شہر پناہ پر حملہ آور ہوکر آگ لگادی، فتح یابی حاصل کر کے جنید کے پاس بھیلمان میں جاملا۔ (بلاذری، ص:۴۴۲)

اب تمام فوجیں مجتمع ہوکر بھیلمان پہنچی اور پرزور حملوں سے غنیم کو شکست دی، بھیلمان آسانی سے فتح ہوگیا، اس کے بعد گوجروں نے جہاں کہیں مقابلہ کیا؛ شکست کھائی، جنید ان فتوحات کے بعد سندھ واپس ہوگیا۔

ان فتوحات کی تائید ان کتبوں سے بھی ہوتی ہے، جو اثری تحقیقات کے ماتحت برآمد ہوئے ہیں، یہ چالوکیہ راجہ کے عہد کا نوساری سے دستیاب ہوا ہے، چنانچہ پول کیشی جناشر کے عہد کا ایک کتبہ ہے، جس میں تحریر ہے:

> ''عرب لشکر نے سندھ، کچھ، سوراسٹھ، چاوڑا، موریا (ماڑواڑ یا مالوہ)
> اور بھیلمان کی سلطنت کو حیران کیا۔''

یہ کتبہ (بعہد پول کیشی) ۷۳۸ھ کا ہے، گویا اصل واقعہ سے دس بارہ برس بعد کا ہے، (پراچین اتہاس گجراتی باب وبھی دراسٹر کوٹ) ان فتوحات میں جنید کو اس قدر دولت ہاتھ آئی کہ ملنے والوں اور دوستوں کو دے کر بھی چار کروڑ درہم اس کے پاس بچے رہے اور اسی قدر

اس نے پایۂ تخت کے خزانہ میں داخل کیا، اس حساب سے جنید نے بیس کروڑ درہم حاصل کئے، اس میں پانچواں حصہ خلیفہ کو بھیج دیا، ایک حصہ بچا رہا، باقی تین حصے یعنی بارہ کروڑ روپئے فوج اور احباب میں تقسیم کیا چنانچہ مشہور شاعر جریر کہتا ہے۔

أصبح زوارالجنید واصحبه　　　یحیون صلت الوجه حما مواهبه

''جنید کے ملنے والے اور ساتھی مبارک باد دیئے جاتے، اس حال میں کہ وہ خوش وخرم اور بڑی بڑی بخششوں والے تھے۔''

ابوالجویریہ یہ شاعر کہتا ہے۔

لوكان يقعد فوق الشمس من كرم قوم باحسانهم او مجدهم قعدوا

محسدون علی ماکان من کرم　　　لاینزع اللّٰہ منهم ماله حسدوا

''اگر کوئی قوم اپنی بخشش کے ذریعہ آفتاب کے اوپر بیٹھ سکے، تو بے شک یہ لوگ اپنے احسان اور بزرگیوں کی بدولت اس مرتبہ پر پہنچتے، بزرگی کے سبب زمانہ ان سے حسد کرتا ہے، خدا کرے کہ ان لوگوں سے وہ چیز نہ چھینی جائے، جس کے سبب ان سے حسد کیا جاتا ہے۔''
(تاریخ سندھ:۱۲۹-۱۳۲)

بلاذری جنید کے بارے میں لکھتے ہیں:

اس کے بعد مرمد، مندل، دھنج اور بھروچ میں عمال بھیجے، جنید کا مقولہ ہے: ''مردانہ وار قتل ہو جانا ایڑیاں رگڑ کر مرنے سے بہتر ہے،'' جنید نے ایک لشکر اجین کی طرف اور دوسرا حبیب بن مرہ کی کمان میں مالیہ (مالوہ) بھیجا، پہلے لشکر نے اجین پر چھاپہ مار کر ہریمد (ماڑواڑ) کا رخ کیا اور اس کی شہر پناہ میں آگ لگا دی اور خود

جنید نے بھیلمان اور گجرات کو فتح کیا، یہاں اس کو اتنا مال غنیمت ملا کہ زائرین اور سائلین کو دینے کے بعد بھی چار کروڑ بچ گیا، اتنا ہی مال وہ بیت المال میں بھیج چکا تھا، جنید کے بعد تمیم بن زید عتبی والی ہوئے، تمیم کے بعد پھر حکم بن عوانہ کلبی والی ہوئے، اس وقت کچھ والوں کے سوا تمام اہل ہند باغی اور مرتد ہو چکے تھے اور حکم کو مسلمانوں کے لئے کوئی جائے پناہ نظر نہ آتی تھی، اس لئے انہوں نے دریا کے اس پار ہی سمندر کے قریب ایک شہر آباد کیا اور اس کا نام محفوظ رکھا اور اس کو مسلمانوں کا مستقر اور پناہ گاہ بنا دیا۔

(فتوح البلدان: ۴۲۹-۴۳۱)

اس جنگ میں جنید نے چالیس کروڑ کا مال غنیمت حاصل کیا، کاٹھیاواڑ اور گجرات کے مختلف سرحدی مقامات پر چوکی بٹھادی اور ان کی حفاظت کا بہتر انتظام کیا گیا، یہ ۱۰۷ھ کا واقعہ ہے۔ (راز دار دوست، ہم دم)

قاضی اطہر مبارک پوری رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں: ۱۵ھ سے لے کر ۱۰۵ھ تک سندھ میں مختلف حاکم مقرر ہوتے رہے، چنانچہ پہلے حملہ کے کئی سالوں بعد پھر مملکت بلہرا کے علاقہ گجرات میں مسلمانوں کی سرگرمی شروع ہوئی، اس درمیان مکمل سندھ مسلمانوں کے قبضہ میں آچکا تھا اور اموی حکام سندھ پر حکومت کرتے تھے، ہشام بن عبد الملک نے اپنے زمانۂ خلافت میں ''جنید بن عبد الرحمٰن مری'' کو سندھ کا گورنر بنا کر بھیجا، جنید نے آتے ہی سندھ کے اندرونی حالات درست کئے اور اس کے بعد گجرات کی طرف رخ کیا، پھر مرمد (ماڑواڑ) آیا، پھر یہاں سے مانڈل (متصل ویرم گاؤں) پہنچا اور یہاں سے دھنج پہونچا، جو رادھن پور

اور پنچاسر کے پاس ہے، وہاں سے گجرات کی مشہور بندرگاہ بروص (بھروچ) پر حملہ آور ہوا، پھر ''اجین'' کو فتح کرتے ہوئے ''بھیلمان'' پہنچ کر گوجروں کو مطیع کرتا ہوا سندھ واپس چلا گیا۔ (ہندوستان میں عربوں کی حکومت:۲۸)

اس وقت ولبھی پور کے تخت پر ''شیلادت پنجم'' (۷۲۲ء) اور بھروچ میں ''جے بھٹ سوم'' (۷۰۰ء) راج کررہا تھا اور جنوبی گجرات میں ''چالوکیہ'' خاندان کا تیسرا راجہ ''منگل راج'' (۷۳۱ء) برسر حکومت تھا، سولنکی کی شاخ چالوکیہ خاندان والے ان تمام کے سردار سمجھے جاتے تھے۔

پانچواں جہادی سفر
ہشام بن عمرو التغلبی

جنید کے حملہ کے بعد عربوں نے تقریبا ۳۰ یا ۳۲ سال تک گجرات کی طرف رخ نہیں کیا، ۱۳۲ھ میں عربی حکومت کے دفتر کا ورق الٹ گیا اور اموی کی جگہ عباسی حکومت پر فائز ہوگئے اور دمشق کے بجائے بغداد کو اپنا دار الخلافت بنایا، اس انقلاب نے ہندوستانیوں کو عرب سلطنت سے بہت قریب کردیا، عباسی خلیفہ ابوجعفر منصور (۱۳۲ھ تا ۱۵۸ھ) نے ۱۴۰ھ میں ہشام بن عمرو التغلبی کو سندھ کا گورنر بنا کر بھیجا، ہشام نے آتے ہی سندھ کے اندرونی حالات کو درست کیا اور اس کے بعد گجرات کی طرف متوجہ ہوا، چنانچہ گجرات کے ایک مرکزی مقام باربد (بھاڑ بھوٹ، ضلع: بھروچ) کی طرف عمرو بن جمل کی سرکردگی میں ایک بحری فوج روانہ کی، غالباً اس وقت اس کو کچھ زیادہ کامیابی نہیں ہوئی، اس لئے جلد واپس چلا گیا اور بہت ممکن ہے کہ صرف حالات دریافت کرنے آیا ہو، اس کے بعد ہشام خود جدید تیاری کے بعد جہازوں کا ایک بہت بڑا بیڑا لے کر ''گندھار'' (ضلع: بھروچ) پر آپڑا اور فتح کر کے کچھ دنوں یہاں قیام کیا اور اپنی فتح کی یاد میں ایک مسجد تعمیر کی، یہ سندھ کے علاوہ ہندوستان میں

پہلی مسجد تھی۔(ہندوستان میں عربوں کی حکومت:ص:۲۸)

”ووجه عمرو بن جمل فی بوارج الی باربد والی القندهار فـی السفن ففتحها وهدم البد وبنی موضعه مسجدا. (فتوح البلدان للبلاذری،ص:۴۳۰)

عمرو بن جمل جہازوں کے ذریعہ بھاڑ بھوت پہنچا اور پھر جہاز لے کر قندھار (گندھار) آیا اور اس کو فتح کیا اور مسجد بنوائی۔

یہ وہ زمانہ تھا کہ بھروچ میں گوجروں کی حکومت ختم ہو چکی تھی، خاندان راشٹ کوٹ نے ان کو شکست دے کر ”راج پپلہ“ میں پناہ لینے پر مجبور کر دیا تھا اور جنوب گجرات میں بھی راشٹ کوٹ نے چالوکیہ خاندان کو ہٹا کر حکومت پر قبضہ کر لیا تھا، جب کہ ولبھی پور میں ”شیلا دت ششم“ موجود تھا۔(علماء گجرات کی خدمات حدیث:۶۱-۶۳)

بھروچ پر بحری حملہ

جب ہشام ان جھگڑوں سے فارغ ہوا، تو اس کو توسیع مملکت کا خیال پیدا ہوا، اس نے عمرو بن جمل جیسے بہادر و جواں مرد کو افسر بنا کر ایک کشتیوں کا بیڑا دیا، جو بھروچ کے قریب بھاڑ بھوت بندرگاہ میں جا پہنچا، یہ غالبا حالات دریافت کرنے آیا تھا۔

گندھار پر بحری حملہ

غالباً عمرو بن جمل اس عرصہ میں واپس آ گیا تھا اور اس سے تمام حالات معلوم کر لئے اس لئے ہشام نے جہازوں کے بندوبست کا حکم دیا، جب مکمل اہتمام ہو گیا تو ان کو دریائے سندھ کے بہاؤ پر ڈال دیا، جو وہاں سے چل کر بحر عرب میں آئے اور پھر یہ عرب ضلع بھروچ کی بندرگاہ ”گندھار“ پر حملہ آور ہوئے۔(فتوح البلدان،ص:۴۴۵)

اس حملہ کا سبب کیا تھا؟ میری نظر سے اب تک کسی تاریخ میں نہیں گزرا، لیکن عرب سیاح کے سفرناموں سے معلوم ہوتا ہے کہ اس عہد میں سومناتھ، کچھ، کھنبایت، بھروچ، چیمور، سوپارہ وغیرہ بڑے بندرگاہ تھے اور بکثرت عرب تاجر آتے جاتے رہتے تھے، جب کبھی یہ تاجر لٹ جاتے یا ان کے ساتھ بدسلوکی ہوتی تو دربار خلافت میں اس کی فریاد کی جاتی، اس وقت کبھی براہ راست مرکزی حکومت ایک بیڑا جہازوں کا ان کی حمایت کے لئے بھیجتی اور کبھی سندھ کے حاکم کو اس کی طرف توجہ دلائی جاتی، جس کو وہ خود انجام دیتا، میرا خیال ہے کہ اس وقت بھی یہی معاملہ پیش آیا، کیوں کہ گجراتی تاریخوں سے معلوم ہوتا ہے کہ بھروچ گوجر راجہ کی سلطنت ختم ہوچکی تھی اور خاندان راشٹ کوٹ نے ان کو مار کر راج پپلہ میں پناہ لینے پر مجبور کردیا، اس انقلاب سلطنت کے وقت بھروچ میں جب فاتح قوم داخل ہوئی ہوگی اور لوٹ مچی ہوگی تو بہت ممکن ہے کہ اس بدامنی کے وقت عرب تاجر بھی لٹ لئے گئے ہوں اور ان کی مدد اور حمایت کے لئے یہ فوجی مہم روانہ کی گئی ہو، جیسا کہ ابھی چند سال ہوئے تمام یورپین حکومتوں نے چین کے انقلاب سلطنت کے وقت جنگی بیڑے اپنے تاجروں کی حفاظت کے لئے روانہ کئے تھے اور چوں کہ فاتح قوم کو عربوں سے کبھی واسطہ نہیں پڑا تھا، اس لئے فاتحانہ غرور میں انہوں نے عربوں کے شرائط قبول کرنے سے انکار کردیا ہوگا اور اسی پر جنگ ہوگئی ہوگی۔

جب ہشام نے ان کو شکست دے کر گندھار پر قبضہ کرلیا، اس وقت عربوں کا فوجی تفوق اور بحری قوت کا اندازہ لگا کر راشٹ کوٹ والوں نے صلح کرلی ہوگی، کیوں کہ اس کے بعد عرصہ تک ہم دیکھتے ہیں کہ عربوں نے پھر ادھر کا رخ نہیں کیا۔ ہشام نے گندھار پر قبضہ کرکے وہاں اس وقت تک قیام کیا، جب تک معاملات روباصلاح نہ ہوگئے، وہاں ایک خانقاہ بودھوں کا تھا، جس پر قبضہ کرلیا اور اسے توڑ کر وہاں ایک مسجد تعمیر کی اور غالبًا یہ پہلی مسجد ہے جو گجرات میں تعمیر ہوئی۔ (تاریخ سندھ: ۱۵۷-۱۵۹)

ہشام کے عہد حکومت میں ملک میں شادابی اور خوش حالی آ گئی ،لوگ اس کو برکت سمجھتے تھے،اس نے سرحدوں پر پورا قابو حاصل کر لیا تھا اور تمام معاملات کو مستحکم کر دیا۔

عبد الملک بن شہاب مسمعی کا بھاڑ بھوت پر حملہ

چھٹا جہادی سفر

۱۴۰ھ سے ۱۶۰ھ تک عرب تاجروں کو یہاں کی حکومت سے کوئی شکایت نہیں ہوئی، شاید اسی لئے عرب و گجرات کے تعلقات میں کسی قسم کی کشیدگی کا پتہ نہیں چلتا، البتہ خلیفہ ابو جعفر منصور کے بعد جب اس کا بیٹا مہدی ۱۵۸ھ میں تخت خلافت پر بیٹھا؛ تو اس نے گجرات کے معاملہ میں دل چسپی لی، چنانچہ مہدی نے اپنے خلیفہ بننے کے دوسری ہی سال ۱۵۹ھ میں عبد الملک بن شہاب مسمعی کی سرکردگی میں سرکاری اور غیر سرکاری فوجوں کی ایک بڑی تعداد باربد (بھاڑ بھوت) روانہ کی اور ۱۶۰ھ میں اسے فتح کیا۔ (ہندوستان میں عربوں کی حکومت، ص: ۳۰، علماء گجرات کی خدمات حدیث: ۶۴)

۱۵۹ھ میں غالبًا پھر عرب تاجروں کو گجراتیوں سے شکایت پیدا ہوئی، (گجراتی تاریخوں سے معلوم ہوتا ہے کہ ان دنوں جنوبی گجرات میں خاندان راشٹ کوٹ کے کرشن یا گوبند کی حکمرانی تھی، کرشن کے ایک کتبہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس خاندان کے لوگوں نے بغاوت کر دی تھی اور خاندانی نزاع جو تخت حاصل کرنے کے لئے شہزادوں نے شروع کی تھی، اس سے بدامنی پیدا ہو گئی اور اس لئے کرشن کو بغاوت فرو کر کے حکومت کی باگ اپنے ہاتھ میں لینی پڑی، غالبًا اس بدامنی اور بغاوت میں عرب کے تاجروں کو شکایت پیدا ہوئی، جس کے لئے جہازوں کا بیڑا آیا۔ (پراچین اتہاس، گجراتی)

اس لئے خلیفہ مہدی نے جہازوں کا ایک بڑا بیڑا عبد الملک بن شہاب مسمعی کے

زیر کمان روانہ کیا، تا کہ ان کی شکایت دور کی جائے ، یہ بیڑا ۱۶۰ھ میں بھاڑ بھوت پہنچا، یہ بھروچ سے سات میل مغرب کی جانب ایک کچی بندرگاہ تھی ، جہاں جہاز سمندر کے مدو جزر کے ساتھ آتے جاتے تھے، زمین پر قدم رکھتے ہی عرب فوجوں نے حملہ کر دیا، ان فوجوں میں والنٹیر بھی بہت تھے اور غالبا ان کے افسر ابوبکر ربیع بن صبیح السعدی بصری تھے، جن کو تابعی ہونے کا فخر حاصل تھا، انہوں نے ایک دوسرے کو جہاد کے لئے بڑا جوش دلایا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ گجراتی مسلمانوں کے پر جوش حملوں کو نہ روک سکے۔

گجراتی شہر میں چلے گئے اور پھاٹک بند کر دیا، عرب فوج نے اس سختی سے محاصرہ کیا کہ وہ لوگ عاجز آ گئے، آخر ایک دن عرب فوج بزور شہر میں گھس گئی اور شہر فتح ہو گیا، لوگ بھاگ کر ایک خانقاہ میں پناہ گزیں ہو گئے، غالبا عربوں کو شبہ ہوا کہ یہ بھی کوئی قلعہ ہے، کیوں کہ اس عہد میں بدھوں کے بڑے بڑے دہار (خانقاہیں) اعلی پیمانہ پر قلعہ کی طرح مع فصیل و بروج کے تعمیر کئے جاتے تھے، جس کے نمونے آج بھی برہما میں موجود ہیں، عربوں نے اس کا بھی محاصرہ کر لیا اور جلد فتح ہونے کے خیال سے غالبًا آتشگیر مادے پھینکے، جس سے اس میں آگ لگ گئی ، کچھ لوگ تو اسی میں جل مرے، باقی گھبرا کر جو باہر نکلے وہ تہہ تیغ ہو گئے، اس جنگ میں کل ۲۹ ر عرب شہید ہوئے، اب غالبا معاملات طے پا گئے اور شہر میں امن وامان ہو گیا، مگر سمندر جوش پر تھا، اس لئے فوری واپسی ناممکن تھی، مجبورا کچھ دنوں انتظار کرنا پڑا، جب دو بھادوں جمع ہوتے ہیں جو تقریبا اٹھارہ سال پر ہوتا ہے تو ایک میلہ یہاں لگتا ہے، موسم کے اثر اور لوگوں کی کثرت سے یہاں کی آب و ہوا خراب ہو جاتی ہے اور وبائی امرا ض پیدا ہو جاتے ہیں، (عام طور پر آج تک ایسا ہی مشہور ہے) اتفاقا اس وقت جب کہ عربی فوج مقیم تھی یہی وقت اور موسم تھا، جس کے باعث فوج میں بھی اس کا اثر ظاہر ہوا، یہ مرض منھ

میں ہوتا تھا اوراس قدر زہریلہ کہ جلد مریض کا خاتمہ کردیتا، چنانچہ اس فوج کے ہزار سپاہی شہید ہوگئے، ان شہیدوں میں ابوبکر ربیع بن صبیح السعدی البصری تابعی بھی تھے۔ (الکامل ،ج:٦،ص:٣١)

رُبیّع بن صبیح سعدی بصری رحمۃ اللہ علیہ

رُبیّع بن صبیح سعدی بصری کی کنیت ابوبکر تھی اور ایک روایت میں بتایا گیا ہے کہ ابوحفص تھی، اہل بصرہ سے تعلق رکھتے تھے، لہذا بصری کی نسبت سے شہرت پائی، بنوسعد بن زید مناۃ بن تمیم کے مولی تھے، اس لئے سعدی کہلائے۔

ربیع بن صبیح جلیل القدر تابعی تھے، حسن بصری، حمید الطّویل، یزید رقاشی، ابوالزہیر، ثابت بنانی اور مجاہد بن جبیر وغیرہ حضرات کے حضور زانوئے تلمذ تہہ کیا اور روایت حدیث کی، حصول علم حدیث کے بعد خود مسند تدریس بچھائی اوران سے سفیان ثوری، عبداللہ بن مبارک، وکیع، ابن مہدی اور عاصم بن علی وغیرہ بڑے بڑے محدثین نے حدیث کی سماع وروایت کا شرف حاصل کیا۔

حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے تہذیب التہذیب کی تیسری جلد میں ان کے متعلق مختلف محدثین کی آراء خاصی تفصیل سے بیان کی ہیں، جن کے ذکر کی یہاں ضرورت نہیں ہے، آئندہ اوراق میں اس کو ملاحظہ فرمائیں گے۔

بصرہ کے یہ عالی مرتبت عالم، عابدوزاہداور شب زندہ دار تھے، انہوں نے باقاعدہ جہاد میں حصہ لیا اور عرب مجاہدین کے ساتھ سرزمین ہند میں داخل ہوئے۔

ابن سعد کی روایت کے مطابق اس مرد مجاہد نے بغرض جہاد بحری راستے سے عزم سندھ کیا، سمندر میں وفات پائی اور بحر ہند کے ایک جزیرے میں دفن کئے گئے۔

حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے رامہرمزی کی کتاب ''الفاصل'' کے حوالے سے لکھا ہے

کہ ربیع بن صبیح وہ پہلے شخص ہیں؛ جنہوں نے بصرہ میں کوئی کتاب تصنیف کی،أنــه اول مـن صنف بالبصرة. (برصغیر میں اسلام کے اولین نقوش:۱۲۹،۱۳۰)

ابوبکر ربیع بن صبیح سعدی بصری مولی بنی سعد بن زید مناۃ بن تمیم جلیل القدر تابعی تھے اور خواجہ حسن بصری کے شاگرد، آپ رحمۃ اللہ علیہ کی روایت ابن ماجہ میں جہاد کے متعلق موجود ہے، طبقات ابن سعد میں ہے کہ جہاد کے لئے سمندر کے راستے سے ہند گئے، وفات پا جانے پر جزائر ہند کے ایک جزیرہ میں دفن کئے گئے۔ (طبقات ابن سعد، ج:۷،ص۳۶)

اور''تهذيب التهذيب''میں ہے کہ رام ہرمزی نے فاصل میں لکھا ہے کہ بصرہ میں یہ پہلے مصنف ہیں، اس بیان سے معلوم ہوا کہ ابوبکر ربیع کی وفات خاص بھاڑ بھوت میں نہیں ہوئی؛ بلکہ کسی جزیرہ میں وفات کے بعد مدفون ہوئے۔

واقعہ یوں ہوا ہوگا کہ جب وبائی امراض کی شدت ہوئی ہوگی تو لوگ بندرگاہ اور شہر چھوڑ کر جہاز پر واپس آ گئے ہوں گے اور اس جگہ کے متعدد جزیروں میں سے کسی جزیرہ میں مقیم ہوئے، جہاں انتقال کے بعد یہ دفن کئے گئے۔ (تاریخ سندھ:۱۶۱-۱۶۳)

مہم بڑی زبردست اور منظّم تھی، اس میں براہ راست خلیفۂ مہدی نے دل چسپی لی اور گزشتہ تمام مہمات کے مقابلہ میں یہ مہم کامیاب رہی، اس میں سرکاری فوج، متطوعین کی جماعت اور مرابطین کے گروہ نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا، اساورہ اور سیابچہ بھی بھاری تعداد میں شریک ہوکر اپنے آبائی وطن کو فتح کرنے کے لئے نکلے اور مظفر اور منصور واپس گئے، مگر واپسی پر وبائی مرض اور سمندری طوفان سے اسلامی فوج کو بھاری نقصان برداشت کرنا پڑا، جس کی وجہ سے ہندوستان پر آئندہ فوج کشی کا خیال قدرتی طور سے پر حوصلہ نہیں رہا، پھر اس زمانہ میں سندھ کے اندرونی فتنوں نے ادھر توجہ کرنے کی فرصت نہیں دی۔

ساتواں جہادی سفر

سندھ کے داخلی فتنوں کی وجہ سے ہندوستان کی طرف سے بے توجہی

یہی وجہ ہے کہ بھاڑبھوت کی مہم ۱۶۰ھ کے بعد پھر مملکت بلہراا اور گجرات وغیرہ میں مسلمانوں کی کسی سرگرمی کا پتہ نہیں چلتا، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سندھ کے ناموافق حالات نے خلافت عباسیہ اوراس کے حکمران کو ہندوستان کے ان مقامات کی طرف متوجہ نہیں ہونے دیا، جہاں انہوں نے ابتداء میں تیزی سے مہم جاری کی تھی، بلکہ اس کے بجائے خلافت عباسیہ کو اپنی پوری قوت سندھ کی اندرونی بغاوتوں اورداخلی فتنوں کے فروکرنے میں خرچ کرنی پڑی، سندھ کا علاقہ چونکہ مرکزی خلافت بغداد سے بہت دوری پر تھا، اس لئے خلافت کے مخالفین قرامطہ، خوارج، روافض، اسماعیلی، ملاحدہ وغیرہ ان اطراف کو اپنی معاندانہ سرگرمیوں کا مرکز بنائے ہوئے تھے اورعمان اور بحرین سے لیکر سندھ اور ہندوستان تک ساحلی اور اندرونی مقامات میں ان کی تحریکیں جاری تھیں، یہ سب فتنے مذہب کے نام پر تھے، دوسری طرف اقتدار وغلبہ کے نام پر جگہ جگہ شورش برپا تھی۔ (ہندوستان میں عربوں کی حکومت:ص:۲۳،۲۴،۳۰،۳۱)

اس حملے کے وقت مشرقی شمالی گجرات پر بن راج چاوڑا حاکم تھااور جنوبی گجرات پر راشٹ کوٹ خاندان کی حکم رانی تھی۔

یہ سب حملے عربوں نے لوٹ مار، مال غنیمت اور ناجائز خون بہانے کے لئے نہیں کئے تھے؛ بلکہ عرب تاجر جو کہ قبل مسیح سے بغرض تجارت سواحل گجرات پر آتے جاتے رہتے تھے، ان کو بحری ڈاکوؤں اور چندراجاؤں کی طرف سے بار بار لوٹ مار اور پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑتا تھا اور کبھی کبھی راشٹ کوٹ اور گوجروں کے درمیان جنگوں اور اندرونی شورشوں کے سبب عرب تاجروں کو بڑا نقصان ہوتا تھا؛ نیز گوجر حاکموں کی جانب سے قدیم گجراتی

حاکموں کی طرح عرب تاجروں کے ساتھ بھی صحیح سلوک نہیں ہوتا تھا، یہ اور اس طرح کے مختلف اسباب ووجوہ ہیں ؛ جن کی وجہ سے عربوں کو ان کے خلاف اقدام کرنے کے لئے فوجیں بھیجنی پڑیں، تاکہ امن وامان قائم ہو اور لوگوں کو اس سے نجات ملے۔

سندھ پر عربوں کا قبضہ اور دولت ماہانیہ سندان کا قیام

ان ناگوار حالات کے عین وسط میں بزمانۂ مامون و معتصم بنوسامہ کے ایک آزاد کردہ غلام فضل بن ماہان نے سندھ کی الجھنوں سے ہٹ کر گجرات کے ایک مشہور ومرکزی شہر سندان پر قبضہ جمایا، جس کا پہلے سے نہ خلافت سے کوئی تعلق اور نہ مسلمانوں کا علاقہ تھا، بلکہ گجرات کے مہاراجہ بلہرا کا مقبوضہ علاقہ تھا، نواحیٔ سندان پر قبضہ کرنے کے لئے مسلمانوں نے عہد فاروقی سے لے کر اموی اور عباسی دور تک کوشش کی اور خلیفہ عباسی مہدی نے تو بطور خاص یہاں فوجی مہم روانہ کی ؛ مگر یہاں پر فضل بن ماہان کے ذریعہ قبضہ ہونا مقدر تھا، جس نے یہاں اپنی خود مختار حکومت قائم کر کے دور اندیشی اور سیاسی بصیرت سے کام لے کر براہ راست خلافت عباسیہ سے تعلق قائم کرلیا، جس سے ایک طرف سندان خلافت کے قلم رو میں شامل ہوگیا اور مسلمانوں کی دیرینہ تمنا پوری ہوگئی، نیز خلافت کی خوشنودی مل گئی اور دوسری طرف اس تعلق کی وجہ سے دور دراز علاقوں میں اجانب سے گھری ہوئی یہ چھوٹی سی مسلم حکومت محفوظ و مامون ہوگئی اور یہاں کے غیر مسلم حکمران اور عوام مرعوب ہوگئے، گویا دولت ماہانیہ سندان مسلمانوں کے قدیم خواب کی تعبیر بن کر وجود میں آئی اور خلافت کا ایک علاقہ بن کر ہندوستان میں اسلام اور مسلمانوں کی نمائندہ بنی۔

مامون الرشید کے عہد میں جب کہ موسی برمکی سندھ کا حاکم تھا، یہ واقعہ پیش آیا کہ بنی سامہ کے غلام فضل بن ماہان نے سندان شہر پر قبضہ کرلیا اور خود مختارانہ آزادی سے حکومت

کرنے لگ گیا اور ساتھ ہی یہ ہوشیاری کی کہ خلیفہ مامون الرشید کی خدمت میں ایک ہاتھی بطور نذر کے روانہ کیا اور عریضہ میں اپنی اطاعت وفرمانبرداری کا یقین دلایا۔

اس نے سندان میں عالی شان جامع مسجد تیار کرائی اور مامون عباسی کا خطبہ پڑھا، اس وفاداری کو دیکھتے ہوئے مامون نے بھی اس کی خودمختاری تسلیم کرلی، اس کامیابی کے بعد فضل چین کی نیند سوتا رہا؛ لیکن جلد اس کی وفات ہوگئی اور اس کے تخت کا وارث محمد بن فضل ہوا، محمد بن فضل اولوالعزم حاکموں میں سے تھا، اس نے ستر کشتیاں مہیا کیں اور ایک فوج لے کر مید قوم پر حملہ آور ہوا، فتح حاصل کرکے ایک شہر قالی (کالڑی) کو جا گھیرا، آخر اس کو بھی فتح کرکے آگے بڑھنا چاہتا تھا کہ سندان سے یہ خبر آگئی کہ اس کے بھائی ماہان بن فضل نے شہر پر قبضہ کرلیا، یہ سنتے ہی وہ آگے بڑھنے سے رک گیا اور فوج کو سندان کی طرف واپسی کا حکم دیا، جب سندان کے پاس آیا تو اس خبر کی تصدیق ہوگئی اور اپنے بھائی سے ایسی بے وفائی دیکھ کر بڑا غمزدہ ہوا، اس نے خلیفہ معتصم کے یہاں اپیل کی اور عریضہ کے ساتھ ساکھو (ساگوان) کا ایک ایسا بڑا لمبا اور موٹا ٹکڑا بطور تحفہ کے بھیجا کہ آج تک عراق والوں نے نہیں دیکھا تھا۔

ماہان اپنے بھائی محمد سے زیادہ ہوشیار تھا، خلیفہ کی مدد آنے سے قبل اس نے تمام دیسیوں (سندھیوں) کو اپنا طرف دار بنالیا، محمد کے فوجی سرداروں کو بھی آہستہ آہستہ توڑ کر اپنے ساتھ ملاتا رہا، جب محمد کے پاس تھوڑی فوج رہ گئی اور ماہان کو یقین ہوگیا کہ اب فتح ہماری ہوگی تو اس نے شہر سے باہر نکل کر حملہ شروع کردیا، خلیفہ کے یہاں سے ابھی کوئی حکم نہیں آنے پایا تھا کہ ماہان نے پے در پے حملے کرکے اس کو شکست دی اور محمد گرفتار ہوکر قتل کیا گیا اور پھر اسے سولی دی گئی۔

چوں کہ سندھ اور خلافت دونوں سے والی سندان بے تعلق ہوگیا تھا، اس لئے جب

کچھ دنوں کے بعد ہندوراجاؤں نے اس پر حملہ کیا تو کسی نے اس کی مدد نہ کی اور شہر پر ہندوؤں کا قبضہ ہوگیا، انہوں نے مسلمانوں کی مسجدیں بجنسہ رہنے دیں، جن میں مسلمان نماز ادا کرتے رہے اور جمعہ کے خطبوں میں خلیفۂ بغداد کے لئے دعا بھی کرتے رہے۔ (فتوح البلدان، ص:۴۴۶)

یہ سندان ایک ایسی جگہ واقع تھا؛ جہاں سے مختلف ممالک کو راستے جاتے تھے، ایک طرف کچھ اور دوسری طرف کاٹھیاوار اور گجرات، تیسری طرف راجپوتانہ اور ماڑواڑ، چوتھی طرف سندھ اور ہندوستان، وہ سمندر کے کنارے ایک بڑا بندرگاہ تھا۔ (فتوح السند:۱۷۸-۱۸۰)

دولت ماہانیہ سنجان

مسلمان جغرافیہ نویسوں اور سیاحوں کی تصریح کی رو سے سندھ اور ہندوستان دو الگ الگ ملک ہے اور دونوں میں متعدد چھوٹے بڑے راجہ حکومت کرتے تھے، ابن خُرداذ بہ نے سندھ کے بعد اوتکین نامی ساحلی شہر کو ہندوستان کا پہلا علاقہ شمار کیا ہے، وہ لکھتا ہے کہ مہران (دریائے سندھ) سے اوتکین تک جہاں سے ہندوستان کی ابتداء ہوتی ہے، چار دن کی مسافت ہے اور یاقوت حموی نے قامہل نامی شہر کو بلادِ ہند کا پہلا مقام قرار دیا ہے، اسی طرح اصطخری نے مُدُنِ ہند میں پہلے قامہل کو لکھ کر کھنبایت، سوپارہ، سندان، چیمور، ملتان، جندار اور بسمد کو شمار کیا ہے، یہی سندان (سنجان) دولت ماہانیہ کا دارالسلطنت (پایۂ تخت) ہے، ہندوستان کے اس مغربی جنوبی ساحلی علاقہ پر مہاراجگاں و لبھی رائے کی حکومت تھی، جن کی عمل داری قامہل سے لے کر بلاد کوکن تک عام تھی اور ان میں مذکورہ بالا بڑے بڑے مرکزی شہر تھے، ان کا دارالسلطنت مانکیر (منگرول) تھا، ابوالفضل نے آئین اکبری میں اسے علاقۂ سومناتھ میں شمار کرکے اس کا نام بندر منگلور بتایا ہے، (ج:۲،ص:۱۱۷،۱۱۸) آج کل

اسے منگرور اور مانگرول بھی کہتے ہیں، یہاں کے حکمرانوں کو عرب بلہرا کہتے تھے، موجودہ مہاراشٹر و گجرات کے اکثر ساحلی مقامات پر ان کا قبضہ تھا۔

ہندوستان کے ساحلی علاقوں میں عرب تاجروں کے لئے بڑی کشش تھی، سندھ کے مقابلہ میں یہاں ان کو تجارتی سامان، قسم قسم کی چیزیں زیادہ ملتی تھیں اور سراندیپ اور چین کے تجارتی اسفار میں آتے جاتے، ان کو مہاراجگاں وبلبھی رائے کے دیس سے گزرنا پڑتا تھا، ان وجوہ سے سراندیپ، چیمور، سوپارہ، سندان، تھانہ، بھروچ اور کھنبایت وغیرہ کے قدیم تجارتی تعلقات نے جدید اسلامی تعلقات میں بڑی مدد کی اور طرفین کے قدیم تعارف نے جدید علاقہ کو بہت جلد استوار کر دیا۔

دولت ماہانیہ

سندان کی اس عربی حکومت کا تذکرہ اسلامی تاریخوں میں اس لئے نہ آسکا کہ اس کا وجود و عدم صدر اسلام میں ہوا، جب کہ عام طور سے مسلمانوں کا عمل دخل سندھ ہی میں تھا اور ہندوستان کا یہ علاقہ متعدد بار کوشش کرنے کے باوجود ان کے قبضہ میں نہیں آسکا تھا، اس دور افتاد حکومت پر تقریباً ایک صدی گزرنے کے بعد ابن خرداذبہ، مسعودی، بزرگ بن شہریار رامہرمزی، اصطخری، ابن رستہ، ابن حوقل اور مقدسی بشار وغیرہ نے سندھ اور ہندوستان کی سیاحت کی اور یہاں کا جغرافیہ لکھا، دولت ماہانیہ سندان کے زوال کے چند سالوں بعد سلیمان تاجر (موجود ۲۳۷ھ) اور ابوزید سیرافی (موجود ۲۶۴ھ) نے سندان کا کوئی تذکرہ نہیں کیا ہے، حالانکہ راجہ بلہرا کا ذکر نہایت شاندار طریقہ پر کیا ہے، جس کی حدود مملکت میں یہ مسلم حکومت قائم ہوئی تھی، اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ یہ جغرافیہ نویس اور مؤرخ یا سیاح اسے نہیں جانتے تھے اور ان کی نگاہ سے اس کے نقوش اوجھل تھے، بلکہ ہندوستان اور سندھ کی دوسری چار عرب حکومتوں کی طرح سندان کی اس عرب حکومت کو بھی انہوں نے درخور اعتناء نہیں

سمجھا، جب انہوں نے اپنے دور کی ان حکومتوں کو قابل ذکر خیال نہیں کیا، تو ڈیڑھ سو سال پہلے کی ایک مختصر سی حکومت ان کے نزدیک کیا درجہ رکھتی تھی؟

دولت ماہانیہ کے معاصر عرب شعراء نے اس کی اہمیت و مرکزیت کے پیش نظر اپنے اشعار میں سندان کا تذکرہ کیا ہے اور ان میں سے بعض یہاں آئے ہیں، چنانچہ عباسی دور کا مشہور شاعر بحتری (ابوعبادہ ولید بن عبید متوفی ۲۸۴ھ) اسی زمانہ میں سندان آیا اور اپنے اشعار میں اس کا تذکرہ کیا؛ وہ ملاحظہ ہو:

ولقد رکبت البحرفی امواجه　　　ورکبت هول اللیل فی بیاس

سمندر کی موجوں پر میں نے سواری کی ہے اور دریائے بیاس (پنجاب) کا پورہول رات میں سفر کیا ہے۔

وقطعت اطوال البلاد وعرضها　　　مابین سندان وبین سجاس

اور میں نے شہروں کی لمبی چوڑی مسافتوں کو سندان اور سنجان کے مابین طے کیا ہے۔

ابوالعتاہیہ شاعر کی شہادت

اسی طرح عباسی دور کے مشہور شاعر ابوالعتاہیہ متوفی ۲۱۱ھ نے سندان پر یہ دو اشعار کہے ہیں:

ماعلی ذاکنا افترقنا بسندان　　　وماهکذا عهدنا الاخاء

کس بات پر ہم نے سندان میں باہمی اختلاف کیا، ہم نے تو اس طرح کی بھائی بندی نہیں دیکھی تھی۔

تضرب الناس بالمهند البیض　　　علی غدرهم وتنسی الوفاء

تم لوگوں کو ان کی بے وفائی پر ہندوستان کی شمشیر بُراں سے مار رہے ہو اور ان کی

وفاداری کو بھول گئے۔

ابوالفتح نصر بن عبدالرحمٰن اسکندری کا سندان کو قصبۂ بلاد ہند لکھنا، بحتری کا سندان آنا اور اشعار میں اس کا ذکر کرنا اور ابوالعتاہیہ کے ایک سیاسی اور سرکاری واقعہ پر اشعار کہنا بتا رہا ہے کہ یہاں مسلمانوں کو مرکزیت حاصل تھی اور ہندوستان کے دیگر مقامات کی طرح سندان کوئی غیر اہم مقام نہیں تھا، بنو ہبار کے دارالسلطنت منصورہ کے چار دروازوں میں سے ایک کا نام باب سندان تھا، یہ سندان کی اہمیت و مرکزیت کی کھلی دلیل ہے۔(ہندوستان میں عربوں کی حکومت:۳۵،۳۷،۳۸)

سندان کی دولت ماہانیہ میں صرف تین حکمران گزرے ہیں

(۱) بانیٔ دولت فضل بن ماہان مولی بنی سامہ۔

(۲) درمیانی حکمران محمد بن فضل بن ماہان۔

(۳) اور آخر حکمران ماہان بن فضل بن ماہان۔

فضل بن ماہان کے سندان میں غلبہ حاصل کرنے اور اپنی حکومت کرنے کی تاریخ یہ ہے:

کا ن الفضل بن ماهان مولى بني سامة ، فتح سندان و غلب عليها ، وبعث الى المامون رحمه الله تعالي بفيل ، و كاتبه، ودعا له فى مسجد جامع اتخذه بها.

بنوسامہ کے غلام فضل بن ماہان نے سندان فتح کر کے اس پر غلبہ حاصل کرلیا اور خلیفہ مامون کی خدمت میں ہاتھی بھیجا اور اس سے خط و کتابت جاری کی اور اس کے لئے جامع مسجد میں دعا کی، جسے

اس نے سندان میں تعمیر کیا تھا۔

مامون کی خلافت کا زمانہ ۱۹۸ھ سے ۲۱۸ھ تک ہے، قرین قیاس ہے کہ فضل بن ماہان نے اس زمانہ سے کچھ پہلے یا اسی دوران میں اپنی ریاست قائم کی ہوگی، بلاذری کے الفاظ بتا رہے ہیں کہ اس نے سندان کو فتح کر کے غلبہ حاصل کیا، مگر خیال ہے کہ اس کے لئے فضل کو کوئی بڑی فوج کشی نہیں کرنی پڑی ہوگی، بلکہ مہاراجگان بلہرا اور ان کے عوام کی عربوں اور مسلمانوں سے پرانی عقیدت و محبت نے اس کے لئے زمین ہموار کردی ہوگی، اس واقعہ سے چالیس پچاس سال پہلے سندان کے قریب باربد اور قندھار (بھاڑ بھوت اور گندھار ضلع: بھروچ) میں سندھ کے عباسی گورنر ہشام بن عمرو تغلبی کی فتوحات کے بعد ان اطراف کی زرخیزی اور خوشحالی نے یہاں کے لوگوں کو عربوں اور مسلمانوں کا گرویدہ بنا دیا تھا اور وہ ان کے وجود کو اپنے لئے باعث خیر و برکت سمجھنے لگے تھے، اس لئے انہوں نے فضل بن ماہان کے اقدام کو خوش آمدید کہا ہوگا، اس کا ثبوت بعد میں مقامی غیر مسلموں کا وہ رویہ ہے، جو انہوں نے فضل کے خاندان کی برادرانہ خانہ جنگی میں اختیار کیا تھا کہ ان کے نزدیک جو بھائی حق پر تھا اس کا ساتھ دیا اور سندان سے ماہانیوں کی حکومت کے خاتمہ کے بعد جب اس پر قبضہ کیا تو وہاں کی جامع مسجد کو مسلمانوں کے حوالہ کر کے اس میں نماز پڑھنے اور خلیفۃ المسلمین کے حق میں دعا کرنے کی عام اجازت دی، مملکت بلہرا اور اس کی رعایا کی یہ عالی حوصلگی ہر طرح قابل داد ہے اور آج کل کی حکومتوں اور ان کی عوام کے لئے مشعل راہ ہے، خصوصا ہندوستان کے لئے اس میں بڑی عبرت ہے۔

فضل بن ماہان کے کارنامے

فضل بن ماہان کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے: وہ بنو سامہ کا غلام ہوتے ہوئے

ہندوستان میں ایک خودمختار ریاست کا بانی ہوا، وہ اپنی حوصلہ مندی کا جوہر یوں بھی دکھا سکتا تھا کہ عمان سے نکل کر سندھ میں کہیں غلبہ حاصل کر لیتا، جیسا کہ اس وقت پورا سندھ متغلبین کا مرکز بنا ہوا تھا، مگر اس نے اپنی قابلیت اور بصیرت سے کام لے کر مملکت بلہرا کے قلب میں جگہ بنائی اور وہاں خلافت اسلامیہ اور خلیفۂ اسلام کا نام اونچا کر کے خلیفۂ مہدی کے خواب کو عہد مامونی میں پورا کیا۔

سندان میں جامع مسجد کی تعمیر

اس نے سندان میں ایک عظیم الشان جامع مسجد بنوائی، جس میں مقامی مسلمان جمعہ اور پنج وقتہ نماز باجماعت ادا کرتے اور خلیفہ کے لئے دعا کرتے تھے، اس سے پہلے ابوجعفر منصور کے دور میں اس کے قریب گندھار میں عمرو بن جمل نے فتح کے بعد ایک مسجد تعمیر کی تھی، لیکن سندان کی جامع مسجد اپنی شان وشوکت اور پائیداری کے اعتبار سے بلاد بلہرا میں اسلام کا پہلا قلعہ تھی اور مدتوں اسی شان سے قائم رہی، جس میں مسلمان عبادت اور دعا کرتے رہے۔

عباسی خلافت سے وابستگی

فضل بن ماہان نے دوراندیشی سے کام لے کر اپنی خودمختاری میں بھی خلافت سے وابستگی قائم رکھی اور مامون سے خط وکتابت کر کے اپنی ریاست کو سرکاری طور سے خلافت اسلامیہ کا ایک حصہ تسلیم کرا کر خلیفہ کے نام کا خطبہ اور اس کے حق میں دعائے خیر کا اہتمام کیا، نیز مامون کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے ہاتھی کا تحفہ پیش کیا، جو خلیفۂ بغداد کے لئے بڑا دل چسپ تحفہ تھا، اس طرح فضل بن ماہان نے سندھ کے ابتر حالات میں ہندوستان کے ایک محفوظ و مامون خطہ میں خلافت اسلامیہ اور اسلام کا نام بلند کیا، دیارِ غیر میں مختصر سی مدت

کے اندر بے سروسامانی کے باوجود یہ کارنامہ ایک غلام کے لئے آقائی وسروری کی سند ہے۔

محمد بن فضل بن ماہان

سندان کی یہ حکومت چونکہ شخصی تھی، اس لئے فضل بن ماہان کے مرنے پر اس کا لڑکا محمد بن فضل حکومت کا مالک ہوا، اس کے بارے میں صرف یہ تصریح ملتی ہے:

فلما مات قام محمد بن الفضل بن ماهان مقامه فسار فی سبعین بارجة الی مید الهند فقتل منهم خلقا ، وفتح فالی ثم رجع الی سندان وقد غلب علیها اخ له.

فضل بن ماہان کے مرنے کے بعد اس کا لڑکا محمد بن فضل بن ماہان جانشین ہوا اور ستر جہازوں کا بیڑا لے کر ہندوستان کے بحری ڈاکوؤں کی سرکوبی کے لئے نکلا اور ان کی بڑی تعداد کو ختم کیا، نیز اس نے پالی کو فتح کیا اور جب سندان واپس آیا تو اس کا بھائی سندان پر قبضہ کر چکا تھا۔

حدود سلطنت کی توسیع اور بحری ڈاکوؤں کا صفایا

یہ معلوم نہ ہوسکا کہ اس کے باپ نے کتنے دن حکومت کی، مگر سندان میں اس نے جو حکومت چھوڑی تھی وہ مستقل اور پائیدار ہوچکی تھی، یہی وجہ ہے کہ محمد بن فضل نے حکومت سنبھالتے ہی اس کے حدود بڑھانے اور مزید امن وامان قائم کرنے کی مہم شروع کردی، سندان اہم ترین بندرگاہ تھی، جہاں سے سیراف، بصرہ، عدن، حبشہ، سرندیپ اور چین تک تجارتی جہاز آتے جاتے تھے، اس لئے محمد بن فضل نے اپنے دور میں بحری طاقت جمع کر کے بہت بڑا جنگی بیڑا تیار کیا، اس کی بحری قوت کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ وہ ہندوستان کے ساحلی مقامات پر آباد اور سمندر میں ڈاکہ ڈالنے والے مید یعنی بحری ڈاکوؤں کی سرکوبی کے لئے ستر ہزار جہازوں کا بیڑا لے کر نکلا اور ان کو تہس نہس کر کے بحری امن قائم کیا، ان بحری

قزاقوں کی آبادیاں گجرات سے لے کر سندھ سواحل تک پھیلی ہوئی تھیں، ابن خرداذبہ نے لکھا ہے کہ مہران دریائے سندھ سے ہندوستانی سرحد اوتکلین تک چار دن کی مسافت ہے اور اس پورے علاقہ میں سرکش اور چور آباد ہیں، یہاں سے آگے دو فرسخ پر مید آتا ہے، اصطخری نے لکھا ہے کہ مید قوم مہران سے لے کر ملتان تک آباد ہے اور مہران اور قامہل کے درمیانی میدانوں میں ان کی چراگاہیں اور آبادیاں ہیں، ان علاقوں میں ان کی کثرت ہے، یہ بحری قزاق مالابار، گجرات، سندھ بلکہ سقوطرہ تک کی بحری راہ مسافروں اور تاجروں پر تنگ کئے ہوئے تھے، ان کے پاس بڑی طاقت تھی، بڑے بڑے جہازوں کو لوٹ لینا ان کے لئے معمولی بات تھی، ہندوستان کے راجہ مہاراجہ تک اس قوم سے عاجز تھے، اسی گروہ نے راجہ داہر کے زمانہ میں سندھ میں ایک جہاز کو لوٹا اور اس میں سوار مسلمان عورتوں کو قید کر کے بے شمار مال واسباب پر قبضہ کیا اور راجہ نے ان کے مقابلہ سے معذوری ظاہر کی، جس کے نتیجہ میں محمد بن قاسم نے سندھ پر حملہ کیا، اسی ایک واقعہ سے یہاں کے بحری قزاقوں کی قوت وشوکت کا اندازہ ہوسکتا ہے، مگر محمد بن فضل نے ایک ہی حملہ میں ان کا قلع قمع کر کے سمندری اور ساحلی امن وامان برقرار کیا، ظاہر ہے کہ اس کے اس اہم اور مفید کارنامے کا اثر غیر ملکی تاجروں اور مقامی باشندوں پر نہایت اچھا پڑا ہوگا اور اطراف وجوانب کے راجہ مہاراجہ بھی خوش ہوئے ہوں گے۔

پالی تھانہ سوراشٹر کی فتح

بحری قزاقوں کو شکست دینے کے بعد محمد بن فضل کا فاتحانہ حوصلہ بلند ہوگیا اور اس نے اسی بحری مہم میں پالی کو فتح کر کے سندان کی مسلم ریاست کا حلقہ وسیع کیا، ابن خرداذبہ نے ان اطراف کا ذکر کرتے ہوئے دھنج اور بھروچ سے پہلے فالی (پالی) کا نام لکھا ہے، یہ پالی سوراشٹر میں گھوگھا بندرگاہ کے قریب واقع ہے، ابوالفضل نے آئین اکبری میں لکھا ہے کہ سوراشٹر میں کوہ ستر دنجہ کے دامن میں ایک بہت بڑا قلعہ ہے اور اس پہاڑ کے اوپر پالی تھانہ

کا قلعہ ہے، فی الحال یہ آباد نہیں ہے مگر آبادی کے لائق ہے، یہاں جینیوں کا بہت بڑا مندر بھی ہے، گھوگھا کی بندرگاہ اسی علاقہ سے تعلق رکھتی ہے، غالباً اس زمانہ میں پالی تھانہ کا یہ ساحلی اور پہاڑی علاقہ ان بحری ڈاکوؤں کا مرکز رہا ہوگا، جس پر محمد بن فضل نے قبضہ کر کے ان کا صفایا کیا، اس کے دور حکومت میں اتنے زبردست بحری بیڑے کا ہونا بحری ڈاکوؤں کی سندان سے پالی تھانہ تک سرکوبی کر کے امن وامان قائم کرنا اور سوراشٹر پر قبضہ کر کے پالی کو سندان کے ماتحت لانا، یہ سب وہ عظیم الشان کارنامے ہیں، جن کو صرف محمد بن فضل کی حکومت کا نہیں؛ بلکہ سندان کی دولت ماہانیہ کا حاصل کہا جاسکتا ہے۔(ہندوستان میں عربوں کی حکومت:۳۹-۴۳)

نظام حکومت، مذہب اور خلافت سے تعلق

سندان کے امرائے بنو ماہان اپنے آقا بنوسامہ کی طرح اہل سنت والجماعت میں سے تھے اور جس طرح بنوسامہ، عمان اور ملتان میں اپنی حکومتیں قائم کر کے خلفائے عباسیہ کے نام کا خطبہ پڑھ کر خلافت کے طرفداروں میں سے تھے، اسی طرح ان کے موالی بنو ماہان سندان کے مقبوضہ علاقہ میں خلفاء کے نام کا خطبہ پڑھ کر ان کے حق میں ممبروں پر دعائے خیر کرتے تھے، نیز یہاں کے تین امراء میں سے دو نے اپنے زمانہ کے خلیفہ کے پاس اپنی حیثیت کے مطابق گراں قدر ہدایا وتحائف بھیجے، مرکز خلافت بغداد میں اس حکومت اور اس کے حکمرانوں کا اچھا خاصا اثر اور شہرہ تھا اور ان کی عملداری کو ہندوستان میں خلافت کا ایک حصہ سمجھا جاتا تھا، اس علاقہ سے عباسی خلفاء براہ راست دل چسپی رکھتے تھے، چنانچہ مہدی عباسی نے خلافت سنبھالتے ہی ۱۶۰ھ میں یہاں فوج کشی کرائی اور جب اس کے تقریباً چالیس سال کے بعد بنو ماہان نے اپنی حکومت قائم کر کے اسے عباسی خلافت کی حدود میں شامل کیا، تو خلیفہ مامون نے اسے فوراً تسلیم کرلیا۔

مملکت سندان کی اہمیت اور مرکزیت

سندان موجودہ مہاراشٹر اور گجرات کے درمیانی بمبئی سنٹرل ریلوے اسٹیشن سے شمال کی طرف ۱۴۵ر کیلو میٹر پر اور سورت سے جنوب کی طرف ۱۱۸ر کیلو میٹر پر ایک معمولی اسٹیشن ہے، قدیم عرب جغرافیہ نویس اور مؤرخ اسے سندان لکھتے ہیں، مگر آج کل مقامی زبان میں اسے سنجان کہا جاتا ہے، ابوالفضل نے بھی آئین اکبری میں سنجان ہی لکھا ہے اور اسے جھالہ وارہ کلاں کا پرگنہ بتایا ہے، قدیم زبان میں یہ بلاد ہند کا مشہور شہر اور بندرگاہ تھی اور یہاں بحری تجارت کی عالمی منڈی تھی، قلقشندی نے صبح الاعشی میں لکھا ہے کہ سندان ایک شہر ہے، جو تھانہ سے تین دن کی مسافت پر واقع ہے، اس کا محل وقوع اقلیم اول ہے، طول البلد ۱۰۴ر درجہ اور بیس دقیقہ ہے اور عرض البلد ۱۹ر درجہ اور بیس دقیقہ ہے۔

دیو، دمن، تاراپور اور ماہم کی طرح سنجان پر بھی پرتگالیوں کا قبضہ رہ چکا ہے، اس کے آس پاس تانہ (تھانہ)، صیمور (چیمور)، سوپارہ (نالہ سوپارہ) اسی کی طرح قدیم ساحلی اور تاریخی مقامات ہیں، جس زمانہ کا ہم تذکرہ کررہے ہیں، اس میں ان اطراف میں بلہرا کی حکومت تھی، یہ گجرات کے مہاراجگان ولبھی رائے تھے، جن کا پایۂ تخت مانکیر (منگرول) تھا اور سوراشٹر سے لے کر کوکن تک کے ساحلی بلاد وامصار پر ان کی حکومت تھی، سندان اسی حکومت بلہرا کا نہایت اہم ساحلی شہر تھا، ابوالفداء نے تقویم البلدان میں لکھا ہے کہ سندان سواحل ہند کے شہروں میں بلاد تھانہ سے ہے، یہ مجمع الطرق ہے، یعنی یہاں پر کئی ملکوں کے بحری راستے آکر ملتے ہیں اور یہ سمندر کی اہم ترین بندرگاہوں میں سے ہے۔

سندان اور اس کے اطراف کے علاقے نہایت زرخیز، سرسبز وشاداب تھے اور ہر طرح ارزانی عام تھی، یہاں کی جو پیداوار مقامی ضرورت سے فاضل ہوتی تھی؛ کثیر مقدار میں

غیر ممالک میں روانہ کی جاتی تھی،اصطخری نے قامہل ،سندان ،چیمور اور کھنبایت کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ یہ بستیاں زرخیز،شاداب اور وسیع ہیں، یہاں نارجیل،کیلا اور آم کی پیداوار ہے،کھیتی باری زیادہ تر دھان اور چاول کی ہوتی ہے،شہد بھی کافی مقدار میں ہوتا ہے، البتہ کھجور نہیں ہے، قامہل سے کھنبایت تک میدان ہے ،پھر کھنبایت سے چیمور تک ہندوستان کی مسلسل بستیاں اور آبادیاں ہیں۔

مقدسی بشاری نے احسن التقاسیم میں لکھا ہے کہ سندان کی بندرگاہ،چیمور اور کھنبایت یہ سب سرسبز وشاداب شہر ہیں، یہاں تمام اشیاء بہت ارزاں ہیں اور یہ شہر چاول اور شہد کے دیس ہیں۔

تجارتی اور برآمدی اشیاء

جیسا کہ معلوم ہوا سندان بہت بڑی تجارتی بندرگاہ اور عرب اور چین کے درمیان بحری تجارت کا چوراہہ تھا، یہاں سے بحری راستوں کے ذریعہ دوردور تک تجارتی قافلے آتے جاتے تھے اور یہ شہر تجارتی سامانوں سے پٹارہتا تھا، ابوالفداء کا بیان گزر چکا ہے کہ سندان مختلف سمت کے راستوں کا مرکز ہے، یہ قسط، بانس اور بید کا دیس ہے اور یہ اطراف وجوانب کی بہت بڑی بندرگاہ ہے، یہاں پر چاول ،شہد، نارجیل ، کیلے ،آم ،مرچ ،ساگوان ،قسط ، بانس ،بید بکثرت ہوتے تھے اور بھاری تعداد میں عرب ممالک کو جاتے تھے، دولت ماہانیہ کے آخری حکمران ماہان بن فضل نے خلیفہ معتصم کی خدمت میں یہاں سے ساگوان کی جو لکڑی بھیجی تھی ، وہ جسامت وضخامت میں اپنی مثال آپ تھی ،عرب تاجروسیاح سندان اور کوکن کے دوسرے علاقوں کو بلاد الساج یعنی ساگوان کا دیس کہتے تھے، ابن خرداذبہ کا بیان ہے کہ سندان میں ساگوان اور بانس کی پیداوار ہوتی ہے۔

اسی طرح سندان کی بندرگاہ سے عرب ممالک میں مرچ بھی بھاری مقدار میں جاتی

تھی، ابن خرداذ بہ اور ابن فقیہ ہمدانی نے تصریح کی ہے کہ ملی اور سندان سے مرچ باہر جاتی ہے۔

صنعت وتجارت

سندان صنعتی مقام بھی تھا، یہاں کی کئی صنعتیں عرب ممالک میں مشہور تھیں، خاص طور سے یہاں کے بنے ہوئے جوتے اور کپڑے بڑی شہرت رکھتے تھے، نعال کھنبا تیہ (کھنبایت کے جوتے) اور ثیاب تانشیہ (تھانے کے کپڑے) اگرچہ سندان کی نسبت سے مشہور نہیں تھے، مگر یہاں بھی تیار ہوتے تھے، یہاں کے عمدہ جوتوں کا تذکرہ مسعودی نے مروج الذہب میں اس طرح کیا ہے کہ کنبایت وہی شہر ہے، جس کی طرف آواز والے نعال کنبا تیہ منسوب ہیں، جو عرب ممالک میں آتے ہیں، یہ جوتے کھنبایت اور اس کے قریبی مقامات مثلاً شہر سندان اور سوپارہ میں بھی بنائے جاتے ہیں۔

اسی طرح سندان کے بنے ہوئے ہر قسم کے عمدہ کپڑے بڑی مقدار میں باہر جاتے تھے اور دنیا کے مشہور کپڑوں کا مقابلہ کرتے تھے، مقدسی بشاری نے اپنے زمانے میں یہاں کے کپڑوں کے بارے میں لکھا ہے کہ سندان سے بڑی تعداد میں چاول، کپڑے باہر بھیجے جاتے ہیں، فرش فروش کے مطلب کے ہر قسم کے کپڑے پورے علاقے میں تیار کئے جاتے ہیں، جیسے خراسان کے علاقے قہستان میں بنتے ہیں، نیز سندان سے بڑی تعداد میں نارجیل اور عمدہ عمدہ کپڑے باہر جاتے ہیں۔

بحری تجارت اور غیر ملکی تاجر

سندان اور اس کے اطراف وجوانب کی اس زرخیزی اور ارزانی صنعت وحرفت اور ہر طرح کی تجارتی مرکزیت نے اسے عربوں کی بہت بڑی منڈی بنا دیا ہے اور سیراف، عمان، بحرین اور بغداد وغیرہ سے بڑے بڑے تجارتی جہاز براہ راست سندان آتے جاتے تھے، نیز

ہندوستان کے بانیان (بنئے) اورساہوکاران ممالک میں جاتے تھے، چنانچہ دولت ماہانیہ سندان کے تیس چالیس سال بعد جوسیاح اورجغرافیہ داں اطراف میں آئے انہوں نے ان باتوں کو بیان کیا ہے۔

بزرگ بن شہر یارناخدارامہرمزی نے عجائب الہند میں کئی تاجروں کے حالات لکھے ہیں اوران کی زبانی یہاں کے واقعات نقل کئے ہیں، جوسندان تک آتے جاتے تھے، ایک تاجر کا واقعہ اسی کی زبانی نہایت تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے کہ میں ۳۰۶ھ میں سیراف سے چیمور کے لئے جہاز میں چلا اور ہمارے ساتھ عبداللہ بن جنید اور سبا کے جہاز بھی روانہ ہوئے، تینوں جہاز بہت بڑے تھے، ان کے ناخدا بھی نامی گرامی تھے اور بحری سفر میں ان کی بڑی قدرومنزلت اورشہرت تھی، ان جہازوں میں تاجروں، ناخداؤں، ملازموں اور مختلف طبقوں میں سے بارہ سوآدمی سوار تھے اوران میں اس قدرزیادہ اموال واسباب تھے کہ ان کی مقدارمعلوم نہیں، ہم ان جہازوں میں چلے اور گیارہ دن کے بعد ہمیں پہاڑوں کے آثار، سندان، تھانہ اور چیمور کی جھلکیاں نظر آئیں، مگر ساحل کے قریب آکر یہ تینوں جہاز سخت طوفان میں گھر گئے، جس کی وجہ سے ان کے تمام مسافر اور سارے مال واسباب تجارت سمندر کی نذر ہوگئے اورصرف تین آدمی بچ سکے۔

چیمور کے ہنرمن (قاضی) عباس بن ماہان نے ایک عرب تاجر کا واقعہ بیان کیا ہے کہ اس نے سندان یا چیمور کی بندرگاہ سے ایک جہاز عمان کے لئے روانہ کیا اوراپنے وکیل کی معرفت اس جہاز میں ساگوان کی لمبی چوڑی لکڑی روانہ کی اوراس پر اپنا نام اورنشان لکھ کر کہا کہ تم اسے عمان میں فروخت کر کے میرے لئے فلاں فلاں سامان خرید لینا، اس کے دوماہ بعداس تاجر کوایک آدمی نے خبردی کہ سندان کی کھاڑی میں ایک لمبی چوڑی لکڑی بہہ کرآئی ہے، جس پرتمہارانام درج ہے، وہ تاجر دوڑاہوا گیا اور دیکھا تو یہ وہی لکڑی تھی جوفروخت ہو جانے کے بعدطوفان کی وجہ سے ساحل عمان سے بہہ کر پھرسندان کے کنارے پرآگئی تھی،

حسن بن عمرو نامی ایک عرب تاجر نے قیام سندان کے زمانہ میں یہاں کے ہندوؤں کے چھوت چھات کا واقعہ بیان کیا ہے، جسے بزرگ بن شہریار نے نقل کیا ہے، نیز سندان سے متعلق عرب سیاحوں، تاجروں اور ناخداؤں کی زبانی بہت سے واقعات ملتے ہیں، جن سے پتہ چلتا ہے کہ یہ جگہ کس قدر اہم تھی اور عرب تاجروں کے نزدیک اسے کیا مرکزیت حاصل تھی۔ (ہندوستان میں عربوں کی حکومت: ص: ۴۸، ۵۳، ۵۸-۵۸)

مسلمانوں کی کثیر آبادیاں اور ہر قسم کی مذہبی، معاشی اور معاشرتی آزادیاں

سندان کی ایک شاندار حکومت اور مسلمانوں کے بلند کردار نے مملکت بلہرا کو اپنا وطن بنالیا تھا اور یہاں عوام اور ان کے حکام اسلام اور مسلمانوں سے بے پناہ محبت کرتے تھے، یہی وجہ ہے کہ سندان کی مسلم حکومت کے خاتمہ پر بھی یہ علاقہ خلیفۃ المسلمین کو دعا دیتا رہا اور یہاں کی مسجدوں اور میناروں سے اللہ کا کلمہ بلند ہوتا رہا اور دولت ماہانیہ نے جو صدا بلند کی تھی، اس کی بازگشت مدتوں سنی گئی، مسعودی نے چیمور میں مسلمانوں کی آبادی اور آزادی کے بارے میں لکھا ہے کہ چیمور ہندوستان میں علاقہ لار کا ایک حصہ ہے جو مملکت بلہرا میں واقع ہے، میں بلاد چیمور میں ۳۰۴ھ میں پہنچا، اس وقت وہاں کا حاکم حاج نامی تھا، یہاں تقریباً دس ہزار عرب آباد ہیں، جن میں بیاسرہ، سیرافی، عمانی، بصری، بغدادی اور دوسرے شہروں کے لوگ شامل ہیں، یہ لوگ یہاں متاہل ہوکر مستقل آباد ہو گئے ہیں اور ان مسلمانوں میں بڑے بڑے تاجروں کی ایک جماعت ہے، جیسے موسی بن اسحاق صنداپوری (صنداپور یعنی گوا) اور بیاسرہ سے مراد وہ مسلمان ہیں، جو ہندوستان میں پیدا ہوئے، یہ ان کا لقب ہے، واحد کو بیسر اور جمع کو بیاسرہ کہتے ہیں۔

اصطخری نے لکھا ہے کہ قامہل، سندان، چیمورا اور کنبایت میں جامع مسجدیں ہیں اور

ان شہروں میں مسلمانوں کے احکام جاری وظاہر ہوتے ہیں، نیز اصطخری نے لکھا ہے کہ کنبایت سے چیمور تک بلہرا کی عملداری میں ہے، یہ علاقہ بلاد کفر ہے؛ مگر ان شہروں میں مسلمان آباد ہیں اور بلہرا کی طرف سے ان کا حاکم صرف مسلمان مقرر کیا جاتا ہے، ان شہروں میں مسجدیں ہیں، جن میں جماعتیں ہوتی ہیں۔

یاقوت حموی نے چیمور کے بیان میں لکھا ہے کہ یہ شہر راجہ بلہرا کی عملداری میں ہے جو کافر ہے، مگر چیمور اور کنبایت ان شہروں میں سے ہیں، جن میں مسلمان موجود ہیں اور راجہ بلہرا کی طرف سے ان کا حاکم ووالی صرف مسلمان ہوتا ہے، ان میں جامع مسجدیں ہیں، جن میں نماز باجماعت ہوتی ہے۔

اسی تھانہ کے ذکر میں لکھا ہے کہ اس ساحل کے تمام باشندے کافر ہیں، جو بتوں کی پوجا کرتے ہیں، مگر ان کے ساتھ مسلمان بھی رہتے سہتے ہیں۔

اسی طرح قامہل کے بارے میں لکھا ہے کہ یہاں کے مسلمانوں کی جامع مسجد ہے، جس میں وہ باقاعدہ نماز پڑھتے ہیں۔

ان تصریحات سے معلوم ہوتا ہے کہ سندان اور اس کے اطراف میں مسلمانوں کی اچھی خاصی آبادیاں تھیں اور وہ ہر طرح مطمئن ہو کر اپنے مذہب پر عمل کرنے میں پوری طرح آزاد تھے، ان کے لئے مہاراجگان بلہرا کی طرف سے خصوصی آسانیاں فراہم تھیں، نیز یہاں کے عوام غیر مسلم اپنے یہاں کے مسلمانوں کا بہت خیال کرتے تھے۔

اطراف سندان کی جوامع ومساجد اور اسلامی آثار

ہماری تحقیق میں اطرافِ سندان یعنی تھانہ، چیمور اور بھروچ وغیرہ کوکن اور گجرات کے مقامات نے سب سے پہلے بڑھ کر اسلام اور مسلمانوں کا استقبال کیا اور ان کے مقدس

قدم سب سے پہلے اسی خوش قسمت خطۂ ہندوستان پر آئے۔

اصطخری نے ۳۴۰ھ کے حدود میں قامہل، سندان، چیمور اور کنبایت میں جامع مسجدوں کا تذکرہ کیا ہے، جن میں اسلامی عبادات کھلے بندوں جاری تھیں، یاقوت حموی نے چیمور کے بیان میں تصریح کی ہے کہ جامع مسجد تھی، جس میں نماز باجماعت ہوتی تھی، نیز اس نے قامہل کی جامع مسجد کا ذکر کیا ہے، جس میں باقاعدہ نماز ہوتی تھی، تھانہ کے بارے میں لکھا ہے کہ ان سواحل میں غیر مسلموں کے ساتھ مسلمان بھی آباد ہیں، ظاہر ہے کہ مسلمانوں کی ان بستیوں میں مسجدیں بھی رہی ہوگی اور یہ تمام مسجدیں دولت ماہانیہ کے قیام کے بعد بنی ہوگی، مسعودی نے ۳۰۳ھ میں ان علاقوں کی سیاحت کی ہے اور لکھا ہے کہ یہاں کے مسلمانوں کی تعمیر کردہ عام مسجدیں اور جامع مسجدیں نمازیوں سے آباد رہتی ہیں۔ (ہندوستان میں عربوں کی حکومت: ۶۲-۶۴)

حرمین شریفین اور گجرات کے تعلقات

سلطان محمود بیگڑہ نے مکہ میں ایک رباط تعمیر کی تھی، جس کا نام الکنبایتیہ رکھا گیا تھا اور جس میں طلباء کو دینی تعلیم دی جاتی تھی، نیز ان کے اخراجات کے لئے وظیفوں کا بھی انتظام کیا گیا تھا، سلطان محمود کے بیٹے اور تخت کے وارث سلطان مظفر شاہ دوم نے مکہ میں ایک ایسی رباط تعمیر کروائی تھی؛ جس میں ایک مدرسہ، پانی کی سبیل اور دیگر عمارتیں شامل تھیں اور جن کے مصارف کے لئے یہاں گجرات میں زمین اور جاگیر کی صورت میں اوقاف قائم کئے تھے، جن کی آمدنی کی رقومات حج کے دنوں میں حجاز بھیجی جاتی تھیں، ان رقومات کو مدرسوں، طالب علموں، خدمت گاروں وغیرہ میں تقسیم کیا جاتا تھا، ان کے علاوہ حرمین شریفین کے باشندوں پر بھی خرچ کیا جاتا تھا، سلطان مظفر شاہ دوم اچھے کاتب بھی تھے، انہوں نے اپنے ہاتھ سے خط

ثلث میں، آب زر سے کتابت کئے ہوئے کلام پاک کے دو نسخے حجاز اس لئے بھیجے تھے کہ وہاں ان کا دور کیا جائے، سلطان نے حرمین کے قاریوں کے وظائف کی ادائیگی کے لئے بھی الگ اوقاف قائم کئے تھے، جن کی آمدنی کی رقومات قاریوں کے علاوہ، ختم قرآن کریم کے موقع پر سلطان کے لئے دعائیں کرنے والوں، ان کے خادموں؛ نیز دیگر عملے کو بھی دی جاتی تھیں، حرمین شریفین کے باشندوں کے لئے رقومات بھیجنے کے علاوہ سلطان کی طرف سے ہر سال قیمتی ہندوستانی کپڑوں اور اشیاء سے لدے ہوئے جہاز بھی جدہ بندرگاہ بھیجے جاتے تھے۔

سلطان محمود سوم جو گجرات کے آخری قابل ذکر سلطان ہیں، انہوں نے بھی اپنے اجداد کی روایتوں کو قائم رکھتے ہوئے مکہ مکرمہ میں مولد النبی صلی اللہ علیہ وسلم کے قریب سوق اللیل میں ایک ایسی رباط قائم کی تھی، جس میں ایک قدیم پانی کا چشمہ بھی تھا، اس میں مدرسہ، پانی کی سبیل، یتیم خانہ اور اقامتی کمرے بنے ہوئے تھے، انہوں نے ایک اور رباط باب العمرہ کے قریب اور ایک سبیل شاہراہ جدہ پر بھی تعمیر کی تھی، علم اور علماء کی سرپرستی کے سلسلہ کا ان کا بہترین کارنامہ تو وہ ہے کہ حضرت شیخ علی متقی رحمۃ اللہ علیہ جو گجرات کے اعلی پایہ کے بزرگ اور عالم حدیث وتفسیر تھے، ان کی اقامت گاہ اور اس کے ساتھ تعلیمی درجات اور طلباء کے لئے رہائشی کمرے بھی بنائے تھے، یہ سب عمارتیں سوق اللیل میں تعمیر کی گئی تھیں، سلطان محمود نے حرمین شریفین کے ہر طرح کے جملہ اخراجات کے لئے گجرات میں کھمبایت اور بھروچ کے قریب گندھار بندرگاہوں کے آس پاس کے گاؤں وقف کئے تھے، جن کی سالانہ آمدنی ایک لاکھ اشرفیوں (سونے کے سکوں) کے برابر تھی، ان رقومات سے مال تجارت مثلاً نیل، کپڑا وغیرہ مقامی طور پر خرید کر شاہی جہازوں میں لاد کر گھوگھا بندرگاہ سے

جدہ کے لئے سرکاری خرچ پر روانہ کیا جاتا اور وہاں بازار میں فروخت کرکے جو رقم حاصل ہوتی وہ اتنی ہوتی کہ سال بھر کے اخراجات کے لئے کافی ہوجایا کرتی تھی، اسی سلطان مظفر شاہ سوم نے اپنی شہادت سے پیشتر ایک ہزار سنڈا (ٹوکرے) نیل حجاز بھیجی تھی؛ تاکہ اس کی آمدنی سے وہاں شاہراہ مدینہ پر کویں کھودے جاسکے۔

سلاطین کے علاوہ گجرات کے امیروں نے بھی علماء دین کی سرپرستی اور خاص طور سے عرب ممالک سے آنے والوں کی ہمت افزائی کرنے میں کوئی کسر اٹھانہیں رکھی تھی، گجرات کے علم پرور امراء میں ریحان بجلی خان (متوفی ۹۷۹ھ/ ۱۵۷۱ء) رجب خداوند خان (متوفی ۹٦۸ھ/ ۱۵٦۰ء) شیخ سعدی سلطانی (جو سیدی سعید کے نام سے اور احمد آباد کی تاریخی مسجد یعنی جالی والی مسجد کے بانی کی حیثیت سے مشہور زمانہ ہیں) اور محمد الغ خان کا شمار ہوتا ہے، گجرات کا ایک وزیر آصف خان تو خاص طور سے قابل ذکر ہے، سلطان بہادر شاہ نے گجرات پر ہمایوں کے حملہ کے پیش نظر، اپنے وزیر آصف خان کو بیگمات اور کنبے کے تمام افراد کو لے کر حجاز بھیج دیا تھا، آصف خان نے مکہ میں دس سالہ طویل قیام کے دوران وہاں کے علماء کی حتی المقدور اعانت اور نصرت کی تھی، آصف خان نے مکہ مکرمہ میں باب العمرہ کے قریب مدرسہ قائم کیا، جس میں حنفی اور شافعی مسلکوں کی تعلیم کا انتظام تھا، اس مدرسہ کے ناظم کے طور پر مکہ مکرمہ کے اس وقت کے مفتی اور شافعی عالم شیخ عبدالعزیز زمزمی اور محدث، مؤرخ ومصنف ابن حجر ہیثمی کو مقرر کیا گیا تھا، شہاب الدین احمد بن حجر نے آصف خان کے سوانح ''حیات ریاض الرضوان'' نامی کتاب میں لکھے ہیں، آصف خان کے ۹۵۵ھ/ ۱۵۴۸ء میں گجرات واپس لوٹنے کے بعد بھی شیخ عبدالعزیز زمزمی جب کبھی اپنا کلام حجاز سے آصف خان کو ارسال کرتے تو یہ مخلص اور قدردان امیر ان کو برابر ۱۵۰۰/ اشرفیوں کا ہدیہ روانہ کرتے

تھے، آصف خان کی وفات (۹۶۱ھ/۱۵۵۳ء) کی خبر جب مکہ پہنچی تو وہاں حزن وملال کا ایک بادل سا چھا گیا اور شیخ زمزمی نے ۸۷/اشعار کا ایک مرثیہ بھی لکھا۔

سلاطین عثمانی (خادم الحرمین شریفین) کی گجرات سے دلچسپی

ہندوستان کی مرکزی حکومت لودیوں کے کمزور ہاتھوں میں تھی، دکن اور گجرات میں طوائف الملوک حکمران تھے، انہی بیچاروں نے مل ملا کر اپنی بحری قوت کو یکجا کیا، عرب کی طرف سے مصر کی آخری عباسی خلافت کے قائم مقام سلطان قانصوغوری نے اپنے جہازات بھیجے، سلطان محمود گجراتی، سلطان محمود بہمنی، سلطان یوسف عادل شاہ اور راجۂ ملبار نے بھی اپنے بیڑوں کو شامل کیا، لیکن بدقسمتی سے اس متحدہ قوت نے بھی ان سے شکست کھائی، یہ سب کچھ ہو ہی رہا تھا کہ سلطان سلیم نے مصر وعرب کی حفاظت کا بار اپنے مضبوط کندھوں پر اٹھالیا۔

سلطان سلیم اپنے اعلان خلافت کے بعد صرف تین برس زندہ رہا، ۹۲۶ھ میں سلطان سلیمان اعظم اس کا جانشین ہوا، جس نے اپنے باپ کی مذہبی بلند حوصلگی کے خواب کو پورا کردیا، دنیائے اسلام کے دوسرے ملکوں کی طرح ہندوستان نے بھی اس کی خلافت اور مذہبی عظمت کو تسلیم کیا، اس کا اثر سب سے پہلے گجرات کے سلاطین پر پڑا، جن کے عرب اور دیگر ممالک اسلامیہ سے براہ راست تعلقات تھے۔ (مقالات سلیمانی: ۱/۱۵۳)

گجرات کے ایک محدث وعالم محمد بن عمر آصفی الغخانی جن کی آمد ورفت مکہ معظّمہ میں رہا کرتی تھی اور جو سلاطین گجرات کے درباروں میں بھی معزز تھے، انہوں نے عربی میں ظفر الوالہ کے نام سے گجرات کی ایک تاریخ لکھی ہے اور جس کو گورنمنٹ آف انڈیا نے چھاپ کر شائع کیا ہے، اس تاریخ میں گجرات کے بلکہ ہندوستان کے مایۂ ناز محدث شیخ علی متقی مہاجر صاحب کنز العمال کے حالات میں ہے کہ جب وہ ہندوستان چھوڑ کر عرب گئے اور

سلطان سلیمان کے کانوں تک ان کی شہرت پہنچی تو سلطان نے ان سے دعا کی آرزو کی، اس تقریب سے شیخ محمد آصفی سلطان سلیمان کا نام اپنی زبان پر لاتے ہیں اور اس کے بعد لکھتے ہیں:

وکان فی وقته سلطان الاسلام علی الاطلاق والخلیفة للّٰه فی الآفاق وھو سلیمان خان.

اس وقت ٹرکی کا بادشاہ اسلام کا سلطان علی الاطلاق تھا اور تمام دنیا میں خدا کا خلیفہ تھا اور وہ سلیمان تھا۔

علامہ قطبی نہروالی (گجرات) نے جو مکہ میں سلطان گجرات کے مدرسہ میں مدرس تھے، اپنی تاریخ اعلام بیت اللہ الحرام میں جو چھپ گئی ہے، بیسیوں جگہ سلیمان اور اس کے بعد کے سلاطین کو خلفاء اور امراء مؤمنین کہہ کر خطاب کیا ہے۔

سلاطین گجرات نے پرتگالیوں کی نئی توپوں اور جہازوں کے سامنے اپنے کو بے دست و پا پاکر آخر آستانۂ خلافت کی طرف رجوع کیا، ہندوستان کے سمندروں میں یہ حوادث اور سانحے پیش آرہے تھے کہ اس کے میدانوں میں بابر اپنی ہزار کی جمعیت سے آموجود ہوا اور دم کے دم میں لودیوں کی بساط الٹ کر ہندوستان کا بادشاہ بن گیا۔

۹۳۷ھ میں بابر نے وفات پائی اور ہمایوں نے تخت حکومت پر قدم رکھا، ایک قیدی شاہزادہ نے بھاگ کر سلطان گجرات کے یہاں پناہ لی، اس تقریب سے ہمایوں کو گجرات پر حملہ کرنے کا موقع ہاتھ آیا، اب گجرات دونشانوں کے بیچ میں تھا، خشکی کے راستہ سے ہمایوں حملہ آور تھا اور دریائی راستہ سے پرتگالی سواحل کو برباد کررہے تھے، سلطان گجرات نے پرتگالیوں کے مقابلہ میں آستانۂ خلافت سے جو امداد طلب کی تھی، وہ روانہ ہو چکی تھی، سلیمان پاشا کی قیادت میں ترکی جہازات کا بیڑا عرب کے سواحل پر نمودار ہوا اور یمن کے سواحل کے

انتظامات سے فارغ ہوکر۹۴۲ھ میں ہندوستان کے بندرگاہ کی طرف روانہ ہوا، یہاں پہنچ کر اس نے پرتگالیوں کا قلع قمع شروع کردیا، لیکن پاشا نے غلطی یہ کی کہ اپنے طرز سے ہندوستانیوں پر یہ ظاہر کیا کہ وہ گویا ہندوستان کی فتح کے ارادہ سے آیا ہے، گجرات کے سلطان نے یہ دیکھ کر اپنی امداد واعانت اور رسد کا انتظام موقوف کردیا، نتیجہ یہ ہوا کہ سلیمان پاشا اپنے افسروں، توپوں اور دوسرے سامان جنگ کو چھوڑ کر یمن واپس چلا گیا، پرتگالیوں نے پھر سر اٹھایا، ادھر ہمایوں کی فوجیں بڑھتی چلی آتی تھیں، سلطان نے پرتگالیوں سے صلح کر کے گجرات کے بہت سے بہادران کے حوالے کردیئے۔

''مؤرخین کی تاریخ عالم'' میں ہے کہ اس زمانہ میں سلاطین عثمانیہ ہندوستان کے معاملات میں دل چسپی لینے لگے تھے، ۱۵۳۸ء میں دہلی کے سلطان سکندر کا بیٹا ہمایوں کی شکایت لے کر قسطنطنیہ سلطان کے پاس پہنچا، بہادر شاہ گجراتی کے دربار سے ایک سفیر پرتگیزوں کے مقابلہ میں اعانت طلبی کے لئے حاضر ہوا، جنہوں نے کچھ دنوں پہلے دیو (دیپ) کا بندر بہادر شاہ ظفر سے چھین لیا تھا، سلطان نے مصر کے پاشا کو حکم دیا کہ وہ جہازوں کا بیڑا لے کر ہندوستان جائے اور وہ بندرگاہ ان سے واپس لے لے لیکن اس سے پہلے کہ جہازات روانہ ہوں، یہ خبر پہنچی کہ بہادر شاہ ظفر پرتگیزوں کے ہاتھ مارا گیا، بادشاہ نے اپنا خزانہ گجرات سے مکہ معظّمہ منتقل کردیا تھا، اس کے مرنے پر وہ قسطنطنیہ بھیج دیا گیا، ۱۵۴۶ء میں ہندوستان کے ایک بادشاہ علاء الدین کی طرف سے ایک سفیر قسطنطنیہ اس غرض سے آیا کہ پرتگیزوں کے مقابلہ میں سلطان کی امداد حاصل کرے، ۱۵۵۱ء میں پیری رئیس (ترکی کپتان) نے مسقط اور ہرمز پر قبضہ کرلیا اور اس کے نائب مراد نے اسی جزیرہ کے سامنے پرتگیزوں سے ایک جنگ کی اور ناکام رہا، ۱۵۵۳ء میں سیدی علی نے خلیج فارس میں بصرہ کے قریب ان کا پھر مقابلہ کیا اور شکست کھائی اور بالآخر گجرات کے بندر میں پناہ لی۔

اس تاریخ کے مصنفین نے ان چند سطروں میں جن واقعات کی طرف اشارہ کیا، گجرات کی تاریخوں میں یہ بیانات مفصل موجود ہیں، لیکن ان کی تفصیل کا یہ موقع نہیں، صرف اتنا کہنا ہے کہ بہادر شاہ گجراتی کے پاس جو بھاری توپ خانہ تھا، وہ انہی ترکوں کا عطیہ یا متروکہ تھا، رومی خان اور توپ خانہ کے دوسرے تجربہ کار افسر سب ترکی تھے اور انہی لوگوں کے ذریعہ سے ہندوستان میں توپ سازی کا فن رواج پذیر ہوا، بہادر شاہ ظفر نے ہمایوں اور پرتگیزوں کی دوہری آگ میں پھنس کر جان دی، اس کا ارادہ تھا کہ وہ ہندوستان سے ہجرت کر جائے، اسی لئے اس نے اپنا خزانہ اپنے معتبر افسروں کی معرفت مکہ معظّمہ بھیج دیا تھا، اسی اثناء میں پرتگالیوں نے بعض قلعے بنا لئے تھے، ان سے نامہ و پیام کر رہا تھا، ان کے پاس تنہا بعض درباریوں کو لے کر جہاز پر چلا گیا، انہوں نے دھوکہ سے موقع پا کر مار ڈالا۔ (رحمہ اللہ تعالیٰ)

بہادر شاہ ظفر کے بعد ۹۴۵ء میں محمود شاہ گجرات کا بادشاہ ہوا، اس کے زمانہ میں سلطان سلیمان نے سلیمان پاشا کو بیڑا دے کر پھر ہندوستان سے پرتگیزوں کے نکالنے کو بھیجا، سلیمان پاشا کے بیڑے کو شکست ہوئی، اس کی وجہ ظفر الوالہ کے مصنف نے تو یہ بتائی ہے کہ پاشا امرائے گجرات سے مشورہ نہیں لیا کرتا تھا، اس لئے انہوں نے رسد بند کر دی تھی؛ لیکن ''روح الروح'' کے مصنف کا بیان ہے کہ ہم نے بعض ثقات سے سنا ہے کہ پاشا کو ہندوستان کے بادشاہوں نے بہت سے روپئے دیئے کہ واپس چلا جائے، بہر حال پاشا جب قسطنطنیہ واپس گیا تو اس سے جواب طلب ہوا، سلطان نے غضب ناک ہو کر کہا:

ما أرسلتك الا لاخراج الفرنج من الديو و نصره لصاحبها لاسلاطة على المسلمين بالهند.

میں نے تجھ کو دیپ سے فرنگیوں کو نکالنے کے لئے بھیجا تھا،

ہندوستان میں مسلمانوں پر بادشاہ بنا کر نہیں بھیجا تھا۔ (ظفر الوالہ، ص: ۹۴۵)

بہادر شاہ گجراتی کا وزیر آصف خان جو نہایت لائق و فاضل اور محدث تھا، سلطان کی طلب پر اڈریانوپل حاضر ہوا، دربار میں پہنچ کر سلطان کے ہاتھوں کو اپنی آنکھوں سے لگایا، سلطان نے بھی اس کی بڑی عزت و توقیر کی اور دریافت کیا کہ تمہاری کیا آرزو ہے؟ جس کو میں پوری کرسکتا ہوں۔

خان نے ہندوستان کے وقار کو صدمہ نہیں پہنچایا، صرف ہندوستان واپس جانے کی اجازت چاہی اور حرم محترم میں کوئی اعزازی عہدہ حاصل کیا، سلطان نے سب سے دل چسپ سوال یہ کیا کہ تمہاری مملکت کی بربادی کا سبب کیا ہوا؟ خان نے فلسفۂ تاریخ سے اس کا عمدہ جواب دیا۔

سیدی علی رئیس (کپتان) جس کا اس سے پہلے ترکی بیڑے کے افسروں میں ذکر آچکا ہے، وہ بھی ان لوگوں میں تھا جو بیڑے کو لے کر قسطنطنیہ واپس نہ جاسکے تھے، سیدی علی نے خشکی کا راستہ اختیار کیا، وہ پورے ہندوستان کو ناپ کر افغانستان وایران وترکستان ہوکر قسطنطنیہ واپس گیا اور مرأۃ الممالک کے نام سے اپنا سفرنامہ مرتب کیا، اس کا ترجمہ جرمن اور انگریزی زبانوں میں شائع ہوا ہے، انگریزی میں پروفیسر دمیری نے اس کا ترجمہ کیا ہے، مگر پروفیسر موصوف نے اس ترجمہ کے حواشی میں سخت غلطیاں کی ہیں، اسی نسخہ کا ترجمہ کارخانۂ وطن لاہور نے کیا ہے جو اور زیادہ مسخ اور غلط ہے، سفر یورپ میں روم میں ایک ترکی ادیب رؤوف احمد بے اڈیٹر اخبار استقلال قسطنطنیہ سے ملاقات ہوئی، موصوف نے اثنائے گفتگو میں فرمایا کہ قسطنطنیہ میں اصل سفرنامہ چھپ گیا ہے، میں نے باصرار اس کتاب کی ان سے

خواہش کی؛ لیکن اب تک یہ آرزو پوری نہیں ہوئی، بہرحال اس وقت یہی اردو ترجمہ میرے پیش نظر ہے، سیدی علی نے اس سفرنامہ میں ہمایوں اور ہندوستان کے دوسرے بادشاہوں سے ملاقات کا حال لکھا ہے، جس سے اس زمانہ کے ہندوستان کا مسئلۂ خلافت سے تعلق ظاہر ہوگا۔

سیدی علی کا بیان ہے:

''جب وہ بلوچستان کے بندر گوادر پر پہنچا، تو وہاں کے حاکم نے ہمارے جہاز پر آکر ہمارے بادشاہ (سلطان) کی نسبت اظہار عقیدت مندی ووفاداری کیا اور وعدہ کیا کہ آئندہ کبھی ہمارا بیڑا اس جانب سے گزرا تو وہ پچاس ساٹھ کشتیاں سامان رسد وغیرہ نذر کرنے کے علاوہ ہر قسم کی امداد دینے کو تیار رہے گا۔

سورت میں مسلمان ہمیں دیکھ کر نہایت خوش ہوئے، کیوں کہ وہ ہمیں کفار کے ہاتھوں سے بچانے والا خیال کرتے تھے اور ہم سے یوں مخاطب ہوئے: ''ہم صدق دل سے دعائیں کررہے تھے کہ خداوند کریم اپنے فضل وکرم سے عثمانی بیڑے کو گجرات میں پہنچادے اور عثمانی سلطنت کے اس علاقہ کو مامون ومحفوظ کرکے ہمیں ہندوستانی کفار کے پنجہ سے نجات دلائے۔''

احمد آباد پہنچ کر وہاں میں نے سلطان اور اس کے وزیر اور عماد الملک اور دیگر ارکان سلطنت سے ملاقاتیں کیں، سلطان میری سندیں دیکھ کر بہت تعظیم وتکریم سے پیش آیا اور ہمارے بادشاہ کی نسبت عقیدت مندی کا اظہار کیا، ایک روز جب میں عماد الملک سے ملنے

کے لئے اس کے محل میں گیا تو وہاں پرتگالی سفیر ملا، جس نے عماد الملک کو مخاطب کر کے کہا کہ سلطان ٹرکی کے ساتھ ہم لوگ کوئی مخالفت نہیں کر سکتے، ہم لوگوں کو ان کی ضرورت ہے، علاوہ ازیں وہ دنیائے اسلام کا بادشاہ ہے۔" (مقالات سلیمانی:۱/۱۵۴-۱۶۰)

حرمین شریفین اور خادم الحرمین سلاطین عثمانی کے سفیروں کے استقبال کے لئے گجرات سے تحائف

مدت سے یہ دستور چلا آتا تھا کہ سلطنت تیموری ہر سال ہندوستان کی طرف سے ایک امیر حاج مقرر کر کے اس کے ساتھ چار لاکھ روپیہ مکہ معظّمہ اور مدینہ منورہ کی خدمت گذاری کے لئے بھیجا کرتی تھی، اکبر نے بھی اس رسم کو جاری رکھا، یہ روپیہ عموماً گجرات کے خزانہ سے بھیجا جایا کرتا تھا، اسی لئے گجرات کی تاریخوں میں اس کا بکثرت ذکر ہے، شوال المکرّم ۹۸۶ھ میں جب اکبر اجمیر میں تھا، خواجہ احرار کی اولاد میں سے خواجہ محمد یحیی کو میر حاج بنا کر اور چار لاکھ روپیہ ساتھ دے کر مکہ معظّمہ روانہ کیا، ۹۸۷ھ میں میر ابوتراب میر حاج بنائے گئے اور لاکھوں روپئے مع نقد و سامان ان کو دیئے گئے تاکہ شریف مکہ کے مشورہ سے وہاں علماء، مشائخ اور فقہاء میں تقسیم کر دیئے جائیں۔

''مرآۃ احمدی'' نامی گجرات کی ایک تاریخ ہے، اس کا مصنف صوبہ گجرات کا دیوان تھا، اس لئے تمام سرکاری کاغذات تک اس کی رسائی تھی، ذیل میں شاہ جہاں کی فیاضیوں کے اور سلطان روم اور حرم محترم کی بجا آوری خدمات کے واقعات اس کے مختلف صفحات سے لے کر یکجا کر دیئے جاتے ہیں۔

۱: شاہ جہاں نے ۱۰۴۱ھ میں دیوان خواجہ جہاں کو حرمین کی اجازت دی، پانچ لاکھ

روپئے تاجپوشی کی نذرمانی تھی، ازاں جملہ فی الحال ۲/لاکھ ۴۰/ہزار روپیہ کا مال حسب مذاق اہل عرب احمد آباد اور سورت سے خرید کر خواجہ صاحب کے ساتھ بھیجنے کا حکم متصدیانِ صوبۂ گجرات کے نام صادر ہوا، حکیم مسیح الزمان بھی رخصت حج لے چکے تھے، حکم میں لکھا تھا کہ سارا مال انہی کی رائے سے تقسیم ہوگا۔

۲: ۱۰۴۷ھ میں حکیم ابوالقاسم حکیم الممالک کو اجازت حج وزیارت ملی اور متصدیان گجرات کے نام حکم صادر ہوا کہ ۶۰/ہزار کا اسباب من جملہ رقم نذر دی جائے۔

۳: ۱۰۵۷ھ میں احمد آباد کے کاریگروں سے خوشبودار عنبر کی ایک قندیل نہایت خوب صورت سات سوتولہ کے وزن کی بنوائی گئی، صناعوں نے مرصع کاری سے جواہر بے بہا قندیل میں جوڑ دیئے تھے، سارے جواہرات میں الماس کا ایک دانہ نہایت پاکیزہ تھا، ایک لاکھ قیمت تھی اور قندیل کا سارا خرچ ملا کر ڈھائی لاکھ صرف ہوئے تھے، یہ قندیل بحکم حضور روضۂ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے بنائی گئی تھی، ۱۰۵۷ھ میں تیار ہوگئی، ناظم صوبہ نے سید احمد سعید کے ہمراہ حضور میں بھجوادی، بادشاہ نے ملاحظہ فرما کر بہت پسند کی اور حکم فرمایا کہ سید مذکور کے ہمراہ قندیل مدینہ طیبہ بھیجی جائے، متصدیان احمد آباد کے نام حکم ہوا کہ ایک لاکھ ۶۰/ہزار روپئے کا اسباب حسب مذاق عرب خرید کر سید صاحب کے سپرد کیا جائے، تا عتبات کے مستحقین میں صرف ہو اور یہ رقم اسی مد میں لکھی جائے، مگر تقدیر کہ ہوا کچھ ایسی چلی کہ جہاز پھر پھرا کر سورت واپس آ گیا۔

۴: ۱۰۶۰ھ میں فرات خان نواب ناظر محل شاہی کو حرمین کی اجازت ہوئی، چلتے وقت ۵۰۰/اشرفی زادراہ دیا گیا اور ایک لاکھ پچاس ہزار روپیہ کا مال واسباب احمد آباد سے دلایا گیا کہ ان میں سے ۵۰/ہزار کا مال شریف مکہ زید بن محسن کو اور ۵۰/ہزار کا سادات وعلماء

وفضلاء و گوشہ نشینان مکہ معظّمہ کواور ۵۰/ ہزار کا مدینہ طیبہ کے فقراء ومساکین کو تقسیم کیا جائے۔

۵: اسی سال سلطان محمد خان والی روم کے ایلچی سید محی الدین (از اولاد شیخ عبدالقادر جیلانی) کے سورت میں وارد ہونے کی خبر متصدی بندر کی تحریر سے حضور میں گذری، ایک خلعت اور فرمان گرز بردار کے ساتھ ایلچی کے پاس بھیجا گیا اور دس ہزار روپئے خزانۂ سورت میں ایلچی مذکور کو سفر خرچ کے دیئے گئے۔

۶: ۱۰۶۱ھ میں ایلچی رخصت ہوا، حاجی سعید احمد کے ہمراہ سورت آیا، حاجی صاحب بار دیگر قندیل مذکور پہنچانے کو مأمور کئے گئے تھے، متصدیان بندر سورت کو تاکید کی گئی کہ ایک لاکھ روپئے کا اسباب حسب مذاق اہل عرب حاجی مذکور کو بغرض تقسیم مستحقین مکہ معظّمہ سپرد کیا جائے۔

۷: متصدی بندر سورت کی عرض داشت سے حضور میں دریافت ہوا کہ فرمان روائے روم سلطان محمد خان کا ایلچی ذوالقدر آقا برادر وزیر اعظم صالح پاشا مع نامہ و پیام ۲۹/صفر المظفر ۱۰۶۳ھ کو وارد سورت ہوا کہ حکم ہوا بارہ ہزار روپئے ایلچی مذکور کو خزانہ سورت سے دیئے جائیں۔

۸: اسی زمانہ میں قلت غلہ سے بے نوایان مکہ معظّمہ کی محتاجی اور تکالیف حضور میں گذری، سن کر بادشاہ نہایت متاسف ہوا، ۱۶/ جمادی الثانیہ ۱۰۶۴ھ میں خواجہ ضابطہ کا انتخاب ہوا، خلعت سے سرفرازی دے کر حرمین شریفین کی اجازت ان کو دی گئی، چلتے وقت ایک لاکھ روپئے کا مال واسباب حسب مذاق عرب سورت سے ان کو حوالہ کیا گیا کہ ازاں جملہ ایک حصہ شریف مکہ کو، دوسرا حصہ صلحاء وفضلاء کو اور تیسرا مدینہ طیبہ کے زاویہ نشینوں کو دیا جائے۔

کارخانۂ ملتان میں ایک جا نماز مطابق نمونۂ مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم بنوائی گئی تھی، اگرچہ حضور کے پسند خاطر نہ تھی، تاہم خواجہ صاحب کے ساتھ مدینہ منورہ بھیجی گئی۔

یہ ایک سرکاری افسر کے روزنامچہ کے سادہ واقعات ہیں، خانی خان کے حوالہ سے اس سفارت کے واقعہ کی تفصیل لکھی جاتی ہے۔

۱۰۶۶ھ میں بندر سورت کے متصدی نے عرضی گذاری کہ سلطان محمد خان قیصر روم کی طرف سے ذوالفقار آقا خط اور تحائف لے کر وارد ہوا ہے، حکم ہوا کہ گرز برداروں کے ساتھ بندر سورت کے خزانے سے ۱۲/ہزار روپئے سفر خرچ دے کر روانہ کیا جائے اور پانچ ہزار سلطان پور اور ندر یار کے فوجدار اور ۱۲/ہزار برہان پور کی دیوانی سے اور ۵/ہزار اُجین کی دیوانی سے اور ۱۲/ہزار اکبر آباد کے خزانہ سے ادا کئے جائیں اور یہ بھی حکم ہوا کہ اس کے علاوہ صوبہ دار اپنی طرف سے بھی اس کی خدمت کریں، اس طرح منزل بہ منزل طے کرتے ہوئے سفیر جب دارالحکومت کے قریب پہنچا، تو حکم ہوا کہ لشکر خان بخشی اور طاہر خان اس کے استقبال کے لئے جائیں اور اپنے ساتھ لا کر حضور میں پیش کریں، سفیر نے قیصر کا خط اور دو گھوڑے جن کے ساز طلائی تھی اور زین میں موتی ٹنکے تھے اور گرز مرصع کار جو اس ملک کے سلاطین کا خاص ہتھیار رہے؛ پیش کیا، بادشاہ نے خط کو باعزاز تمام لیا اور سفیر کو ۳۰/ہزار روپئے نقد اور راگجہ (عطر) کے تین پیالے اور ایک طلائی پاندان عطا کیا اور ایک سرکاری مکان میں جہاں جملہ سامان مہیا تھے؛ اتارنے کا حکم دیا، اسی درمیان میں شہزادہ سلیمان شکوہ کی شادی رچی، اس جشن کی تقریب سے ۳۰/ہزار روپئے سرکار سے، ۲۵/ہزار شہزادہ کی طرف سے اور ۱۵/ہزار ملکۂ دوران نواب قدسیہ کی جانب سے مع دوسرے جڑاو سامانوں کے کل تقریبا ایک لاکھ روپیہ نقد و جنس سفیر کو مرحمت ہوا، قائم بیگ ایک ملازم جو ترکی و عربی بولتا تھا؛ نگراں

مقرر ہوا، ایک مرصع خنجر جس کے قبضہ میں بیش بہا موتی اور ایک گراں قیمت لعل جڑا ہوا تھا؛ جس کی قیمت ایک لاکھ تھی اور ایک مرصع کمر بند جس کی قیمت چالیس ہزار تھی اور دو ہزار تھان سادہ اور زری کے کپڑے بنگالہ، احمد آباد اور برہان پور کی ساخت کے جن کی لاکھ روپیہ قیمت تھی اور ۵۰/تولے عطر جہاں گیری جس کی قیمت اس زمانہ میں ۴/ہزار سے زیادہ تھی اور دوسرے تحائف سلطان کے لئے اس کے حوالے کئے گئے اور علامہ سعد اللہ خان وزیر کا لکھا ہوا سلطان کے نام عربی خط دیا گیا۔

سفیر موصوف سے یہ سن کر کہ قسطنطنیہ میں آج کل طاعون ہے، بادشاہ نے سودانے موتیوں کی تسبیح جس کا امام زہر مہرہ کا تھا اور جو ہمیشہ بادشاہ کے بازو پر بندھی رہتی تھی، تحائف میں داخل کر دی، سفیروں کے ساتھ خان جہاں ایک امیر کو احمد آباد اور سورت سے ایک لاکھ روپئے کا مال دے کر مکہ معظّمہ روانہ کیا کہ ان میں سے ایک تہائی شریف مکہ کو دیا جائے اور باقی حرم کے علماء اور مستحقین میں تقسیم کیا جائے، ملتان کے شاہی کارخانہ میں مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے عرض وطول کے برابر ایک نہایت عمدہ قالین تیار کیا گیا تھا، وہ بھی ساتھ کر دیا گیا۔

ناظرین حضرات! تم نے تاریخوں میں والئ توران اور دارائے ایران کے درباروں سے بھی بارگاہ تیموری میں قاصد اور سفراء آتے ہوئے دیکھے ہیں، کیا اس اعزاز، اس مسرت، اس فیاضی اور اس عقیدت کا سماں بھی وہاں تم کو نظر آیا، اس فرق مراتب کی تم کوئی صحیح توجیہ اس کے سوا کیا کر سکتے ہو کہ یہ خادم الحرمین الشریفین کی بارگاہ کا قاصد تھا اور جو کچھ اس کے ساتھ کیا گیا اور سلطان کے حضور میں جو کچھ بھیجا گیا اور حرمین کے لئے جو تحائف قاصد کے ساتھ ارسال کئے گئے وہ شاہ جہاں کا ولولۂ دین پرستی اور جوش مذہبی تھا۔ (مقالات سلیمانی: ۱/۱۶۴-۱۷۰)

اس وقت سلطان دہلی کی حکومت اگر چہ گجرات، کرناٹک اور دکّن تک پہنچ چکی تھی، تاہم ابھی ساحلی علاقوں میں اثر بہت کم تھا اور جنوبی صوبوں میں ہندو امراء بدستور فرماں روا تھے، کبھی کبھی وہ جب مجبور ہوتے تھے؛ تو سالانہ خراج ادا کرتے تھے، مگر عرب تاجر اور عجمی صوفیہ برابر کاروبار میں لگے رہتے تھے۔

الحمدللہ! آج بھی سورت وبھروچ ضلع کے کئی اصحاب خیر حضرات نے حرمین شریفین کے سامنے والے بلڈینگز اینڈ ٹاورس (Buildings & Towers) میں اپنے فلیٹ خریدے ہیں، جن کی آمدنی کا بڑا حصہ حرمین شریفین کے لئے وقف ہے، ان خوش نصیبوں میں دارالعلوم اسلامیہ عربیہ ماٹلی والا، بھروچ (گجرات) کے رکن شوری جناب حاجی ابراہیم ماٹلی والا بھی شامل ہیں۔

گجرات عربوں کی نظر میں

چوں کہ ابتداء میں عرب تاجر کی حیثیت سے آئے تھے، اس لئے اس زمانہ میں ان کا تعلق ان ہی علاقوں سے ہوا، جہاں بندرگاہیں تھیں، اس زمانہ میں سب سے زیادہ بندرگاہیں جنوبی ہند میں، اس کے بعد سندھ، گجرات اور بلوچستان میں تھیں، مثلاً موجودہ مدراس میں کولم ملی بار، راس کماری، گجرات میں تھانہ، کھنبایت، سوپارہ، چیمور، سندھ میں دیبل، بلوچستان میں تیز وغیرہ، جزائر میں سراندیپ اور مالدیپ، اس لئے ابتداء میں عرب انہی علاقوں میں آباد ہوئے اور ہندوستان میں مسلمانوں کی حکومت کے قیام سے صدیوں پہلے وہ سراندیپ، مالدیپ، ملیبار، کولم، (موجودہ ٹرانکور) کارومنڈل، چیمور، تھانہ، کھنبایت، گندھار، چنداپور پاکور (برکور) منگلور، وغیرہ میں آباد ہو چکے تھے، بعض مقامات پر ان کی آبادی دس دس ہزار تک تھی، ان کی مسجدیں تھیں، ہندوؤں سے ان کے تعلقات نہایت خوش گوار تھے، ہندو راجہ

ان کا بڑا احترام کرتے تھے اور ان کو باعث برکت سمجھتے تھے اور بعض حکومتوں میں ان کو خاص حقوق ومراعات حاصل تھے۔

چنانچہ جہاں جہاں ان کی آبادی زیادہ تھی، وہاں ان کا الگ نظام قضاء تھا اور ان کے معاملات ومقدمات کے فیصلہ کے لئے ہندوراجہ کی جانب سے مسلمان قاضی یا حاکم مقرر تھے، جو ہنرمند کہلاتے تھے، ہندوراجاؤں کے مسلمان وزیرومشیر تھے، بعض راجاؤں نے حق کی تلاش تھی؛ اسلام کے متعلق تحقیقات کے لئے اپنے سفیر عرب بھیجے اور مسلمان بزرگوں کے ہاتھوں پر مسلمان ہوئے ، پھر ان کے اثر سے ان کی رعایا میں بھی اسلام کی اشاعت ہوئی، یہ سارے حالات عرب سیاحوں اور جغرافیہ نویسوں کی کتابوں میں ملتے ہیں۔

عربی زبان میں جغرافیہ کی سب سے پہلی کتاب جس میں ہندوستان کا کچھ حال ملتا ہے، وہ ابن خرداذبہ کی کتاب المسالك و الممالك ہے۔

ابن خرداذبہ: یہ نویں صدی عیسوی میں معتمد خلیفہ عباسی کے زمانہ میں ڈاک اور خفیہ اطلاعات کے محکمہ کا افسر تھا ، اس لئے اس نے بغداد سے مختلف ملکوں کی مسافتوں اور آمدورفت کے راستوں کی تشریح میں یہ کتاب لکھی ہے، اس میں اس نے ہندوستان کے بری اور بحری تجارتی راستوں کی تفصیل بیان کی ہے اور یہاں کی مختلف ذاتوں کا تذکرہ کیا ہے، یہ گوخود ہندوستان نہیں آیا مگر اس کے عام معلومات کی بنیاد بطلیموس کے جغرافیہ پر ہے اور خاص خاص معلومات اس کے محکمہ کی سرکاری اطلاعات پر مبنی ہیں اور تاجروں اور مسافروں سے اپنے عہدہ کی وجہ سے اس کی ملاقاتیں برابر ہوتی رہتی تھیں، اس لئے اس کی یہ ذاتی معلومات گویا ایک ہندوستانی سیاح کے برابر تھی، اس کی کتاب ۱۸۸۹ء میں مطبع بریل لیڈن میں دی خوی (De Goeje) نے شائع کی ہے۔(عرب وہند کے تعلقات:۱۹)

ابن خرداذبہ (۲۱۱ھ مطابق ۸۲۶ء-۳۰۰ھ ۹۱۲ء) لکھتے ہیں:

ملك الهند الاكبر بلهرا اى ملك الملوك ومن ملوك الهند جابة وملك الطافن وملك الجزر وغابة ورهمى وملك قامرون. (المسالک والممالک ص:۱٦)

ہندوستان کا سب سے بڑا راجہ بلہرا (مہاراجہ) ہے، یہاں کے راجاؤں میں جابہ، طافن، جزر، (یہ لفظ اصل میں گجر ہے، گوجر راجہ گجرات کے تھے، جب گوجر قوم ہندوستان فتح کر کے آبو ہوتے ہوئے اس ملک میں آئی تو انہوں نے اپنے جنوبی مقبوضات کے تین حصے کئے، سب سے بڑے حصہ کا نام مہاراٹھ اور دوسرے کا گوجر راٹھ اور تیسرے کا سوراٹھ رکھا، جنہیں آج کل مہاراشٹر، گجرات اور کاٹھیاوار (سوراٹھ) بولتے ہیں، ۸۰۰ء کے مسلمان اس کو جزر بولتے تھے، جو گجرات کا معرب ہے اور گجر مخفف ہے گوجر کا، پھر ہندوستان کے ترکی فاتحوں نے گوجراٹھ سے گجرات بنادیا اور یہی نام اس وقت معروف ومشہور ہے۔) غابہ، رہمی اور قامہرون کے راجہ ہیں۔ (تاریخ گجرات)

راجہ بلہرا کا تذکرہ اکثر عرب مصنفین کے بیان میں آتا ہے، اس لئے اس کے متعلق مختصر نوٹ تحریر کر دینا مناسب ہوگا، بلہرا اصل میں ولبھ رائے کی بگڑی ہوئی شکل ہے، یہ دکھنی راشٹ کوٹ خاندان کے راجاؤں کا لقب ہے، اس خاندان میں جو شخص پہلا ظاہر ہوا وہ شری بھٹ ٹارک ہے، جس نے گجرات پر ۵۰۹ء سے ۵۲۰ء تک حکومت کی، اس شخص کو ولبھی پور کا بانی کہا جاتا ہے، مسٹر بھنڈارکر نے بلہرا کو دو لفظوں ''بھلا''، ''را'' سے مرکب بتایا ہے، 'را' بمعنی راجہ اور ''بھلا'' بمعنی معظم ومکرم، ولبھی پور قدیم زمانہ میں ایک مستقل اور عظیم الشان شہر تھا، قدیم چینی سیاح ''ہونگ شیانگ چین'' کا بیان ہے کہ لاریکا، (لا یعنی بھروچ) کے اتر میں واقع ہے۔ بیرونی کا بیان ہے کہ انہلواڑہ سے دکھن میں پڑتا ہے، لیٹ صاحب کے بیان کے مطابق موجودہ ریاست بھاؤ نگر سے ۲۰؍میل اور بندر گھوگھ کے درمیان آباد تھا، موجودہ تحقیق بھی قریب قریب یہی ہے کہ گھیلا روندی کے کنارے وڑانامی گاؤں کے پاس

ولبھ یا وَلبھی نام کا ایک چھوٹا سا گاؤں ہے، جس کو اس شہر کی یادگار سمجھنا چاہئے، اس شہر کی تباہی کے متعلق مختلف کہانیاں بیان کی جاتی ہیں۔علامہ سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ یہاں راجاؤں کا مذہب بودھ اور بعضوں کا جین تھا اور انہیں دونوں کے جھگڑوں میں شاید اس کا خاتمہ ہوا۔

ولبھ راجاؤں کی حکومت گجرات، کاٹھیاواڑ، کچھ اور کوکن وغیرہ علاقوں پر مشتمل تھی، ان کا اصل پایۂ تخت ناسک تھا، جو پہلے بدل کر مال کھیٹ، پھر مانگھیڑ ہو گیا، اسی کو عرب سیاحوں نے معرب کر کے مانکیر کر دیا ہے، اس کا شمالی عرض البلد ۱۷/درجہ ۱۰/دقیقہ اور مشرقی طول البلد ۷۷/درجہ ۱۳/دقیقہ ہے۔

ابن خرداذبہ نے جس راجہ بلہرا کا ذکر کیا ہے، اس کا نام مودگھ ورش ولبھ رائے ہے، اس کی حکومت کا زمانہ ۸۱۵ء سے ۸۷۷ء تک ہے، اس راجہ نے اپنے طویل عہد حکومت میں بڑی فتوحات حاصل کیں، حسن انتظام کے لحاظ سے بھی یہ بہترین راجہ تھا، اسے عربوں سے بڑی محبت تھی، آخر عمر میں تخت سے دست بردار ہو کر عبادت الٰہی میں مشغول ہو گیا تھا اور اس کا لڑکا اس کا جانشین ہوا۔ (تاریخ گجرات)

آگے لکھتے ہیں:

بلاد السند القيقان وبنتة ومكران والميد والقندهار، قال ابن مفرغ۔

سندھ کے شہروں میں قلات، بنتہ، مکران، مید، قندھار ہے اور قندھار کے متعلق ابن مفرغ کا شعر ہے۔

بقندهار ومن تكتب منيته　　　　بقندهار يرجم دونه الخبر

قندھار میں جس شخص کی موت لکھی ہو اس کی خبر نہیں مل سکتی۔

وقصدار والبوقان وقندابيل وفنزبور وارمابيل والديبل وقنبلي وكنبايا و سهبان وسدوسان وراسك والرور وساوندري والمولتان وسندان والمندل، و البيلمان وسرشت والكيرج ومرمد وقالي ودهنج وبروص.

قصدار، بوقان، قندابیل، قنز پور، ارمائیل، دبیل، قنبلی، کھنبایت، مرمد، سیہان، سدوسان، راسک، رور، ساوندی، ملتان، سندان، منڈل، بھیلمان، سرست، کیرج، کالی، دھنج اور بھروچ وغیرہ ہیں۔

ابن خرداذبہ نے سندھ کے جن شہروں کا نام لیا ہے، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ بلوچستان کے بعد گجرات تک سندھ ہی کا علاقہ سمجھتا ہے اور یہی حال تمام قدیم مؤرخین عرب کا ہے۔

کھنبایت: یہ گجرات میں سمندر کے کنارے ایک بڑی بندرگاہ تھی، بید، نیزہ، چاول، شہد اور ناریل کے لئے مشہور تھا، یہاں سے جوتے ساری دنیا میں برآمد کئے جاتے تھے۔ (تاریخ سندھ)

سدوسان: اس شہر کا مختلف زمانہ میں سدوسان، سیوستان، سہوان اور سیوان الگ الگ نام رہا ہے، آج کل سیوہن کہتے ہیں، یہ بھی گجرات کا علاقہ اور سمندر کے کنارے آباد ہے۔ (تاریخ سندھ: ۵)

بھیلمان: یہ سندھ، گجرات، کاٹھیاوار اور مارواڑ کی سرحد پر واقع تھا اور کسی زمانہ میں بھیلوں اور پھر گوجروں کا پایۂ تخت تھا۔ (تاریخ سندھ: ۱۲۰)

سرست (سوراتھ): کاٹھیاوار کا قدیم نام ہے۔ (تاریخ سندھ)

کیرج یا کورج: موجودہ جے پور کا نام تھا اور کسی زمانہ میں مشہور ہندوستانی راجہ داہر کی یہاں حکومت تھی۔ (تاریخ سندھ: ۱۲۸)

ص:۶۲ ر پر رقم طراز ہیں:

ومن كولى الى سندان ثمانية عشر فرسخا وبها ساج وقنا.

کولی سے سندان ۵۴ رمیل پر واقع ہے،سندان میں ساگوان کی لکڑی اور نیزے ہوتے ہیں۔(ہندوستان عربوں کی نظر میں:۱/ ۲،۱، ۹، ۱۰، ۱۶، ۱۹)

ومعظم ملوك الهند بلهرا وتفسيره ملك الملوك ونقش خاتمه من ودك لامر ولى مع انقطاعه وينزل الكمكم بلاد الساج وبعده ملك الطافن وبعده جابة وبعده ملك الجزر وله الدراهم الطاطرية.(ص:٦٦)

ہندوستان کا سب سے بڑا راجہ بلہرا (ولبھ رائے) ہے،جس کے معنی شہنشاہ یعنی مہاراج ہوتا ہے،اس کی انگوٹھی میں کندہ تھا کہ جو شخص تجھ سے کسی غرض کی وجہ سے محبت کرے گا وہ اپنی غرض پوری نہ ہونے کی وجہ سے تجھ سے کنارہ کش ہو جائے گا،راجہ بلہرا ساگوان کے ملک کوکم میں رہتا ہے،اس کے بعد طافن بھر چاپ اور اس کے بعد گجرات کے راجہ ہیں، گجرات کے راجہ کا سکہ طاطریہ درہم ہیں۔(ہندوستان عربوں کی نظر میں:۱/ ۲۲۱، ۲۳)

طاطریہ: یہ ایک قسم کا جاوہ سکہ تھا اور گجرات اور سندھ میں بھی رائج تھا،آج کل کے آٹھ آنہ کے برابر ہوتا تھا۔(تاریخ سندھ،ص:۱۳)

سلیمان بن تاجر (تیسری صدی کے سیاح) اپنے سفر نامہ (سلسلۃ التاریخ ۲۳۷ھ) میں لکھتے ہیں:

یہ سب سے پہلا عرب سیاح ہے،جس کا سفر نامہ ہم تک پہنچا ہے،۱۸۱۱ء میں پیرس میں سلسلۃ التواریخ کے نام سے یہ چھپا ہے،یہ ایک سوداگر تھا،جو عراق کی بندرگاہ سے چین تک سفر کیا کرتا تھا اور اس طرح یہ ہندوستان کے پورے ساحل کا چکر لگایا کرتا تھا،اس نے اپنے سفر نامہ ''سلسلة التواريخ''میں لکھا ہے:

ان میں ایک گجرات کا راجہ ہے، جس کے پاس بڑی فوجیں ہیں، کسی ہندوستانی راجہ کے پاس اتنی فوجیں اور گھوڑے نہیں، وہ عربوں کا دشمن ہے؛ لیکن اس حقیقت کا معترف ہے کہ عرب کا بادشاہ ہی سب سے بڑا بادشاہ ہے، اس سے بڑھ کر کوئی ہندوستانی اسلام کا دشمن نہیں، یہ کاٹھیاواڑ میں رہتا ہے، اس کے پاس دولت، اونٹ اور مویشی بہت زیادہ ہیں، اس ملک کے لوگ چاندی کے بدلہ سونا خریدتے ہیں، کہا جاتا ہے کہ ان کے پاس کئی کانیں ہیں، اس شہر سے زیادہ کوئی شہر چوری سے محفوظ نہیں۔

ویلی هٰولاء ملك ؛ يقال له رهمى ، يقاتله ملك الجزر وليس له شرف فى الملك وهو ايضا يقاتل بلهرا، كما يقاتل ملك الجزر ورهمى هذا اكثر جيشا من ملك بلهرا ومن ملك الجزر ومن الطافن.

ان راجاؤں سے قریب ہی ایک راجہ ہے، جسے رہمی (برہما) کا راجہ کہتے ہیں، انہی سے گجرات کے راجہ کی لڑائی رہتی ہے، اس کی اپنے ملک میں کوئی عزت وتوقیر نہیں، راجہ گجرات کی طرح اس کی بھی راجہ بلہرا کے ساتھ جنگ رہتی ہے، اس کی فوجیں بلہرا، گجرات اور طافن کے راجاؤں سے زیادہ ہے۔ (ہندوستان عربوں کی نظر میں: ۱/ ۴۱، ۴۲)

ہشام کے عہد حکومت میں ملک میں شادابی اور خوش حالی آ گئی، لوگ اس کو بابرکت سمجھتے تھے، اس نے سرحدوں پر پورا قابو حاصل کر لیا تھا اور تمام معاملات کو مستحکم کر دیا۔

گندھار میں منارۂ تبع حمیری

قاضی رشید بن زبیر کتاب الذخائر والتحف میں لکھتے ہیں:

ولـمـا فتـح هشـام بـن عـمـرو التغلبى الهند ، جاز بالسند فى سنة احدى وخـمسيـن ومـائة فى خلافة المنصور بالله حين افتتح القندهار وجد فيها سارية حـديـد غـليظة طولها مائة ذراع ، فسأَل عنها اهل القندهار، فقالوا: هذه سيوف ابناء فارس ايام ابلوا مع تبع الحميرى فافتتحوا البلاد فلما فتحوا القندهار جمعوا سيوفهم فربوها جميعا وهى هذه السارية فاليمن تزعم ان تبعا قال:

ولو نعرت بقندهارنعرة　　خرت صوامعها وكل عمود

خلیفہ منصور عباسی کے عہد (۱۵۱ھ) میں ہشام بن عمرو التغلبی نے ہندوستان پر حملہ کیا اور سندھ کو عبور کر کے قندھار (گندھار: ضلع، بھروچ، واقع گجرات) پر حملہ کیا تو یہاں اس نے لوہے کا ایک موٹا سا ستون پایا، جو ایک سو ہاتھ لمبا تھا، ہشام نے مقامی لوگوں سے اس کے بارے میں دریافت کیا، تو انہوں نے بتایا کہ یہ اہل فارس کی اس زمانہ کی تلواریں ہیں، جب انہوں نے تبع حمیری کے ساتھ حملہ کر کے ہمارا ملک فتح کیا تھا، قندھار کے فتح کرنے کے بعد انہوں نے اپنی تلواریں اکٹھا کر کے توڑ ڈالیں، انہیں ٹوٹی ہوئی تلواروں سے یہ ستون بنایا گیا ہے، اہل یمن کا خیال ہے کہ تبع نے اسی موقع پر یہ شعر کہا تھا۔

اگر میں قندھار میں ایک نعرہ لگادوں تو اس کے سارے گرجے اور لاٹین سرنگوں ہوجائیں۔ (ہندوستان عربوں کی نظر میں: ۲/۱۰۰، ۱۰۱)

ہندوستان کا علاقہ

شریف الادریسی کی کتاب نزهة المشتاق (جو علی گڑھ یونیورسٹی نے وصف الهند وما يجاورها کے نام سے شائع کی ہے) میں لکھا ہے:

فـامـا اتـصـل بـالسـنـد مـن بـلاد الهند فمدينة قامهل وكنبايت وسوباره وخابيرون وسندان وماسويا وصيمور.

ولها من الجزائر البحرية اوبكين وجزيرة الميد وجزيرة كولم ملى وجزيرة سندان.

صوبۂ سندھ سے ہندوستان کے جو شہر بالکل ملے ہوئے ہیں؛ وہ یہ ہیں، قامہل، کھنبایت، سوپارہ، خابیرون، سندان، ماسویا، صیمور (چیمور)۔

سندھ کے بحری جزیرے یہ ہیں: جزیرہ اوبکین، جزیرہ مید، جزیرہ کولم ملی (ٹرانکور) جزیرہ سندان۔

ہندوستان کے دوسرے شہر وقصبات

ومدن الهند كثيرة، منها قامهل وكنبايةوسوباره واساول وجناول وسندان وصيمور والجندور والسندور وزويلة فى المفازة ولمطة واودغست وفهروارة ولهاور وغيرها مما سنأتى بذكره فى امكنة بعون الله تعالىٰ.

''ہندوستان کے مشہور شہر یہ ہیں: قامہل (ماہل)، کنبایت (کھنبیات) سوپارہ، اساول، جناول، سندان، صیمور (چیمور) جندور، سندور، زوبلہ، یہ صحراء کا شہر ہے، لمطہ، اوغست، فہروارہ، لہاور (لاہور)، ان کے علاوہ بعض شہروں کا ذکر آگے آتا ہے۔''

فاما مدينة قامهل، فقوم يحسبونها من الهند وقوم يجعلونها من السند وهى على راس المفازة المتصلة بينها وبين كنبايت والديبل وبانية.

''قامہل کو کچھ لوگ ہندوستان اور کچھ لوگ سندھ میں شمار کرتے ہیں، یہ شہر اس صحراء کے کنارے آباد ہے، جو کھنبایت، دیبل اور مانیہ سے ملا ہوا ہے۔''

کھنبایت

ومن قامهل الى مدينة كنباية خمس مراحل، ومدينة كنباية على ثلثة اميال من البحر وهى فى ذاتها حسنة الشكل، وبها الاقلاع والحط، وبها حمل

بضائع و تجارات من كل الآفاق ویخرج منها الی كل الجهات.

''اور کھنبیات سمندر سے صرف ۳؍میل دور ہے، کھنبایت نہایت ہی خوب صورت شہر ہے، یہاں متعدد قلعے اور خندقیں ہیں، یہاں ہر طرح کا سامان مل جاتا ہے، یہاں ساری دنیا سے اشیائے تجارت کی درآمد اور برآمد ہوتی ہے۔''

وهی ایضًا علی خور تدخله المراكب و ترسی به ، و مائها كثیر، وعلی هذه المدینة حصن منیع بنته ولاة الهند عند ما تغلب علیها صاحب جزیرة كیش.

''یہ ایک خلیج کے کنارے آباد ہے، یہاں تک جہاز چلے آتے ہیں، اس میں پانی بہت زیادہ ہے، اس شہر میں ایک بہت ہی مضبوط اور نا قابل فتح قلعہ ہے، جسے ہندوستان کے راجاؤں نے اس وقت تعمیر کیا تھا، جب کہ اس پر جزیرہ کیش کے راجہ نے قبضہ کرلیا تھا۔''

ومن مدينة كنباية فی البحر الی جزیرة اوبكین مجری و نصف.

''کھنبایت سے جزیرہ اوبکین جہاز کے ذریعہ ڈیڑھ منزل ہے۔''

و كذلك من جزیرة اوبكین الی جزیرة الدبیل مجریان اول بلاد الهند وینبت فی ارضها الزروع والارز ، وفی جبالها تنبت القنا الهندیة و اهلها عباد بدود.

''جزیرہ اوبکین سے جزیرہ دبیل دو بحری منزل پر ہے، یہ ہندوستان کا پہلا شہر ہے، یہاں کی زمین قابل کاشت ہے اور چاول کثرت سے پیدا ہوتا ہے اور اس کے پہاڑوں میں ہندی قنا کثرت سے پیدا ہوتا ہے، یہاں کے باشندے بدھ کے پرستار ہیں۔''

ومنها الی جزیرة المید ستة امیال و اهلها لصوص،ومنها الی كولی ستة امیال.

''یہاں سے جزیرہ مید صرف چھ میل پر واقع ہے، میڈ قوم کا پیشہ چوری اور ڈاکہ زنی ہے اور یہاں سے کولی چھ میل ہے۔''

کولی اورسوپارہ

ومن كولى على الساحل الى المدينة سوفاره نحو خمس مراحل وهى تبعد عن البحر نحو ميل ونصف ، وهى مدينة متحضرة وعامرة كثيرة الساكن، ولها تجارات ومرافق ، وهى فرضة من فرض البحر الهندى وبها مصائد ومغائض اللؤلؤ.

''اور کولی سے سوپارہ ۶۰ رمیل کے لگ بھگ ہے، یہ سمندر سے ڈیڑھ میل دور ہے، یہ بڑا متمدن اور آباد شہر ہے، یہاں کے لوگ تاجر اور آسودہ حال ہیں، سوپارہ بحر ہند کی ایک خلیج ہے، یہاں شکارگاہیں بھی ہیں اور موتی نکالنے کی جگہیں بھی بنی ہوئی ہیں۔''

ومن مدينة سوباره الى مدينة سندان نحو خمس مراحل ، بينها وبين البحر ميل ونصف ميل، وهى مدينة متحضرة الاهل ، وسكانها اهل حذق ونبالة، وهم تجار مياسير متجولون ، وهى كبيرة القدر والمسافر اليها كثيرة والخارج عنها كثيرة وعليها جزيرة ناره وهى صغيرة وفيها قليل نارجيل وقسط.

''سوپارہ سے سندان دو میل ہے، یہ بھی سمندر سے ڈیڑھ میل کے فاصلہ پر واقع ہے، اس شہر میں لوگ بڑے متمدن، ہوشیار اور صاحب عقل وہوش ہوتے ہیں، یہ تجارت پیشہ ہیں، جو ہمیشہ ادھر ادھر آتے جاتے رہتے ہیں، بڑا شاندار شہر ہے، یہاں کثرت سے سیاح اور تاجر آتے جاتے رہتے ہیں، اس کے اوپر جزیرہ ثارہ ہے، یہ بہت ہی چھوٹا سا جزیرہ ہے، یہاں ناریل اور کٹ تھوڑا تھوڑا پیدا ہوتا ہے۔''

چیمور

ومن مدينة سندان الى صيمور خمس مراحل ، وصيمور مدينة واسعة حسنة جليلة المبانى ، حسنة الجهات وبها نارجيل كثير وقنا وبجبالها كثير من النبات العطر المحمول الى سائر الآفاق.

''سندان سے چیمور ۶۰ رمیل ہے، یہ بھی بڑا حسین اور وسیع شہر ہے، یہاں بڑی شاندار عمارتیں ہیں، شہر کے اطراف بھی بڑے خوبصورت ہیں، یہاں ناریل اور نیزہ کی لکڑی کثرت سے پیدا ہوتی ہے، یہاں کے پہاڑوں میں عطریات کثرت سے پیدا ہوتی ہیں، جو ساری دنیا میں برآمد کی جاتی ہیں۔''

واما كنباية وسوباره وسندان وصيمور ، فكلها من بلاد الهند،وصيمور بلدة من بلاد الملك المسمى بلهرا.

''کھنبایت، سوپارہ، سندان، چیمور وغیرہ ہندوستان کے شہر ہیں، اور چیمور بلہرا کی سلطنت میں پڑتا ہے۔''

وملكه عظيم وبلاده واسعة العمارات ، كثيرة التجارات،جامعة الخيرات، جباياته وافرة وامواله مقنطرة وببلاده ايضا انواع وصنوف من افاويه العطر.

''اس کی سلطنت بہت ہی عظیم الشان اور اس کے شہر وقصبات بڑے وسیع اور آباد ہیں، تجارت کی گرم بازاری بھی ہے اور تمام قسم کی خوبیاں موجود ہیں، حکومت کی آمدنی بھی وافر ہے اور دولت کی فراوانی ہے، یہاں مختلف قسم کی خوشبوئیں بھی ملتی ہیں۔''

ان هـذا الجزء الثامن (من الاقليم الثانی) تضمن حصته من البلاد الهندية، بلادا ساحلية علی بحرالهند.

مـنهـا بـروج و سـنـدابـور و تـانـه وفـنـدريـنة وجربتن و كلكيان وصنجی و كيكسار ولولوا و كنجه و سمندر.

اس حصہ میں ہندوستان کے یہ ساحلی مقامات پڑتے ہیں: ''بھروج ،سنداپور، تھانہ، فندریہ، جرٹین ،کلکیان،ضنجی ،کیکسار ،لولوا، کنجہ ،سمندر۔''

ومـن البـلاد البـرية: مـديـنة دولـقة وجـنـاول ونهروارة والقندهار وزويلة ولمطة واودغست، وكل هذه علی رأس المفازة.

''ان بحری شہروں کے علاوہ خشکی کے حسب ذیل شہر آباد ہیں: دولقہ، جناول، نہرواره ،قندھار، زویلہ،لمطہ ،اودغست ، یہ تمام شہر صحراء کے کنارے کنارے آباد ہیں۔''

بھروچ

فـامـا مـديـنة بـروج فـانهـا مدينة كبيرة جليلة جميلة حسنة البناء ، بنائها بـالـجـر والـجـص ولاهـلهـا همم عالية واحوال وافرة واموال ضامنة وتجارات مـعـروفة ، وهـم وقف علی الاغتراب والتجول وكثرة الاسفار ، وهی فرضة لمن جاء من الصين وفرضة لمن جاء من السند ومنها الی صيمور.

''بھروچ نہایت وسیع ،شاندار ،خوبصورت اور عمدہ عمارتوں والا شہر ہے، اس کے مکانات زیادہ تر چونے اور پکی اینٹوں سے بنے ہوئے ہیں، یہاں کے باشندے بڑے بلند ہمت ،خوش حال اور تجارت میں مشہور ہیں، یہ ہمیشہ اپنے ملک سے باہر اور سیاحت پر رہتے ہیں، چین اور سندھ کی طرف سے جو جہاز آتے ہیں، وہ یہاں ضرور لنگر انداز ہوتے ہیں، یہاں سے چیمور دو دن کا راستہ ہے۔''

نہرواره

ومن بروج الى مدينة نهرواره ثمانى مراحل فى بر متصل لاجبل له ، والسفر بينهما يكون على العجل، وليست ببلاد نهروارة ولا ماجاورها من البلاد للمسافرين سفر الا على العجل ، يحملون عليها امتعتهم والبقر تجرها وتصير بهم حيث شاؤا ولكل عجلة سائق وقائد.

''بھروچ سے نہرواره خشکی میں ۱۲۸ رمیل کے فاصلہ پر ہے، اس کے درمیان میں کوئی پہاڑ نہیں ہے، ان دونوں شہروں کے درمیان سفر محض بیل گاڑیوں کے ذریعہ ہوتا ہے اور نہرواره ہی کا نہیں بلکہ اس کے پاس کے تمام مقامات کا سفر محض بیل گاڑیوں ہی کے ذریعہ ممکن ہے، انہی گاڑیوں پر مسافر اپنا سامان بھی رکھتے ہیں، ان گاڑیوں کو بیل کھینچتے ہیں، ہر گاڑی کے ساتھ ایک گاڑی بان اور ایک آدمی اس کے پیچھے رہتا ہے۔''

وبين بروج ونهرواره مدينتان : اسم احدهما ؛ جناول؛ واسم الثانية ؛ دولقة ، وهما متقاربتان فى القدر ، وبين الواحدة والاخرى اشق من مرحلة.

ومدينة دولقة على نهر يتصل الى البحر ويكون خورا وعلى غربيه مدينة بروج ، وتروى: بروص.

''بھروچ اور نہرواره کے درمیان دو اور شہر جناول اور دولقہ ہیں اور اپنی وسعت اور حیثیت میں ایک دوسرے کے برابر ہیں، ان دونوں کے درمیان ایک دشوار گذار مرحلہ کا فاصلہ ہے۔''

''دولقہ اس ندی کے کنارہ واقع ہے جو سمندر سے بالکل قریب ہے اور یہ نشیبی علاقہ ہے، اس کے مغرب میں بھروچ ہے۔''

وجـنـاول ودولقة فى اسفل جبل معترض من جهة شمالهما يسمى جبل اوندرن ، وترابه ابيض الى الصفرة وتنبت فيه القنا وقليل نارجيل.

وبالقرب من مدينة جناول مدينة اساول.

وكـل هـذه الثـلاثة بـلاد تشبه بعضها بعضا فى الصفات والقدر واحوال اهلها واشتباه زيهم ولكل واحدة منها تجارات ومقاصد ارباح ممكنة.

''جناول اور دولقہ اس پہاڑ کے دامن میں واقع ہیں ،جو ان کے شمال میں پھیلا ہواہے،اس پہاڑ کا نام اوندرن ہے،اس کی مٹی زردی مائل سفید ہے، یہاں نیزے کی لکڑی اورکسی قدر ناریل کی پیداوار ہوتی ہےاور جناول کےقریب ہی اساول ہے۔

یہ تینوں شہر اپنی حیثیت ،وسعت،صفات اور باشندوں کی معاشرت اورلباس میں ایک دوسرے سے بہت مشابہ ہیں،ان میں سے ہرایک میں تجارتیں بھی ہوتی ہیں اورمعاشی فوائد کے ذرائع بھی موجود ہیں۔''

فاما مدينة نهرواره ، فملكها ملك عظيم ، يسمى بلهرا وله جيوش وفيلة ، وعبـادتـه صـنـم البد وهو يحمل تاج الذهب على رأسه ويلبس الحلل المنسوجة من الذهب ويركب الخيل فى سائر الايام.

''خاص طور پرنہرواره ولبھ رائے جیسے عظیم بادشاہ کی مملکت میں ہے،اس کے پاس پیدل فوج اور جنگی ہاتھی موجود ہیں اور یہ مہاتما بدھ کا پرستار ہے، یہ سونے کا تاج اورسونے کے تار کے بنے ہوئے قیمتی کپڑے زیب تن کئے رہتا ہےاور ہر موسم میں گھوڑے کی سواری کرتا ہے۔''

وقد يركب فى كل جمعة مرة ويركب حوله نحو مائة امرأة ولايمشى معه احد سواهن ، وقد لبسن القراطق المذهبة وتحلين باحسن الحلية واحتملن الاساور من الذهب والفضة فى ايديهن وارجلهن اسبلن شعورهن على اردافهن وهن يتلاعين ويرقصن والملك يقدمهن واما جملة وزرائه وعظماء رجاله فلايركبون معه الا اذا خرج محاربا لمن قام عليه او لمن اهتضم شيئا من عمالاته او الى من قصد بلاده من الملوك المجاورين له وله من الفيلة كثير وهى عمدة حربه.

''اس کا معمول ہے کہ ہر جمعہ کو سوار ہو کر باہر تفریح کے لئے نکلتا ہے، اس وقت تقریبا سو عورتیں اس کے ساتھ ہوتی ہیں، ان کے علاوہ کوئی دوسرا اس کے ساتھ نہیں ہوتا، یہ تمام عورتیں ستھری ساریاں اور بہترین قسم کے زیور پہن کر نکلتی ہیں، خاص طور پر ان کے ہاتھ اور پیر میں سونے اور چاندی کے کنگن اور کڑے ہوتے ہیں اور ان کے بال بالکل کھلے ہوئے ہوتے ہیں، وہ سب آپس میں خوب کلیل اور رقص کرتی ہیں اور بادشاہ ان کا پیش رو ہوتا ہے، وزراء اور عمائد سلطنت اس کے ساتھ اسی وقت ہوتے ہیں، جب وہ کسی دشمن کے مقابلہ کے لئے نکلتا ہے یا جب اس کی سلطنت کا کوئی حصہ کوئی دبا لیتا ہے یا جب پڑوسی راجاؤں میں سے کوئی اس کے ملک پر حملہ آور ہوتا ہے، اس کے پاس ہاتھیوں کی بہت بڑی تعداد موجود ہے، یہی ہاتھی اس کی اصلی جنگی قوت ہیں۔''

هذا الملك متوارث الذات والاسم لاينتقل عنهم وبلهرا تفسيره ملك الملوك كما قدمناه، ومدينة نهروارة يصلها كثير من تجار المسلمين وبها تجولهم وللمسافرين بها اكرام من ملكها وضبط لما بايديهم.

''یہ سلطنت ایک خاندان اور ایک ہی نام کے راجاؤں کے لئے مخصوص ہے اور اس خاندان کے لوگوں کے علاوہ دوسروں کے ہاتھوں میں عنان سلطنت منتقل نہیں ہوتی، بلہرا کے معنی مہاراجہ اور شہنشاہ کے ہوتے ہیں، جیسا کہ سابق میں گذر چکا ہے، نہرواره میں کثرت سے مسلمان تاجر آتے رہتے ہیں اور اس کے مختلف حصوں میں ان کی آمدورفت رہتی ہے، حکومت کی طرف سے مسافروں کا بڑا اعزاز واکرام ہوتا ہے اور ان کے مال ومتاع کی حفاظت کی جاتی ہے۔''

وبسط العدل فى اهل الهند طبيعة هؤلاء لايعولون على شيئى سواه ولفضل عدالتهم وحفظ عقودهم وحسن سيرهم ذكروا انهم وجملة اهل تلك البلاد فى خير وكثر القاصد اليهم وبلادهم عامرة واحوالهم راجحة، وادعة.

''عدل وانصاف ہندوستان کے لوگوں کی گھٹی میں پڑا ہوا ہے، اس کے علاوہ وہ کسی چیز پر بھروسہ نہیں کرتے، اپنی عدل پسندی اور عہد وپیمان کی پابندی اور حسن سیرت میں وہ ممتاز ہیں، مجموعی حیثیت سے اس ملک کے لوگ اچھے اور بھلے ہوتے ہیں، اسی وجہ سے کثرت سے باہر کے لوگ یہاں آتے ہیں، اس کے شہر آباد اور ان کی حالت قابل تقلید ہے۔''

ومن انقياد عواملها للحق واتباعهم له وكراهتهم للباطل (ان الرجل يكون له عند احد منهم حق فيلقاه حيث ما لقيه) فيخط له خطا فى الارض كالحلقة ويدخلها الطالب فى تلك الحلقة فيدخلها المطلوب طائعا من ذاته ولا يبرح منها الابانصاف عنه واذا مالزمه او يعفوعنه الذى له الحق فيخرج عن الحلقة.

''ہندوستانی عوام عام طور پر نیکی وسچائی کے سامنے منقاد وفرماں بردار ہوتے ہیں اور باطل کو ناپسند کرتے ہیں، وہاں یہ طریقہ بھی رائج ہے کہ جب کسی آدمی کا کوئی حق کسی کے ذمہ

ہوتو وہ اس شخص کو جہاں پاتا ہے؛ پکڑ لیتا ہے اور ایک دائرہ کھینچ کر اس میں اسے لے کر بیٹھ جاتا ہے اور جب تک اس کا کوئی فیصلہ نہ ہوجائے وہ اس کو لئے بیٹھا رہتا ہے، اب یا تو وہ حق دار کا حق ادا کرتا ہے یا حق دار سے معاف کرالیتا ہے، دونوں صورتوں میں سے جب کوئی صورت ہوجاتی ہے تو وہ اس حلقہ سے باہر نکل آتا ہے۔''

وطعام اهل نهرواره الارز والحمص والباقلی واللوبیا والعدس والماش والمسك والحیوانات التی تموت موتا طبیعیا.

''نہروارہ کے باشندوں کی خوراک چنا، چاول، باقلا، لوبیا (ترکاری) مسور، ماش، مچھلی اور مردار جانور وغیرہ ہیں۔''

ولا یذبحون طائرا ولا حیوانا ؛ لا کبیرا ولا صغیرا ، واما البقر فانها محرمة علیهم البتة فاذا ماتت دفنت ، وهذا فعلهم فی البقر خاصة دون سائر البهائم اذا ضعفت البقر عن الخدمة والتصرف رفعت عن التعب وامر بالنظر الیها وبالعلف من غیر ان تستخدم ظهورها الی ان تموت.

''یہ لوگ نہ تو کسی پرندے کو ذبح کرتے ہیں اور نہ چھوٹے بڑے کسی چوپائے کو ذبح کرتے ہیں، (یعنی وہ اسی طرح مار کر کھا جاتے ہیں) البتہ گائے، بیل کا کھانا ان کے یہاں حرام ہے، جب وہ مرتے ہیں؛ تو ان کو یہ دفن کردیتے ہیں، یہ بات صرف گائے بیل کے لئے مخصوص ہے، گائے بیل جب کمزور یا بے کار ہوجاتے ہیں، تو ان سے کوئی کام نہیں لیتے اور بغیر کچھ کام لئے ہوئے بھی ان کو کھلاتے پلاتے رہتے ہیں۔''

واهل الهند یحرقون موتاهم ولا قبور لهم. ''عام ہندوستانی اپنے مردوں کو جلاتے ہیں اور قبروں میں دفن نہیں کرتے۔''

واھل الھند لایحزنون کثیرا ولایقولون بالھموم جملة. ''عام طور پر ہندوستانی غمگین نہیں ہوتے اور رنج وغم کی باتیں تو وہ بالکل ہی نہیں کرتے۔''

وجملة البلاد الھندیة المجاورة للسند الذین قد مازجھم المسلمون، یدفنون موتاھم فی بیوتھم باللیل تسترًا ویسوون التراب علیھم و لایکون میتا ولایحزنون علیه کثیرا.

''ہندوستان کے وہ شہر جو سندھ سے متصل ہیں، ان میں مسلمانوں کی بھی ملی جلی آبادی ہے، یہاں کے تمام مسلمان اپنے مردوں کو رات میں چھپا کر گھر کے اندر دفن کرتے ہیں اور پھر قبر کو مٹی سے برابر کردیتے ہیں، یہ نہ تو مردوں پر روتے دھوتے ہیں اور نہ غم کا بہت زیادہ اظہار کرتے ہیں۔''

والزنا فی جمیع بلاد بلھرا مباح الا فی المزوجات. ''ولبھرائے کی حکومت میں شادی شدہ عورتوں کے علاوہ اور تمام عورتوں سے زنا مباح سمجھا جاتا ہے۔''

والرجل ان ارتضی نکاح بنته او اخته او خالته اوعمته مالم تکن مزوجات فعل ذلك والاخ یفعل باخته مثل ذلك.

''اگر کوئی آدمی اپنی لڑکی، بہن، پھوپھی یا خالہ کو شادی سے پہلے اپنے نکاح پر راضی کرلے تو وہ اس سے شادی کرسکتا ہے، اس سے صرف منکوحہ عورتیں مستثنی ہیں۔''

ویقابل مدینة بروج الساحلیة والبحر جزیرة ملی وفیھا الفلفل کثیرا، ومنھا الی جزیرة سندان مجریان.

''بھروچ کے بالکل مقابل سمندر کے دوسرے ساحل پر جزیرہ (کولم) ملی ہے، جہاں سیاہ مرچ کثرت سے پیدا ہوتی ہے اور یہاں سے جزیرہ سندان دو سمندری منزل پر ہے۔''

ومن هذه الجزيرة الى جزيرة بليق ؛ يومان ، وهى جزيرة عامرة كبيرة ، بها نـارجيـل كثير وموز وارز، وبها تفترق الطرق الى جزائر الهند ، ومن هذه الجزيرة الـى الـلـجة الـعظمى مسيرة يومين ، ومن هذه الجزيرة ايضا الى جزيرة سرنديب مجرى والزائد.

''اورسندان سے جزیرۂ بلیق دودن کا راستہ ہے، یہ جزیرہ بڑا آباد اور وسیع ہے، یہاں ناریل، کیلے اور چاول کثرت سے پیدا ہوتے ہیں، بلیق سے ہندوستان کے جزیروں کے لئے متفرق راستے ہیں، اسی جزیرہ سے بڑے سمندر تک دودن کا راستہ ہے اور جزیرہ سے سرندیپ ایک منزل سے کچھ زیادہ ہے۔''

ومـن مدينة بروج ، على الساحل الى مدينة سندابور اربع مراحل ، ومدينة سـندابور على خور كبير ترسى به المراكب ، وهى مدينة تجارات وبها عمارات ومقاصد وارزاق.

''بھروچ سے ساحل سنداپور کی مسافت ۶۴ رمیل ہے اور سنداپور ایک ایسے بڑے دہانے پر واقع ہے، جہاں جہاز لنگرانداز ہوتے ہیں، یہ تجارتی شہر ہے، جہاں عمارتیں بھی ہیں اور معاش کے ذرائع ووسائل بھی موجود ہیں۔''

ومـنهـا مـديـنة تـانه على الساحل اربعة ايام ومدينة تانه مدينة جليلة على ضفة خور كبير ، تدخله المراكب والسفن وتحط به الارحال.

''یہاں سے تھانہ (ممبئی) کی مسافت چاردن ہے، تھانہ (ممبئی) ایک شاندار شہر ہے، جو ایک بڑی آبنائے کے کنارے پر آباد ہے، یہاں کثرت سے جہاز اور کشتیاں سامان تجارت لے کر آتی اور سامان اتار کر لنگرانداز ہوتی ہیں۔''

وبجبالها وارضها تنبت القنا والطباشير يتخذ فيها من اصول القنا و منها يحمل الى سائر البلاد من المشارق والمغارب.

’’تھانہ کے قریبی پہاڑوں اور وادیوں میں بانس پیدا ہوتے ہیں اور اس کی جڑ سے بنس لوچن (طباشیر) تیار کیا جاتا ہے اور یہاں سے تمام دنیا میں مشرق سے مغرب تک برآمد کیا جاتا ہے۔‘‘

والطباشير يغش بعظام الفيل المحرقة، والصافى منه ما كان من اصول هذا القصب الهندى الشركى كما ذكرناه.

’’طباشیر میں ہاتھی کی کشتہ کی ہوئی ہڈیوں کی آمیزش بھی کرتے ہیں، لیکن خالص طباشیر اسی ہندی بانس کے جڑ سے بنائی جاتی ہے۔‘‘ (ہندوستان عربوں کی نظر میں: ۲/ ۶۸-۱۸۴)

یعقوبی اپنی تاریخ یعقوبی میں لکھتے ہیں:

ہندوستان کا اور ایک راجہ دابشلیم تھا، جس کے زمانہ میں کتاب کلیلہ ودمنہ لکھی گئی، اس کا مصنف ایک دانشمند پنڈت بید پا تھا، اس نے اس میں ایسی تمثیلیں بیان کی ہیں، جن سے عقل مند لوگ عبرت ونصیحت، فہم وفراست اور تہذیب وشائستگی حاصل کر سکتے ہیں۔

صفحہ نمبر ۱۰۶/ پر رقم طراز ہیں: پھر کھنبایت، طرسول، موسہ اور مایدکی سلطنتیں ہیں، جو چین کے قریب اور اس سے نبرد آزما رہتی ہیں، پھر لنکا اور اس کے بعد قمار (راس کماری) کا ملک ہے، جو بڑی شان وشوکت اور غیر معمولی اہمیت رکھتا ہے اور وہاں کے راجاؤں کو دوسرے راجاؤں پر فوقیت اور برتری حاصل ہے، پھر دبیل، فاریط اور صیلمان (بھیلمان) کی سلطنتیں ہیں اور ہندوستان کی بعض سلطنتوں میں عورتوں کی حکومت اور فرمانروائی ہے۔ (ہندوستان عربوں کی نظر میں: ص: ۱۳۱، ۱۴۸، ۱۴۹)

ابن رستہ اپنی مشہور کتاب ''الاعلاق النفسیه'' میں لکھتے ہیں:

وملكا يقال له الصيلمان ، هذا اكبر من هذين واكثر جيشا ، يقولون ان جيشه نحو سبعين الفا وله فيلة قليلة الا ان الهند يقولون : ان فيلة الصيلمان اجرأ على القتال من جميع فيلة اهل الهند ورأيت له فيلا يقال له النمران مارأيت لاحد من الملوك ببلاد الهند فيلا مثله ابيض منقطا بسواد ولا اجرأ على القتال والدماء منه وذلك انهم يوقدون النارالعظيمة ويحملون الفيلة عليها ، فما اجترأ عليها واقتحمها فانه جرئ على القتال والدماء وماجبن عن النار لم يصلح للقتال ولا للركوب بل ينقل عليه المتاع كما ينتقل على الابل.

''ایک اور راجہ جسے بھیلمان کہا جاتا تھا، راجہ بھیلمان، عارطی اور عابدی سے بڑا اور زیادہ لاؤلشکر والا ہے، لوگ کہتے ہیں کہ اس کی فوج کی تعداد تقریباستر ہزار تھی، مگر اس کے پاس ہاتھی بہت کم تھے، لیکن ہندوستانیوں کا بیان ہے کہ بھیلمان کے ہاتھی دوسرے تمام ہندوستانی ہاتھیوں سے زیادہ لڑائی میں جری اور بہادر ہوتے ہیں، میں نے اس کے پاس ایک ہاتھی دیکھا، جس کا نام نمران تھا، ہندوستان کے کسی راجہ کے پاس ایسا سفید ہاتھی نہیں دیکھا، جس پر سیاہ چتیاں تھیں اور جنگ اور خون ریزی میں ایسا جری دوسرا ہاتھی نظر نہیں آیا، ہاتھی کی بہادری کا اندازہ کرنے کے لئے آگ کا بڑا سا آلاؤ لگا کر ہاتھی کو اس میں گھسانے کے لئے ابھارتے ہیں، اگر وہ جرأت دکھا کر آگ میں گھس گیا تو جنگ کے لئے جری سمجھا جاتا ہے، لیکن اگر آگ میں گھسنے کے لئے بزدلی ظاہر کردی، تو جنگ وقتال اور سواری کے لائق نہیں سمجھا جاتا ہے اور اونٹوں کی طرح بار برداری کے کام میں لایا جاتا۔

ویلی هؤلاء ملك يقال له الجزر العدل فی مملكته مستفيض لو طرح

الـذهب في وسط الطريق ماخافوا عليه احدا يأخذه من عدلهم، وبلاده واسعة ، والـعـرب يـرحـلـون اليـه في تجاراتهم فيبرهم ويشتري منهم ، ومعاملاتهم لهم بـالـذهـب الـقـطـع والدراهم التي يقال لها الطاطري ، عليها تمثال الملك وزنها مثـقـال، فـاذا بـايـعوهـم ؛ قالوا للملك : ابعث معنا من يخرجنا من بلادك يحفظ متـاعـنـا ، فيـقـول : ليـس فـي بـلادي لص اخرجوا فان حدث باموالكم حدث فـخذوه مني وانا الضامن لكم وهو ملك له جسم كبير وليس حوله ملك اشجع منه في الحرب كثير المكيدة وهويقاتل بلهرا وملك الطافن ونجابة.

اس مملکت کے قریب ہی گجرات کا راجہ ہے، اس کی سلطنت میں اس قدر عدل وانصاف ہے کہ اگر سونا بھی بیچ راستہ میں پھینک دیا جائے تو لوگوں کو اس کا اندیشہ نہ رہتا کہ کوئی اسے اٹھا لے گا، اس راجہ کی سلطنت بڑی وسیع ہے، اہل عرب جب اس کے یہاں تجارت کی غرض سے آتے ہیں تو وہ ان کے ساتھ نہایت عمدہ برتاؤ کرتا ہے اور ان سے سامان بھی خریدتا ہے، یہاں کے لوگ لین دین اور خرید وفروخت سونے کے ٹکڑوں اور طاطاری نام کے درہموں سے کرتے ہیں، ان درہموں پر بادشاہ کی تصویر ہوتی ہے، یہاں کا وزن مثقال ہے، اہل عرب مال فروخت کرنے کے بعد بادشاہ سے درخواست کرتے ہیں کہ کسی آدمی کو ہمارے ساتھ بھیجئے ؛ تاکہ وہ سرحد تک پہنچادے اور ہمارے سازوسامان کی حفاظت کرے، بادشاہ یہ جواب دیتا ہے کہ ہمارے ملک میں چور ڈاکو نہیں ہیں، اس لئے تم لوگ بے خوف وخطر چلے جاؤ، اگر اس طرح کا کوئی حادثہ پیش آیا تو تم لوگ مجھ سے اس کا معاوضہ لے لینا، میں اس کا ضامن ہوں، اس کے قرب وجوار میں اس سے زیادہ بہادر کوئی راجہ نہیں ہے، وہ تدبیر اور سیاست میں بھی ماہر ہے، بلہرا، طافن اور نجابہ سے اس کی جنگیں ہوتی رہتی ہیں۔

بزرگ بن شہریار اپنی کتاب ''عجائب الہند'' میں رقم طراز ہیں:

وحدثنی بعض من دخل الھند انه رای بکنبایت الواحد بعد الواحد یجیئ الی الخرر لیغرق نفسه فیعطی الاجرة لمن یغرقه یتخوف ان یدرکه الخوف اوالجزع او یبدوله فی تغریق نفسه فیعطی الاجرة لمن یضع یده فی قفاه ویغطه فی الماء حتی یتلف وان صاح اواستعفی او سأله ان یطلقه لم یفعل.

''ہندوستان جانے والے ایک سیاح نے بیان کیا کہ اس نے کھنبایت میں لوگوں کو دیکھا کہ وہ یکے بعد دیگرے خلیجوں میں داخل ہوکر ڈوب جاتے ہیں اور جولوگ انہیں ڈبانے میں حصہ لیتے ہیں، ان کو اجرت دیتے ہیں، کیوں کہ انہیں اپنے کو خود ڈبانے میں خوف، گھبراہٹ اور جھجک پیدا ہوجانے کا اندیشہ رہتا ہے، اس لئے وہ ایسے آدمی کو اجرت دیتے ہیں جو کندھے پر ہاتھ رکھتا اور اسے پانی میں ڈبا کر ہلاک کردیتا ہے، (چنانچہ یہ غرق کرنے والے اسے پانی میں اس طرح ڈبا دیتے ہیں کہ وہ ہلاک ہوجاتا ہے) اور وہ اس کی پرواہ نہیں کرتے کہ ڈوبنے والا چیخ رہا ہے، یا معذوری اور چھوڑ دینے کی خواہش کررہا ہے۔''

دوسری جگہ لکھتے ہیں:

وحدثنی محمد بن مسلم السیرافی وکان مقیما بتانه نیفا وعشرین سنة وقد سافر الی اکثر بلاد الھند وعرف احوال اھلھا ومعاملتھم معرفة جیدة، ثم ان اثنی عشر نفسا جاؤا الی صیمور وتانه، فقبضوا علی رجل من التجار ھندی له اب یملك مالا عظیما والاب شدید المحنة به، لاولد له سواه، فقبضوا علیه فی وسط منزله وطالبوه بعشرة آلاف دینار اونحوذلك، وکان ھذا بعض ما یملکه ابوه فوجه الی ابیه یعرفه مانزل به ویسئله ان یشتریه ویخلصه منھم فجاء

اليهـم فكلمهم ورفق بهم ليأخذوا منه الف دينار ونحو ذلك. قالوا : لم نأخذ الا عشرة آلاف دينار ، فلما رآهم على هذه الحالة مضى الى الملك وعرفه القضية ؛ وقـال: هـذا شيئ لادواء له ومتى لم يقع بهؤلاء القوم نكاية لم يكد احد ان يقيم عـنـدكـم. فـقـال له :كيف نصنع ؟ وان كلمنا هم قتلوا ابنك . فقال له : كيف الـعـمـل؟ قـال : قتلهم سهل على وانما اخاف ان يقتلوا ابنك ولاولد لك غيره ، فـقـال : مـا ابالى هولاء يطلبون مالا عظيما ولايجوز لى ان افقرنفسى ، واخلص ولـدى باى وجه ، ايها الملك ! نجمع الخشب حول الدار ونسد بابها ونضربها بـالـنـار عـليهـم فقال له يحترق ابنك وعيالك ، فقال : احتراقهم اهون عندى من ذهـاب مـالـى فـوجـه الملك وسد باب الرجل وضرم الباب بالنار فاحترق القوم وولده وعياله وجميع ماكان فى الدار.

’’محمد بن مسلم سیرانی جو تھانہ میں ۲۰؍سال سے زیادہ مقیم تھا، ہندوستان میں اکثر جگہوں کی سیر وسیاحت اور وہاں کے باشندوں کے احوال ومعاملات سے خوب واقف تھا، اس نے مجھے بیان کیا کہ ۱۲؍افراد پر مشتمل ڈاکوؤں کا ایک گروہ چیمور اور تھانہ آیا اور وہاں اس نے ایک ہندوستانی تاجر کو پکڑا، جس کا باپ بڑا دولت مند تھا اور اس نے بڑی محنت اور جفاکشی سے یہ دولت حاصل کی تھی اور اس کا یہی ایک لڑکا تھا، اس کو انہوں نے گھر میں گھس کر پکڑا اور اس سے دس ہزار یا اسی سے لگ بھگ اشرفیاں مانگ رہے تھے، اس کے باپ کے لئے یہ معمولی رقم تھی، لڑکے نے یہ صورت حال باپ کے پاس کہلا بھیجی کہ وہ رقم دے کر ان ڈاکوؤں کے پنجہ سے اس کو چھڑا دے، یہ سن کر باپ فوراً آیا اور ان سے نرمی اور لجاجت سے کہا کہ ایک ہزار کے قریب اشرفیاں لے کر لڑکے کو چھوڑ دیں، مگر ڈاکوؤں نے انکار کیا اور کہا کہ ہم دس

ہزار کے بغیر نہیں چھوڑیں گے، باپ یہ کیفیت دیکھ کر راجہ کے پاس آیا اور صورت حال سے مطلع کیا اور کہا کہ اس کا سوائے اس کے کوئی علاج نہیں ہے کہ ان ڈاکوؤں کو قرار واقعی سزا دی جائے، بغیر اس کے کوئی شخص کیسے آپ کی سلطنت میں رہ سکتا ہے، راجہ نے کہا: اس وقت ہم کیا کر سکتے ہیں؟ اگر ان سے بات چیت کریں تو وہ تمہارے بیٹے کو قتل کر دیں گے، باپ نے کہا: آخر پھر کیا صورت ہو سکتی ہے؟ راجہ نے کہا: انہیں قتل کر دینا تو آسان ہے، لیکن خطرہ یہ ہے کہ وہ تمہارے اکلوتے بیٹے کو قتل کر ڈالیں گے، سوداگر نے جواب دیا: اس کی پرواہ نہیں، یہ لوگ اتنی بڑی بھاری رقم کا مطالبہ کر رہے ہیں کہ میں لڑکے کو بچانے کے لئے اپنے کو محتاج نہیں بنا سکتا، اس لئے ہم مکان کے چاروں طرف لکڑیاں جمع کریں اور دروازہ بند کر کے گھر میں آگ لگا دیں، راجہ نے کہا: مگر تیرا لڑکا اور گھر والے بھی تو جل جائیں گے، اس نے جواب دیا: میرے لئے ان کا جل جانا مال چلے جانے سے زیادہ آسان ہے، یہ سن کر راجہ خود اس کے مکان پہنچا اور دروازہ بند کر کے اس میں آگ لگوادی اور ڈاکوؤں کے ساتھ اس کا لڑکا، گھر کے سارے لوگ اور سارا اثاثہ سب جل گیا۔'' (ہندوستان عربوں کی نظر میں: ۱/۴،۱۷۴،۱۷۵،۱۷۸، ۱۷۹،۲۰۴،۲۰۵،۲۱۰)

مسعودی اپنی کتاب مروج الذھب ومعادن الجوہر میں لکھتے ہیں:

پھر دبشلیم کا زمانہ آیا اور اسی نے کلیلہ و دمنہ تیار کرائی تھی، جس کا ابن مقفع نے عربی میں ترجمہ کیا ہے اور سہل بن ہارون نے مامون کے لئے ثعلہ وعفرہ کے نام سے اس کے جواب میں ایک کتاب لکھی تھی، جس میں کلیلہ ودمنہ کے ابواب اور اس کی مثالوں کا مقابلہ کیا گیا تھا، یہ کتاب حسن ترتیب میں کلیلہ ودمنہ سے بہتر ہے، اس کی حکومت ۱۱۰/ سال رہی، اس بارہ میں بیانات مختلف ہیں۔

واعظم ملوك الهند فی وقتنا هذا البلهرا صاحب مدينة المانكير واكثر ملوك الهند تتوجه فی صلاتها نحوه وتصلی لرسله اذا وردوا عليهم ويلی مملكة البلهرا ممالك كثيرة للهند.

''ہمارے زمانہ میں ہندوستان کا سب سے بڑا راجہ بلہرا ہے، جو سلطنت مانکیر (مہانگر) کا مالک ہے اور اکثر ہندوستانی راجہ اپنی عبادت میں اس کی جانب رخ کرتے ہیں اور اس کے ایلچی جب ان کے درباروں میں پہنچتے ہیں تو وہ کورنش بجالاتے ہیں، بلہرا کی سلطنت سے ملی ہوئی ہندوستان کی بہت ساری حکومتیں ہیں۔''

ثم تيز مكران ثم ساحل السند وفيه مصب مهران وهو نهر السند على حسب ما ذكرنا وهنالك مدينة الديبل به يتصل ساحل الهند الی بلاد بروص واليها يضاف القنا البروصی ثم يتصل الی ارض الصين ساحلا واحدا عامرا وغامرا.

مکران کے بعد سمندر کے کنارے تیز مکران اور پھر ساحل سندھ پڑتا ہے اور جیسا کہ ہم نے بیان کیا ہے، یہیں دریائے سندھ آ کر گرتا ہے اور یہیں دبیل کا شہر ہے، جس سے ہندوستان کا ساحل ملا ہوا ہے، جو بھروچ کے علاقہ تک چلا گیا ہے اور بھروچ کی طرف بھروچی نیزے منسوب ہیں اور یہی ساحل آبادی اور ویرانہ سے گزرتا ہوا چین تک چلا گیا۔

ثم رأيتُ ببلاد كنباية من ارض الهند وهی المدينة التی يضاف اليها النعال الكنباياتية الصرارة وفيها تعمل ومايليها من المدن مثل مدينة سندان وسوفاره وكان دخولی لها سنة ثلث وثلثمائة والملك يومئذ بانيا وكان برهمانيا من قبل البلهرا صاحب المانكير.

وكان لبانيا هذا عناية بالمناظرة مع من يرد الى بلده من المسلمين وغيرهم من اهل الملل وهذه المدينة على خورمن اخوار البحر وهذا الخليج اعرض من النيل او كدجلة او الفرات عليه المدن والضياع والعمائر والجنان ونخل النارجيل والطواويس والببغاء وغير ذلك من انواع طير الهند بين تلك الجنان والمياه وبين مدينة كنباية وبين البحرالذى يخرج منه هذا الخليج يومان او اقل من ذلك ولحق فريق من ولد عامور بتخوم الهند فاثرت فيهم تلك البقاع فصارت الوانهم بخلاف الوان الترك ولحقوا بالوان الهند، ولهم حضر وبوادى.

میں نے ہندوستان کے شہر کھنبایت میں دیکھا اور یہی وہ شہر ہے جس کی طرف کھنباتی جوتے منسوب ہیں، جو یہاں اور اس کے قریب سندان اور سوپارہ وغیرہ شہروں میں بنتے ہیں، میں کھنبایت ۳۰۳ ھ میں گیا تھا، اس زمانہ میں وہاں کا راجہ بانیا تھا، جو برہمنی مذہب کا پابند تھا اور مہانگر کے راجہ ولبھ رائے کے ماتحت تھا۔

اس بانیا کو مناظرہ سے بڑی دل چسپی تھی اور جو مسلمان یا دوسرے مذاہب کے لوگ اس کے ملک میں آتے، وہ ان سے بحث ومناظرہ کرتا تھا، کھنبایت خلیج سمندر کے کنارے سے آباد ہے، یہ خلیج نیل سے زیادہ چوڑی اور دجلہ وفرات کے مانند ہے، اس کے کنارے شہر، قصبات، آبادیاں، باغات، ناریل کے درخت، پرندوں میں مور، طوطے اور دوسری قسم قسم کی ہندوستانی چڑیاں ہیں، وہ انہیں باغوں اور چشموں میں رہتی ہیں، کھنبایت اور سمندر میں جہاں خلیج کا مخرج ہے، درمیانی فاصلہ دو دن یا اس سے کم ہی ہے، عامور (جو ایک ترک کا نام ہے) اس کی اولاد میں سے ایک جماعت ہندوستان کی حدود میں آ کر آباد ہو گئی تھی، اس لئے اس مقام کی آب وہوا کا اس پر اثر پڑا، جس کی وجہ سے اس کا رنگ ترکوں کے رنگ سے بدل

کر ہندوستانیوں کے رنگ میں مل گیا اور اب ان لوگوں کے شہر اور بستیاں ہیں۔

ثم بحر لاروی و علیه بلاد صیمور سوباره وتانة وسندان و کنبایة وغیرها من الهند والسند ثم بحر هند ثم بحر کلاه وهو بحر کله والجزائر.

پھر بحری لاروی (بحر فارس) ہے، جس کے کنارے ہندوستان اور سندھ کے شہر چیمور، سوپارہ، تھانہ، سندان اور کھنبایت وغیرہ آباد ہیں، پھر اس کے بعد بحر ہند، بحر کلا یعنی بحر کلہ اور جزیرے وغیرہ واقع ہیں۔

ولغة السند خلاف لغة الهند، والسند مما یلی الاسلامیة ثم الهند ولغة المانکیر وهی دارمملکة البلهرا کیریة مضافة الی الصنع وهی کره ولغة ساحله مثل سیمور وسوفاره وتانه وغیر ذلك من مدن الساحل لاریة وبلدتهم مضافة الی البحرالذی هم علیه وهو لاروی وقد تقدم ذکره فیما سلف من هذا الکتاب.

''سندھ کی زبان ہندوستان سے مختلف ہے اور سندھ اسلامی مما لک سے قریب تر ہے، اس کے بعد ہندوستان پڑتا ہے، مہانگر یعنی ولبھ رائے کی سلطنت کے پایۂ تخت کی بولی کھڑی ہے، یہی اس کے اطراف وجوانب کی زبان ہے، مگر ثقیل ہے، ساحل یعنی چیمور، سوپارہ اور تھانہ وغیرہ ساحلی شہروں کی زبان لاری ہے، (یعنی بھروچی قدیم گجراتی) ان کا شہر جیسا کہ اس کتاب میں پہلے ذکر ہوا ہے، بحر لاروی کی جانب جس کے کنارے وہ لوگ آباد ہیں؛ منسوب ہے۔'' (ہندوستان عربوں کی نظر میں: ۱/ ۲۳۷، ۲۵۴، ۲۶۰، ۲۶۴، ۲۶۵، ۲۶۹، ۲۸۸)

وفیلة الحربیة لاتحصی کثرة وتدعی بلاده ایضا بلاد الکمکر ویحاربهم ملك الجزر من احدی جهات مملکه وهو ملك کثیر الخیول والابل والجنود ویزعم انه لیس فی ملوك العالم اجل منه الا صاحب اقلیم بابل وهو الاقلیم الرابع

وذلك ان هذا الملك ذو نخوة وصولة على سائر الملوك وهو مع ذلك مبغض للمسلمين وهو كثير الفيلة ، فى ارضه معادن الذهب والفضة ومبايعتهم بها.

''اور جنگی ہاتھیوں کی تعداد تو بے شمار ہے، اس کے ملک کا نام لکم بھی ہے، گجرات کا راجہ اس سلطنت کی ایک سمت سے اہل لکم سے لڑائی کرتا ہے، اس کے پاس گھوڑوں، اونٹوں اور لشکر کی بڑی تعداد ہے، اس کا خیال ہے کہ اقلیم چہارم کے ملک بابل کے بادشاہ کے سوا دنیا کا اور کوئی بادشاہ بھی اس سے بڑا نہیں ہے، یہ راجہ بڑی نخوت، شوکت اور دبدبہ والا ہے اور مسلمانوں کا سخت دشمن ہے، اس کے پاس ہاتھی بہت زیادہ ہیں، اس کے ملک میں سونا اور چاندی کی کانیں ہیں اور لین دین اور خرید و فروخت بھی اسی سے ہوتی ہیں۔''

ولقد حضرت فى بلاد صيمور من بلاد الهند من ارض الارمن مملكة البلهرا وذلك فى سنة اربع وثلث مائة والملك يومئذ على صيمور المعروف بجانج وبها يومئذ من المسلمين نحو من عشرة آلاف قاطنة بياسرة وسيرافيين وعمانيين وبصريين وبغداديين ومن سائر الامصار ممن قد تأهل وقطن فى تلك الديار فيهم خلق من وجوه التجار مثل موسى بن اسحاق الصند ابوري وعلى الهنرمة يومئذ ابوسعيد معروف بن زكريا والهنرمة يراد به رئيس المسلمين وذلك ان الملك يملك على المسلمين رجلا من رؤسائهم تكون احكامهم مصروفة اليه ومعنى البياسرة يراد به الذين ولدوا من المسلمين بارض الهند يدعون بهذا الاسم وحدهم بيسر.

''میں ۳۰۴ھ میں ہندوستان کے شہر چیمور میں جو راجہ ولبھ رائے کی مملکت لار کا علاقہ ہے، موجود تھا اور اس زمانہ میں جو راجہ تھا اس کا نام جانج تھا اور اس وقت تقریبا دس ہزار

مسلمان وہاں آباد تھے، جو اصل میں بیاسرہ، سیراف، عمان، بصرہ، بغداد اور دوسرے ملکوں کے تھے، لیکن ان علاقوں میں بود و باش اختیار کرلی ہے، ان میں سے بہت سے معزز اور بڑے تاجر ہیں، جیسے موسی ابن اسحاق صنداپوری اور ہنرمندی کے عہدہ پر ان دنوں ابوسعید معروف بن زکریا مامور تھے، ہنرمند سے مراد مسلمانوں کا سردار ہے، اس کی شکل یہ تھی کہ راجہ کا قاعدہ تھا کہ وہ کسی مسلمان رئیس ہی کو ان کا سردار بنادیتا تھا اور مسلمانوں کے تمام معاملات اسی کے سپرد ہوتے تھے، بیاسرہ سے وہ مسلمان مراد ہیں جو ہندوستان میں پیدا ہوئے، اسی نام سے وہ مشہور ہیں، اس کا واحد بیسر ہے۔''

(یہ غالبا گجراتی لفظ ہے، جس کی اصل بے سرا، جس کے معنی دوسرا والا یعنی وہ شخص جو عربی اور ہندی مخلوط نسل سے پیدا ہوا ہو۔) (عرب و ہند کے تعلقات:۲۸۱)

وقد يحمل من ارض الهند من بلاد سندان ونحو كنباية من مملكة البلهرا صاحب المانكير المقدم ذكره فيما سلف من هذا الكتاب نوع من الزمرد ويلحق بما وصفناه من النور والخضرة والشعاع الا انه حجر صلب اصلب مما وصفنا واثقل مما ذكرنا ولا يفرق بين هذا النوع المحمول من ارض الهند وبين الانواع الاربعة المقدم ذكرها الا ذو دراية فطن او ماهر فيه وهذا النوع الهندی يعرفه اصحاب الجواهر بالمكی لانه يحمل من ارض الهند الى بلاد عدن وغيرها من سواحل اليمن وتوتى به مكة، فاشتهر بهذا الاسم وبان بهذا النعت.

''ہندوستان میں مہانگر کے راجہ بلہرا کی سلطنت سے جس کا پہلے ذکر ہو چکا ہے، کھنبایت اور سندان وغیرہ کے علاقوں سے ایک قسم کا زمرد باہر بھیجا جاتا ہے، جو اپنی چمک دمک اور تراش کے اعتبار سے ان زمردوں کے مشابہ ہے؛ جو ہم نے پہلے بیان کیا ہے، البتہ

وہ ان سب سے زیادہ سخت اور بھاری ہوتا ہے،اس زمرد میں جو ہندوستان سے لایا جاتا ہے اور گذشتہ چاروں قسموں کے زمردوں میں بڑے ہوشیار اور ماہرین ہی فرق کر سکتے ہیں،اس ہندی جوہر کو جوہری لوگ مکی کہتے ہیں،اس لئے کہ وہ ہندوستان سے عدن اور یمن کے ساحلی علاقوں سے ہوتا ہوا مکہ لایا جاتا ہے،اس لئے اسی نام اور صفت سے مشہور ہے۔‘‘(ہندوستان عرب کی نظر میں:۱/ ۲۹۱،۳۰۹،۳۱۰،۳۲۸)

مؤرخ اصطخری اپنی کتاب ’’المسالك و الممالك‘‘میں لکھتے ہیں:

واما مدن الهند فهی قامهل و كنباية و سوفاره و سندان و صيمور و الملتان و جندراور و بسمد فهذه من مدن هذه البلاد التی عرفناها.

’’ہندوستان کے شہر قامہل ،کھنبایت ،سوپارہ ،سندان ،چیمور ،ملتان ،جندراور اور بسمد ہیں،ان علاقوں کے ان شہروں کے نام ہم کو معلوم ہیں۔‘‘

ومن كنباية الى صيمور من بلد بلهرا بعض ملوك الهند وهی بلاد كفر الا ان هذه المدن فيها المسلمون ولايلی عليهم من قبل بلهرا الامسلم وبها مساجد يجمع فيها الجمعات ومدينة بلهرا التی يقيم فيها مانكير وله مملكة عريضة.

’’کھنبایت سے راجہ بلہرا کے شہر چیمور تک سب ہندوؤں کے شہر ہیں،مگر ان میں کچھ مسلمانوں کی بھی آبادی ہے اور راجہ بلہرا کی طرف سے کوئی مسلمان ہی ان کے معاملات کا نگران ہوتا ہے،ان شہروں میں مسجدیں اور جامع مسجدیں ہیں،جن میں نماز جمعہ ادا کی جاتی ہے،بلہرا کی راجدھانی کا نام مہانگر ہے،جہاں وہ رہتا ہے،اس کی سلطنت بہت وسیع ہے۔‘‘

وقامهل مدينة من اول حد الهند الى صيمور فمن صيمور الى قامهل من بلد الهند.

’’قامہل ہندوستان کی سرحد کا پہلا شہر ہے، جو چیمور تک چلی گئی ہے اور چیمور سے قامہل تک جنوب میں ہندوستان کے شہر ہیں۔‘‘

وبقامهل وسندان وصيمور وكنباية مسجد جامع وفيها احكام المسلمين ظاهرة وهى مدن خصبة واسعة وبها نارجيل والموز وانبج والغالب على زروعهم الارز وبها عسل كثير وليس بها نخيل.

’’قامہل، سندان، چیمور اور کھنبایت میں جامع مسجدیں اور مسلمانوں کے احکام و قوانین رائج ہیں، یہ بڑے زرخیز اور وسیع شہر ہیں، یہاں ناریل، کیلا اور آم کے درخت ہوتے ہیں، زراعت زیادہ تر دھان کی ہوتی ہے، شہد بھی بہت ہوتا ہے، مگر کھجور کے درخت نہیں ہے۔‘‘

وبين بانية وقامهل مفاوز ومن قامهل الى كنباية ايضا مفاوز ثم يكون حينئذ من كنباية الى صيمور قرى متصلة وعمارة للهند، وزى المسلمين والكفر بها واحد فى اللباس وارسال الشعر ولباسهم الازر والميازر لشدة الحر ببلدانهم

.

’’بانیہ اور قامہل کا پورا علاقہ میدان ہے، قامہل سے کھنبایت تک بھی میدان ہی میدان ہے، پھر یہاں سے چیمور تک مسلسل گاؤں اور ہندوستانی آبادیاں ہیں، یہاں ہندوؤں اور مسلمانوں کا لباس ایک ہی ہے، سب کے سب زلف دراز رکھتے ہیں، ان شہروں میں شدت کی گرمی پڑتی ہے، اس لئے سب لنگی اور کرتہ استعمال کرتے ہیں۔‘‘ (ہندوستان عربوں کی نظر میں: ۱/ ۳۶۶، ۳۷۷، ۳۷۴، ۳۷۵)

شمس الدین بشاری مقدسی اپنی کتاب احسن التقاسیم فی معرفۃ الاقالیم میں رقم طراز ہیں:

واما السند فقصبتها المنصورة ومن مدنها دبيل، زندريج، كدار، مايل، قنبلى. وقال الفارسى النيرون، قالّرى، انّرى، بلّرى، المسواهى، البهرج، بانية، منجابرى، سدوسان، الرور، سوبارة، كيناص، صيمور.

سندھ کا پایۂ تخت منصورہ ہے اور مشہور شہروں میں دبیل، زندریج، کدار، مائل، قنبلی ہے اور فارسی (اصطخری) نے نیرون، قالری، انری، بلری، مسواہی، بھروچ، بانیہ، منجابری، سدوسان، رور، سوپارہ، کیناص اور چیمور کو بھی اسی میں شامل کیا ہے۔

سندان و صيمور و كنباية مدن خصبات رخيصة الاشعار ومعدن الارزاز و العسل.

''سندان، چیمور، کھنبایت سرسبز وشاداب ہیں، یہاں چیزیں ارزاں ملتی ہیں، چاول اور شہد کی تو گویا کان ہیں۔'' (ہندوستان عربوں کی نظر میں: ۳۸۲/۱، ۳۹۶)

ابن بطوطہ کا سفر

کھمبایت میں ورود، ایک عجیب داستان

ساگر (سونگدھ) سے چل کر ہم کھمبایت پہنچے، یہ شہر سمندر کے کنارے ایک کھاڑی پر واقع ہے جو سمندر کے مشابہ ہے، اس میں جہاز داخل ہو سکتے ہیں، اور مد و جزر بھی ہوتا ہے، پانی اتر جانے کے وقت میں نے وہاں بہت سے جہاز کیچڑ میں دھنسے ہوئے دیکھے، جب سمندر کا پانی چڑھ آیا تھا تو وہ تیرنے لگ جاتے تھے، یہ شہر دوسرے تمام شہروں کی بہ نسبت مضبوط اور خوب صورت بنا ہوا ہے، اس میں عمارت اور مسجدیں بہت اچھی اچھی ہیں، اکثر باشندے پردیسی سوداگر ہیں، وہ اکثر عالیشان محل اور بڑی بڑی مسجدیں بنواتے ہیں اور ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کرتے ہیں۔ (یہ بہت قدیم شہر ہے، یہاں کے نوابوں نے مرہٹوں کو کبھی خراج نہیں دیا، اگرچہ سارے گجرات پر مرہٹوں کا تسلط تھا۔ یہاں محمد تغلق

کے عہد کی ایک مسجد جامع بھی ابتک موجود ہے۔)

جب ہم کھمبایت پہنچے تو وہاں کا حاکم مقبل تلنگی تھا، بادشاہ اس کی بہت قدر کرتا تھا، شیخ زادہ اصفہانی اس کی صحبت میں رہتا تھا اور اس کی طرف سے کل امور اس کے سپرد تھے، یہ شیخ امور سلطنت سے خوب واقف تھا اور بہت مالدار ہو گیا تھا اور اپنے ملک میں اپنی دولت بھیجتا جاتا تھا اور بھاگنے کے لئے کسی حیلہ کی فکر میں تھا، بادشاہ کو اس کی خبر پہنچی، کسی نے ذکر کیا کہ وہ بھاگنا چاہتا ہے، بادشاہ نے مقبل کو لکھا کہ اس کو ڈاک میں دارالخلافہ کی طرف روانہ کر دے، ملک مقبل نے اس کو بھیج دیا، جب وہ بادشاہ کے روبرو حاضر ہوا تو اسے پہرہ میں دے دیا اور یہ اس ملک کا دستور ہے جب کسی کو پہرہ میں دیتے ہیں تو شاذونادر ہی وہ بچتا ہے، اس شیخ نے پہرہ دار سے سازش کر لی اور اس کو بہت سا مال دینا طے کیا اور دونوں بھاگ گئے۔

(گاوی) کاوی وقندھار میں آمد

کھمبایت سے چل کر ہم گاوی (کاوی) میں پہنچے، وہ ایک کھاڑی کے کنارے پر ہے ،جس میں مدوجزر ہوتا ہے، یہ رائے جالینسی ایک ہندو راجہ کے علاقہ میں ہے، وہاں سے چل کر ہم قندھار پہنچے، یہ ایک بہت بڑا شہر ہندوؤں کا سمندر کے کنارے پر واقع ہے، وہاں کے راجہ کا نام جالینسی ہے، وہ بادشاہ اسلام کے ماتحت ہے اور ہر سال خراج ادا کرتا ہے، جب ہم قندھار پہنچے تو وہ ہمارے استقبال کے لئے باہر آیا اور ہماری بڑی تعظیم کی اور اپنا محل ہمارے لئے خالی کر دیا اور ہم اس میں اُترے، بڑے بڑے مسلمان امیر اس کی طرف سے ہمارے استقبال کو آئے، ان میں خواجہ بہرہ کے بیٹے بھی تھے اور ناخدا ابراہیم تھا۔ یہ شخص چھ جہازوں کا مالک ہے۔

مغربی گھاٹ

بیرم وقوقہ کے جزیروں میں داخلہ اور وہاں کی سیر

دودن سفر کرنے کے بعد جزیرہ بیرم (یہ جزیرہ اب بھی خلیج کھمبات میں واقع ہے) میں پہنچے، یہ جزیرہ غیرآباد ہے اور خشکی سے چار میل کے فاصلے پر ہے، ہم اس جزیرے میں ٹھہرے اور پانی لیا، غیرآباد ہونے کا سبب یہ بتاتے ہیں کہ مسلمانوں نے یہاں کے کافروں پر حملہ کیا پھر ہندوؤں نے آباد نہیں کیا، ملک التجار نے اس کے بعد آباد کرنے کا ارادہ کیا اور فصیل بنا کر اس پر منجنیق لگائے اور مسلمانوں کو لاکر آباد کیا۔

وہاں چل کر ہم دوسرے دن قوق (یہ ضلع احمد آباد میں واقع ہے، یہاں کے باشندے جہاز رانی میں بڑے مشاق ہیں، اکبر کے زمانے میں یہ بھروچ میں شامل تھا) میں پہنچے، یہ بہت بڑا شہر ہے، اس کے بازار وسیع ہیں، ہم نے شہر سے چار میل کے فاصلے پر لنگر ڈالا کیونکہ یہ جزر کا وقت تھا اور پانی اترا ہوا تھا، ہم کشتیوں میں بیٹھ کر شہر کی طرف چلے، جب شہر ایک میل رہ گیا تو کشتی پانی نہ ہونے کے باعث کیچڑ میں دھنس گئی، میں دو آدمیوں کے سہارے سے گیا، کیونکہ لوگ کہتے تھے کہ پانی چڑھ گیا یعنی مد کا وقت آگیا تو مشکل ہوگی اور میں اچھی طرح سے تیرنا بھی نہیں جانتا تھا، میں نے شہر میں پہنچ کر بازاروں کی سیر کی اور ایک مسجد کو جو حضرت خضر اور حضرت الیاس کی طرف منسوب ہے زیارت کی، وہیں مغرب کی نماز پڑھی، اس مسجد میں حیدری فقیروں کا ایک گروہ تھا اور ان کا شیخ بھی ساتھ تھا پھر واپس چلا آیا، وہاں کے راجہ کا نام ونکول ہے، وہ برائے نام بادشاہ کا مطیع ہے، حقیقت میں نافرمان ہے۔ (سفرنامہ ابن بطوطہ، اردو: قسط:۴، ص:۶۸-۷۱)

یہاں کی تمام تجارت، کاروبار اور اثر واستیلاء تاجروں اور جہاز رانوں کے ہاتھ میں

نظر آتا ہے، ایک نومسلم ہندوالیاس نامی ناخدا ہے، مسلمانوں کی ہر طرف کثرت ہے، تاجروں کی بنائی ہوئی مسجدیں اور صوفیاء کی خانقاہیں آباد ہیں، کہتا ہے کہ عمارت اور مساجد کی حیثیت سے یہ بہترین شہر ہے اور اس کا سبب یہ ہے کہ یہاں کے اکثر باشندے دوسرے ملکوں کے تاجر ہیں تو وہ ہمیشہ عمدہ مکانات اور خوبصورت مسجدیں بناتے رہتے ہیں اور اس میں باہم مسابقت کرتے ہیں، عالیشان عمارتوں میں سے شریف سامری کا محل ہے، اس کے پہلو میں عظیم الشان مسجد ہے اور ملک التجار گازرونی کا مکان ہے اور اس کے پہلو میں بھی مسجد ہے، شہر میں حاجی ناصر دیار بکری صوفی کی خانقاہ ہے، دوسری خواجہ اسحاق کی ہے، جہاں لنگر قائم ہے۔ (ابن بطوطہ، جلد:۲،ص:۱۲۸، ۱۲۹،م: خیریہ مصر)

ایک گجراتی راجہ کا بے مثال مذہبی انصاف

چھٹی صدی عیسوی کے اخیر میں جب سلطان غوری کے بعد دہلی میں شمس الدین التمش اور سندھ میں ناصرالدین قباچہ حکومت کرتے تھے، محمد عوفی نامی ایک فاضل بخارا سے چل کر ہندوستان آیا تھا اور اس نے غالبا سندھ کے کسی ساحل منصورہ یا دیبل سے نکل کر خلیج فارس، سواحل عرب اور ہندوستان کی مختلف بندرگاہوں کی سیاحت کی تھی، چنانچہ اس سلسلہ میں وہ کھنبایت بھی پہنچا تھا، اس کی دو کتابیں اس وقت باقی ہیں، ایک فارسی شاعروں کا تذکرہ جس کا نام لباب الالباب ہے، جو ناصرالدین قباچہ کے وزیر کے نام لکھی ہے اور وہ دو جلدوں میں گب سیریز لندن سے شائع ہو چکی ہے، دوسری کتاب اس سے زیادہ بڑی ہے، اس کا نام جامع الحکایات ولامع الروایات ہے، اس میں مصنف نے کچھ اپنے کانوں سنے اور اپنی آنکھوں دیکھے اور کچھ دوسری کتابوں میں پڑھے ہوئے واقعوں اور قصوں کو عنوانوں میں ذکر کیا ہے، یہ کتاب سلطان شمس الدین التمش کے وزیر قوام الدین جنیدی کے

نام سے لکھی ہے اوراب تک حلیۂ طبع سے محروم ہے،اس کا ایک قلمی نسخہ دارالمصنفین کے کتب خانہ میں بھی موجود ہے۔

محمد عوفی نے اس کتاب کے دوسرے باب ''درذکرملوک طوائف واحوال ایشاں''میں ایک عجیب وغریب قصہ لکھا ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہندومسلمانوں کے تعلقات اس ملک میں عربوں کے عہد میں کیسے تھےاور ہندوراجہ اپنی رعایا کے ساتھ کس طرح انصاف سے پیش آتے تھے، محمد عوفی کا یہ سفر ۶۲۵ھ سے پہلے ہوا تھااور جو واقعہ اس نے بیان کیا ہے وہ یقیناً اس سے پہلے کا ہے اور یہ وہ زمانہ ہے جب گجرات کی طرف صرف ایک سلطان محموداور دوسو برس کے بعد قطب الدین ایبک کے سرسری دھاروں کے سوا وہاں کسی اسلامی حکومت کا نام ونشان بھی نہ تھا۔

یہ قصہ گجرات کے راجہ سدھ راج یا راجہ جنک کی طرف منسوب ہے، جس میں راجہ نے مظلوم مسلمانوں کی دادرسی کے لئے خود نہروالہ سے کھنبایت کا سفر کیا اور ہندوفسادیوں کو سزادی۔

محمد عوفی کہتے ہے کہ ''مجھے ایک دفعہ کھنبایت جانے کا اتفاق ہوا، جو سمندر کے کنارے ایک شہر ہے اور وہاں دیندار مسلمانوں کی ایک جماعت آباد ہے، جو مسافروں کی خوب خاطر تواضع کرتی ہے اور یہ شہر نہروالہ (پٹن) کی سلطنت میں ہے اور یہاں کچھ مسلما نوں اور کچھ ان کے مخالفوں کی آبادی ہے، میں جس زمانہ میں یہاں آیا اس وقت ایک قصہ سنا جو نوشیرواں کے قصہ سے ملتا جلتا ہے اور وہ یہ کہ راجہ جنک کے راج کے زمانہ میں یہاں ایک مسجد تھی جس میں منارہ تھا، اس پر چڑھ کر مسلمان اذان دیتے تھے، پارسیوں نے ہندوؤں کو بھڑکا کر مسلمانوں سے لڑادیا، ہندوؤں نے منارہ توڑ دیا اور مسجد کو مع اسی (۸۰) مسلمانوں کے شہید کرڈالا، مسجد کا امام وخطیب جس کا نام علی تھا، یہاں سے بھاگ کر نہروالہ چلا گیا،

وہاں جا کر راجہ کے درباریوں اور افسروں سے مل کر فریاد کی، مگر کسی نے توجہ نہ دی، امام نے یہ حال دیکھ کر تدبیر یہ کی کہ ہندی (غالباً گجراتی) میں پورا واقعہ ایک قصیدہ میں نظم کیا اور خبر رکھی کہ راجہ شکار کو کب جاتا ہے، جب شکار کا دن آیا تو وہ امام قصیدہ لے کر راستہ میں ایک جھاڑی میں چھپ کر بیٹھ گیا، جب راجہ ادھر سے گزرا تو امام فریادی بن کر سامنے آ گیا اور دہائی دی اور عرض کیا کہ اس کا یہ ایک قصیدہ سن لیا جائے، راجہ نے ہاتھی روک کر اس کی منظوم عرض داشت سنی اور بہت متأثر ہوا اور قصیدہ کو اس کے ہاتھ سے لے کر ایک افسر کے سپرد کر دیا کہ فرصت کے وقت مجھے پھر وہ دکھایا جائے، راجہ اسی وقت شکار سے واپس آ گیا اور وزیر کو بلوا کر کہا کہ میں تین دن تک محل میں رہوں گا اور آرام کروں گا، ان تین دنوں کے اندر کسی کام کے لئے مجھے تکلیف نہ دینا، سب کام تم بطور خود انجام دینا، یہ کہہ کر راجہ محل میں چلا گیا اور رات کو ایک تیز سانڈنی پر بیٹھ کر تن تنہا کھنبایت کی طرف روانہ ہو گیا، نہر والہ سے کھنبایت ۴۰ رفرسنگ ہے، مگر راجہ نے ایک دن رات میں اس راستہ کو طے کیا اور وہاں بھیس بدل کر ایک سوداگر کی صورت میں اترا اور گلی، کوچے اور بازار میں ہر جگہ پھر کر تحقیق کی اور راستہ چلتوں سے باتیں سنیں، ہر ایک کی زبان سے یہی سنا کہ بیچارے مسلمانوں کو بے گناہ مارا گیا اور ان پر ظلم ہوا، راجہ ہر طرح واقعہ کی تحقیق کر کے ایک لوٹے میں سمندر کا پانی بھر کر اس کا منھ بند کر کے اپنے ساتھ لیا اور پھر اسی طرح چوبیس گھنٹے میں سانڈنی پر اپنی راجدھانی کو واپس ہو گیا، صبح کو راجہ نے دربار منعقد کیا، مقدمات سنے اور اسی کے ساتھ مسجد کے اس امام کو یاد کیا، جب وہ دربار میں حاضر ہوا تو راجہ نے اس کو حکم دیا کہ تم اپنی عرض داشت سناؤ، امام نے جب اس کو پڑھا تو ہندو درباریوں نے کہا کہ یہ مقدمہ جھوٹا ہے اور یہ دعوی سرے سے غلط ہے، راجہ نے آبدار کے ساتھ وہ لوٹا منگوایا اور سب کو تھوڑا تھوڑا اس میں سے پلایا، جس نے پیا وہ اس کو گھونٹ نہ سکا اور کہا کہ یہ سمندر کا کھارا پانی ہے، راجہ نے کہا: مجھ کو چوں کہ اس معاملہ میں کسی دوسرے پر بھروسہ نہ تھا، اس لئے میں نے خود جا کر اس کی تفتیش کی اور مجھ پر ثابت ہوا کہ یہ

مسلمان بے شک مظلوم ہیں اوران پر ظلم ہوا ہے، میرے راج میں کسی جماعت پر جو میرے سایہ میں ہوا ایسا ظلم نہیں کیا جاسکتا، اس کے بعد حکم دیا کہ برہمنوں اور پارسیوں میں سے جو اس جرم کے مرتکب ہوئے ہیں، ان کو سزادی جائے اور مسلمانوں کو ایک لاکھ بالوترا (گجراتی سکہ) تاوان دلوایا؛ تا کہ اس سے وہ مسجد اور منارہ دوبارہ بنوالیں اور امام کو خلعت اور انعام دیا، چنانچہ وہ مسجد دوبارہ بنی اور یہ انعامات اس میں بطور یادگار رکھے گئے، چنانچہ ہر سال عید کے دن ان کو نکال کر سب کو دکھایا جاتا ہے۔

محمد عوفی کہتے ہیں:

''آج تک (٦٦٥ھ) یہ چیزیں وہاں رکھی ہیں اور وہ پرانی مسجد اور منارہ بھی باقی تھا، مگر کچھ دن ہوئے بالو (یابالا) کی فوج نے گجرات پر حملہ کیا تو اس مسجد کو ویران کردیا، آخر سعید بن شرف (کسی عرب تاجر) نے اپنے سرمایہ سے اس کو دوبارہ بنوایا ہے اور اس کے چاروں طرف چار سنہرے گنبد بنوائے ہیں اور اسلام کی یہ یادگار اس ہندو ملک میں آج تک قائم ہے۔''

گجرات اور عربوں کے دعوتی واصلاحی تعلقات

گجرات میں اشاعت اسلام اور صوفیائے کرام کی مساعیٔ جمیلہ

برصغیر میں اسلام کی اشاعت کے سلسلہ میں صوفیہ کی بھی گراں قدر خدمات رہی ہیں، انہوں نے اسلام کو ہر طبقہ اور گروہ میں روشناس کرایا، کہیں اسلامی اخلاق کا مجسم نمونہ بن کر لوگوں کو اسلام کی دعوت دی، کہیں سماجی ورفاہی کاموں کے ذریعہ لوگوں کے دل جیتے اور کہیں ہر ایک کے ساتھ مساویانہ برتاؤ کر کے پسماندہ لوگوں کو اپنا گرویدہ بنالیا۔

برصغیر ہند میں صوفیہ کی جدوجہد کا آغاز پانچویں صدی ہجری سے ہوتا ہے، اگرچہ ان کے طریق تبلیغ متعدد رہے ہیں، بعض صوفیہ نے باضابطہ اسلام کی دعوت دی، بعض نے

اصلاح باطن کو اولیت دی اور رسمی تبدیلی مذہب پر زیادہ توجہ نہیں دی، ایسے صوفیہ غیر مسلمانوں کو بھی اپنے حلقہ ارادت میں داخل کرتے تھے اور ان کی اسی طرح اصلاح کیا کرتے تھے جس طرح مسلمانوں کی، ان کا عندیہ تھا کہ ذکر الٰہی خود ایک نور ہے اور اس کی برکت سے دل خود بخود اسلام کی طرف مائل ہو جائے گا۔

صوفیہ کے ذریعہ اسلامی مساوات کا جو عملی مظاہرہ ہوا اس نے بھی کچھ لوگوں کو اسلام کے قریب کیا ہوگا، خاص طور پر ایسے حالات میں جب ایک طرف بدھ اس سماجی مساوات کو قائم کرنے کے لئے کوشاں تھے اور دوسری طرف برہمن عدم مساوات کو جبریہ نافذ کرنا چاہتے تھے، گیارہویں صدی کی ایک سنسکرت کتاب جس کے مصنف ایک بدھ عالم تھے، اس میں مسلمانوں کے تصور مساوات کی بڑی تحسین کی گئی ہے، اس کے ایک اشلوک کا ترجمہ یہ ہے:

''ذات پات کے امتیاز آہستہ آہستہ غائب ہو جائیں گے، کیوں کہ ہر ہندو خاندان میں ایک مسلمان موجود ہے۔''

صوفیہ کرام کا ایک اسلوب دعوت یہ بھی تھا کہ وہ افہام وتفہیم یا دعوت وارشاد کے مقابلہ میں خرق عادت کا بھی سہارا لیتے تھے، غالبا اس کی ضرورت سادھوؤں اور جوگیوں کے مقابلہ میں پیش آئی ہوگی، چنانچہ بہت سے جوگیوں کے مقابلہ میں صوفیہ نے بھی اس طرح اعمال کر کے دکھائے، اسی طرح ایسے واقعات بھی ملتے ہیں کہ کہیں دیو کو مار دیا اور اس سے لوگوں کو نجات دلائی وغیرہ، اگر چہ ایسے واقعات کا پایہ استناد محتاج دلیل ہوتا ہے، لیکن ان کی معنویت سے کلی انکار بھی نہیں کیا جا سکتا۔

صوفیہ کرام لوگوں کو ذکر کی برکت یا فیض صحبت یا دعوت کے ذریعہ اسلام کے قریب کرتے تھے، جس سے بہت سے افراد اسلام کے حلقہ بگوش ہو جاتے تھے۔ (برصغیر میں اسلام کی تاریخ: ۲۳-۲۵)

سلاطین اور امراء کی بھی صوفیاء سے وابستگی رہی اور وہ لوگ صوفیاء کے آستانوں پر جھکتے رہے اور نعم الامیر علی باب الفقیر کے مصداق بنے۔

صوفیہ سے عقیدت کے اسباب

سلاطین کے صوفیہ کے آستانے پر جھکنے کے کئی اسباب تھے، ہندوستان میں مسلمانوں کے ابتدائی دور حکومت میں اتنے جلیل القدر صوفیہ گذرے کہ وہ خواص وعوام دونوں کے دلوں پر چھائے رہے، ان کی درویشی میں شہنشاہی تھی، ان کی قلندری میں شان سکندری تھی، سلاطین کے دربار میں عجم کا ''حسن طبیعت'' دکھائی دیتا تو ان بوریا نشینوں کی خانقاہوں میں ''عرب کا سوز دروں'' ملتا تھا، ان کی حکمت ملکوتی اور علم لاہوتی سے لوگوں کے درد کا درماں ہوتا رہتا تھا، وہ شبنم بن کر جگر لالہ میں ٹھنڈک پیدا کر سکتے تھے تو طوفان بن کر دلوں کو دہلا بھی سکتے تھے، اسی لئے وہ عوام وخواص کے مرجع بن گئے تھے، سلاطین بھی ان کا دامن پکڑنے میں کوئی جھجک محسوس نہیں کرتے تھے۔

اس کے علاوہ بعض سلاطین علماء کی سخت گیریوں سے گھبرا جاتے تو ان کو صوفیائے کرام کے روحانی دامن میں پناہ ملتی تھی، صوفیائے کرام ظواہر کی پابندی میں سختی کرنے کے بجائے سلاطین میں اسلام کے اخلاقی اور باطنی روح پیدا کرنے کی کوشش کرتے، اس سے کبھی کبھی شریعت کی گرفت تھوڑی ڈھیلی ضرور ہوجاتی، لیکن اسلام کے باطنی مزاج کا استیلاء ان پر قائم رہتا جس سے غیر شعوری طور پر حکومت وسلطنت کو فائدہ پہونچتا۔

سلاطین پر صوفیہ کے اثرات

صوفیہ کرام اور سلاطین کی پیری مریدی محض رسمی اور روایتی نہیں ہوتی تھی؛ بلکہ

سلاطین کے مذہبی خیالات وجذبات کے نشو ونما میں ان بزرگوں کے فیوض و برکات کا بڑا دخل رہا کرتا تھا۔

اچھی معاشرت کے معمار صوفیائے کرام

حقیقت یہ ہے کہ اچھی معاشرت اچھے صلحاء اور صوفیہ کے طفیل میں بنتی رہی، اکابر صوفیہ انابت، عبادت اور ریاضت شاقہ کے بعد تمکین وتلوین، مجاہدہ ومشاہدہ کی منزلیں طے کرکے اور عالم ملکوت وجبروت ولاہوت کی دولت سمیٹ کر کے خانقاہوں میں رشد وہدایت کے لئے بیٹھ جاتے تو ان کی ذات تجلی ربانی وروحانی کی ایک شمع بن جاتی اور لوگ پروانہ وار ان کے ارد گرد جمع ہوجاتے اور وہ لوگوں کے اخلاق وسیرت کو اپنے اعلی کردار کے عملی نمونہ سے سنوارنے کی کوشش کرتے اور یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ مسلمانوں کے اعلی اخلاق کی تعلیم کا مرکز علماء کا حلقہ درس وتدریس یا ان کا مسکن نہیں رہا اور نہ سلاطین کے درباروں میں اس کے جلوے دکھائی دیئے بلکہ مسلمانوں کے اخلاق حمیدہ کی تعلیم صوفیائے کرام کی خانقاہوں میں ہوئی اور جب یہاں کے غیر مسلم باشندے مسلمان حکمرانوں کی تلوار کو اسلام کی تلوار سمجھ کر اسلام سے آزردہ اور خوف زدہ ہورہے تھے، تو ان فقر وفاقہ والے بزرگوں کے تزکیہ باطن اور تہذیب نفس کو دیکھ کر ان کے دلوں میں اسلام کی سچی عظمت اور شوکت قائم ہوئی۔

(ہندوستان کے سلاطین علماء اور مشائخ: ۱۰۰، ۱۰۲، ۱۱۷)

گجرات میں جس شہر کو صوفیائے کرام نے سب سے پہلے اپنی رشد وہدایت کا مرکز اور اپنی روحانی سلطنت کا دار الخلافت بنایا وہ نہروالہ یعنی پٹن ہے، یہ شہر گجرات کے ہندو راجاؤں کا دار السلطنت تھا اور ایک بڑا اور پر رونق شہر تھا، احمد آباد کی تعمیر کے بعد پٹن کی اہمیت اور رونق کم ہونے لگی۔

صوفیائے کرام کے پیغام کو شہر میں رہنے والوں سے زیادہ دیہات میں رہنے والوں نے اور اونچی ذات والوں سے زیادہ نیچی ذات والوں نے گوش ہوش سے سنا اور قبول کیا۔

صوفیائے کرام کی صحبت، رشد و ہدایت اور تعلیم و تلقین سے عوام و خواص میں جو جلا ہوئی اس کے اثرات آج تک تاباں و نمایاں ہیں، ان کے فیض و کرم کا دائرہ کسی ایک طبقہ یا جماعت کے لئے مخصوص و محدود نہ تھا، بلکہ اتنا وسیع تھا کہ اس میں ہر ایک کے لئے گنجائش تھی اور معاشی، سماجی، روحانی اور اخلاقی اصلاحات کا جب ان کو خیال آتا تو وہ سب ہی انسانوں کی خوشحالی، فلاح و بہبودی اور بہتری کی تدابیر سوچتے تھے، ان کا فیض عام تھا، رنگ و نسل، ذات پاک اور اعلی ادنی کے امتیازات سے وہ بالاتر تھے، انہوں نے اپنی گفتار سے اور اپنے کردار سے ایک معیاری زندگی کا اعلی نمونہ پیش کیا۔ (مومن قوم اپنی تاریخ کے آئینہ میں: ۳۷، ۳۸)

جن صوفیائے کرام کا تذکرہ مقصود ہے، ان کے جائے قیام اور گجرات میں ان کا ورود مسعود کس دور میں ہوا اس کا قدرے ذکر ضروری ہے، جس میں ہمارے لئے درس عبرت ہے، قصص الاولین مواعظ الآخرین، اگلے لوگوں کے قصے بعد والوں کے لئے نصیحتیں ہیں۔

خلاصہ یہ کہ مجموعی طور پر مختلف علمی جہتوں میں جن حضرات نے مایۂ ناز کام انجام دیئے ہیں اور گجرات کو علمی لحاظ سے ممتاز مقام دلایا ہے، ان چند علماء و مصنفین و مدرسین کی غیر معمولی شخصیتوں میں سے چند کا تذکرہ ان کی امتیازی خصوصیت کے ساتھ درج ذیل سطور میں بطور مثال پیش کیا جاتا ہے۔

پٹن: ساحلی مقامات کو چھوڑ کر گجرات کے جس شہر میں اسلامی مبلغ سب سے پہلے آئے، وہ نہر والہ (یا انہلواڑہ) پٹن ہے، جو احمد آباد کی تعمیر سے پہلے ایک بڑا پر رونق شہر اور گجرات کے ہندو راجاؤں کا دار السلطنت تھا، خوش قسمتی سے اس شہر کے بزرگوں کے حالات

شیخ جہاں سید احمد صاحب نے منازل الاولیاء میں جمع کر دیئے تھےاوران کا خلاصہ گجرات کی مشہور تاریخ مرآۃ احمدی میں درج ہے، انہیں دیکھ کر حیرانی ہوتی ہے کہ مسلمان فاتحین کی آمد سے پہلے مسلمان مشائخ اور داعی کہاں کہاں جا پہنچے تھے!

گجرات میں سب سے پہلے جس بزرگ کا ذکر ملتا ہے، وہ ایک بوہرہ داعی تھے، جنہیں یمن سے تبلیغ کے لئے بھیجا گیا، ان کا نام مختلف روایتوں میں عبداللہ اور محمد لیا جاتا ہے، آپ پہلے کھنبایت آئے، پھر راجہ سدھ راج جے سنگھ (المتوفی: ۵۳۸ھ) کے زمانہ میں پٹن گئے اور برہمنوں کے لباس میں اس کے ملازم ہوئے، بیس سال تک آپ نے اس کے باورچی کی حیثیت سے کام کیا، بالآخر اسے پتہ چل گیا اور اس نے تنہائی میں آپ سے دریافت کیا، آپ نے مسلمان ہونے کا اقرار کیا تو اس نے آپ کو زندہ جلانا چاہا، لیکن معتقدین کہتے ہیں کہ آپ اس سے پہلے ہی وفات پا گئے اور لاش پھولوں کا ڈھیر ہوگئی۔ (غالبًا احباب لاش مخفی طور پر اٹھا لے گئے اور پھول رکھ گئے، جیسا کہ اس عہد میں متعدد واقعات ایسے ہوئے ہیں۔)

بعض لوگوں کا بیان ہے کہ آپ نے راجہ سدھ راج جے سنگھ کو مسلمان بنایا تھا، لیکن پھر وہ مرتد ہوگیا، بوہروں کی تاریخ ''کوکب فلک'' میں لکھا ہے کہ سدھ راج جے سنگھ کو سیدی احمد نے مسلمان بنایا؛ جو مصر سے براہ یمن گجرات کی مشہور بندرگاہ کھنبایت میں آئے اور کچھ مدت کے بعد سدھ راج کو مع وزیر بھارمل اور تارمل کے مسلمان بنایا، لیکن چونکہ یہ لوگ اسماعیلی شیعہ تھے، اس لئے تاعمر تقیہ کرتے رہے اور جب سدھ راج مر گیا تو اس کی وصیت کے مطابق اسے مخفی طور پر دفن کر دیا گیا اور اس کی چارپائی پر پھول رکھ کر لوگوں سے کہہ دیا کہ چوں کہ نیک دل عابد راجہ تھا، اس لئے اس کی لاش کو دیوتا اٹھا لے گئے۔

مشہور صوفی سلسلوں میں نظامی اور سہر وردی بزرگوں نے پٹن پر خاص توجہ کی ہے، حضرت سلطان المشائخ کے تین خلفاء کے نام (سید موسیٰ وراق الحسنی والچشتی ،مخدوم سید حسین خنگ سوار، شیخ حسام الدین عثمانی) پٹن کے بزرگوں میں ملتے ہیں،لیکن اولیت کا شرف شیخ حسام الدین کو حاصل ہے،ان کا وطن ملتان تھا اور حضرت سلطان المشائخ کے خاص خلیفہ تھے، ۶۹۵ھ میں پٹن تشریف لائے اور اکتالیس برس تک رشد وہدایت میں مشغول رہے، ۱۸/ ذوالقعدۃ الحرام ۷۳۷ھ میں وفات پائی ، سید حسین خنگ سواران کے برادرزادہ تھے ، ۷۳۰ھ میں پٹن تشریف لائے اور ۷۹۸ھ میں وفات پا گئے، شیخ حسام الدین کے وجود مسعود سے ملتان اوراچہ کے کئی اور بزرگ یہاں تشریف لائے، ان میں سے ایک شیخ صدرالدین آپ کے بھانجے تھے، جو مع اہل وعیال کے ملتان سے تشریف لائے، پہلے ناگپور میں (جو ریاست جودھپور میں ایک مشہور اور قدیم مقام ہے) مقیم ہوئے اور آپ کی توجہ سے اسلام کو وہاں وقار حاصل ہوا، راجہ کی لڑکی سے آپ نے نکاح کیا، پھر آپ کو شیخ حسام الدین نے مع اپنی بہن اور خاندان کے دوسرے لوگوں کے پٹن بلا لیا، اس زمانہ کے ایک اور بزرگ شیخ جمال الدین اچی ۷۳۰ھ میں پٹن تشریف لائے اور پندرہ سال ارشاد وہدایت کے بعد ۷۴۵ھ میں انتقال کیا، حضرت چراغ دہلوی کی بھی پٹن کی طرف توجہ رہی ہے، چنانچہ ان کے مرید اور عزیز شیخ الاسلام شیخ سراج الدین یہیں آرام فرما ہیں۔

گجرات بالخصوص احمد آباد میں نظامی سلسلہ سے زیادہ سہر وردی سلسلہ نے فروغ پایا، اس سلسلہ کے مرکز ملتان اور اچہ تھے اور سندھ میں اس کے ماننے والے کثرت سے تھے، سندھ اور گجرات میں دور کا فاصلہ نہیں ،اس لئے اس سلسلہ کے بزرگ کثرت سے گجرات آئے اور ان کے تعلقات کا آغاز اس زمانہ میں ہو گیا تھا، جب ابھی احمد آباد تعمیر نہ ہوا تھا اور

پٹن کی آبادی بارونق تھی، حضرت مخدوم جہانیان جہاں گشتؒ کے بھائی سید راجو قتال نے گجرات کی طرف خاص دھیان رکھا، آپ کے کئی مرید (مثلاً سید محمد خدا بخش، سید احمد مخدوم جہاں شاہ) پٹن میں دفن ہیں، آپ نے ہی حضرت قطب عالم کو دو سال خاص طور پر تعلیم دے کر فرمایا کہ اہل گجرات کی ہدایت آپ کے ذمہ کی گئی ہے، چنانچہ حضرت قطب عالم اپنی والدہ کے ساتھ پہلے پٹن تشریف لائے اور جب احمد آباد تعمیر ہوا تو سلطان احمد کی استدعا پر احمد آباد تشریف لے گئے۔

احمد آباد کی بناء سے پٹن کی رونق کم ہوگئی، لیکن پھر بھی اس شہر میں بڑے بڑے فخر روز گار علماء وفضلاء پیدا ہوتے رہے، ان میں سے ایک مولانا محمد طاہر پٹنی تھے، جن کے حالات ہم تفصیل کے ساتھ دوسری جگہ درج کریں گے، انہی خاندان سے عہد عالم گیری کے قاضی القضاۃ قاضی عبدالوھاب، قاضی شیخ الاسلام اور دوسرے مشہور زمانہ علماء پیدا ہوئے ہیں۔

شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ پٹن کی نسبت لکھتے ہیں:

> درپٹن کہ بلدۂ قدیمہ ولایت گجرات است، مشائخ بسیار آسودہ اند، ودر حقیقت دراں سر زمین بوئے عشق ومحبت می آید، واز ویرانہائے وے نور برکت وولایت می تابد، وہنوز ایں شہر از وجود اہل دل خالی نیست ونبودہ است۔

بہر زمین کہ نسیمے ز زلف اوزدہ است　　　ہنوز از سر آں بوئے عشق می آید

احمد آباد ۸۱۳ھ میں آباد ہوا اور نیک نیت بانئ شہر نے آبادی کے وقت بزرگان دین سے استمداد کی، مشہور ہے کہ اس شہر کی ابتدائی بنیاد احمد نام کے چار بزرگوں نے کی، ایک سلطان احمد بن محمد شاہ بن مظفر شاہ بانی شہر، دوسرے شیخ احمد کھٹو گنج بخش، تیسرے ملک احمد،

چوتھے قاضی احمد، بزرگان دین کی دعا اور شاہان گجرات کے اقبال سے جلد ہی یہ شہر اس علاقہ کے باقی شہروں سے بازی لے گیا اور بزرگان دین اور علماء وفضلاء اس شہر میں کثرت سے جمع ہوگئے اور ایک زمانہ میں تو علم وفضل کے لحاظ سے احمد آباد کو دہلی پر فضیلت حاصل تھی۔

بھروچ

ان بزرگوں کے ساتھ جو کسی مشہور سلسلہ سے منسلک نہیں صوفیہ کے تذکروں میں جس طرح بے رخی برتی گئی ہے، اس کا اندازہ باوا ریحان کے ذکر سے ہوتا ہے، جن کا مزار قدیم بھروچ کے باہر گجرات کی ایک قدیمی زیارت گاہ ہے، گجرات بلکہ سارے صوبۂ بمبئی میں مسلمانوں کی سب سے زیادہ دیہاتی آبادی اسی علاقہ میں ہے، بمبئی میں عام طور پر وہ آبادی کا دس فیصدی کے قریب ہیں؛ لیکن ضلع بھروچ میں ان کی آبادی بیس فیصدی سے زیادہ ہے، اس وجہ سے خیال ہوسکتا تھا کہ اس علاقے کے بزرگوں سے بے اعتنائی نہ برتی جائے گی، لیکن حقیقت حال اس سے مختلف ہے، مرأۃ احمدی میں باوا ریحان کی نسبت فقط ایک سطر ہے، ’’بھروچ میں قبر ہے، ۶ر شعبان المعظم کو عرس ہوتا ہے،‘‘ نہ کوئی حالات دیئے ہیں، نہ جائے پیدائش، نہ تاریخ وفات، لیکن زیادہ تحقیق سے پتہ چلتا ہے کہ باوا ریحان، جن کا اصل نام خدا معلوم کیا تھا، بڑے سطوت بزرگ گزرے ہیں، مسٹر فاربس نے ان کی نسبت اپنی کتاب (Oriental Memories) میں لکھا ہے:

> ’’۱۰۷۸ء اور ۴۹۲ھ میں جب بھروچ کے علاقے میں ہندوؤں کا راج تھا، بغداد سے ایک بزرگ باوا ریحان مشائخ اور فقراء کی تعداد کے ساتھ اشاعت اسلام کی غرض سے یہاں وارد ہوئے، لیکن راجہ نے ان کی مخالفت کی اور اپنے بیٹے رائے کرن کو ایک

بڑی فوج دے کر باوا ریحان کے مقابلہ کے لئے بھیجا، رائے کرن باوا صاحب کی شخصیت سے اس قدر متاثر ہوا کہ اس نے باوا صاحب کے ہاتھ پر اسلام قبول کر لیا اور ملک محمد اپنا نام رکھا، ان دونوں کی کوششوں سے راجہ کی بیٹی بھاگ دیوی اور اس کے علاوہ بے شمار دوسرے ہندو اپنا آبائی مذہب چھوڑ کر باوا ریحان کے مرید ہو گئے، لیکن رائے کرن کے باپ نے ان کی مخالفت کی اور باپ، بیٹے میں بڑا سخت معرکہ ہوا، باپ کامیاب رہا اور رائے کرن، اس کی بہن اور نو مسلموں کی بھاری تعداد لڑائی میں شہید ہوئی، اس کے بعد راجہ نے باوا صاحب سے صلح کر لی اور جب ان کی وفات ہوئی تو وہ بھروچ سے باہر ایک بلند ٹیلے پر دفن ہوئے۔''

ایک روایت یہ بھی ہے کہ باوا ریحان کا وطن ماوراء النہر تھا، اپنے بھائی بابا احمد اور چالیس فقراء کے ساتھ پانچویں صدی ہجری میں بھروچ تشریف لائے اور راجہ سے معرکہ کے بعد ۴۳۰ھ میں مدرسہ اور خانقاہ کی تعمیر کی، بعد میں ایک گجراتی سردار عماد الملک نے آپ کے مزار پر گنبد تعمیر کروا دیا۔

ضلع بھروچ کے مسلمانوں میں زیادہ تعداد سنی بوہروں کی ہے، جو کاشت کاری کرتے ہیں اور اپنے کام میں مستعد، ہوشیار اور کفایت شعار ہیں، ان کے علاوہ اس علاقہ میں تھوڑی تعداد راجپوت نو مسلموں کی ہے، جنہیں ''مولے سلام'' کہتے ہیں، ان کے نام اور رسم بہت سی ہندوانہ ہیں۔

راندیر

ضلع سورت میں مسلمانوں کی سب سے قدیم بستی راندیر میں ہے، جو سورت سے تین

میل دور دریائے تاپتی کی دوسری طرف واقع ہے، اب بھی مسلمان اس شہر کی کل آبادی کے چالیس فیصد ہوں گے، یہ شہر سورت کی ترقی سے پہلے بڑا مشہور تھا اور قدیم تاریخوں مثلاً البیرونی کی تصانیف میں اس کا ذکر ہے، ۱۲۲۵ء میں یہاں جینیوں کی حکومت تھی، اس وقت عرب تاجروں اور ملاحوں کی ایک جماعت یہاں آکر آباد ہوئی، جین حاکموں سے ان کا مقابلہ ہوا اور انہوں نے جینیوں کو شکست دے کر شہر پر قبضہ کرلیا، یہ عرب نوائط کہلاتے تھے، اور چوں کہ وہ دور دراز کے ملکوں سے تجارت کرتے تھے، اس لئے ان کی مالی حالت بہت اچھی تھی، اب اس شہر میں نوائط بہت تھوڑے ہیں، لیکن ان کی جگہ سنی بوہروں نے لے لی ہے، جو برما، مشرقی افریقہ اور دوسرے ملکوں سے تجارت کرتے ہیں اور عام طور پر بڑے خوش حال ہیں، اس شہر کی بعض مسجدیں بڑی خوبصورت ہیں اور یہاں ایک تابعی کا مزار بھی بتایا جاتا ہے۔

کھنبایت

راندیر سے بھی مشہور بندرگاہ کھنبایت ہے، جو قدیم ایام سے عرب اور ہندوستان کے درمیان آمدورفت کا راستہ بنی ہوئی ہے، یہاں شروع سے ہی عربوں کی آبادیاں قائم ہوگئی تھیں، ابتدائی بوہرے مبلغ اور کئی دوسرے بزرگ اسی بندرگاہ کے راستہ سے یمن اور عرب کے دوسرے حصوں سے ہندوستان آئے اور آکر گجرات اور کچھ میں اپنے عقائد کی اشاعت میں مشغول ہوگئے، مشہور بوہر فاضل محمد علی جنہیں پیر پرواز بھی کہتے ہیں، پہلے کھنبایت میں تشریف لائے تھے، ان کا مزار آج بھی بوہروں کی مشہور زیارت گاہ ہے۔

کھنبایت میں اور بھی کئی بزرگوں کے مزار ہیں، ابن بطوطہ یہاں ۷۴۳ھ میں آیا، وہ یہاں کی مسجدوں کی بڑی تعریف کرتا ہے اور دو خانقاہوں کا خاص طور پر ذکر کرتا ہے، ایک

حاجی ناصر کی، جوعراق کے شہر دیار بکر کے باشندے تھے اور دوسری خواجہ اسحاق کی جہاں فقیروں کو لنگر تقسیم ہوتا تھا۔

متفرق

دکن اور گجرات کے عوام میں داول شاہ کا نام اسی طرح لیا جاتا ہے جس طرح شمالی ہندوستان میں سید سالار مسعود غازی کا، ان کی یاد میں کئی مقامات پر چلے قائم ہیں اور ہر ایک مقام پر سالانہ عرس ہوتا ہے، آپ کا نام شیخ عبداللطیف تھا اور سلطان محمود بیگڑہ بادشاہ احمد آباد کے امراء میں سے تھے، بادشاہ کی طرف سے آپ کو داور الملک کا خطاب حاصل تھا، جسے بگاڑ کر عوام نے داول شاہ کر لیا، آپ امور ظاہری و باطنی دونوں میں دسترس رکھتے تھے، بادشاہ وقت کی طرف سے بھی آپ فوجی خدمتوں پر مامور ہوتے تھے اور بادشاہ معنوی حضرت شاہ عالمؒ کے بھی چہیتے مرید تھے، حضرت شاہ عالم نے آپ کو شہید ہونے کی بشارت دی، چنانچہ آپ قوم گراسیہ کے چند افراد کو مطیع کرنے گئے تھے کہ انہوں نے فریب سے آپ کو شہید کر دیا، یہ واقعہ ۸۷۹ھ کا ہے، آرنلڈ کا بیان ہے کہ کچھ کے کئی لوگوں کو آپ نے مسلمان بنایا۔

عرب تاجروں کے علاوہ مسلمان سپاہی بھی کئی ہندو سلطنتوں میں ملتے تھے، جنہیں ہندو حکمرانوں نے اپنے ملک کی حفاظت کے لئے ملازم رکھا ہوا تھا، مثلاً سومناتھ کے راجہ کے پاس مسلمان افسروں کی ایک تعداد تھی اور احمد آباد کے قصباتی کہتے ہیں کہ وہ ان خراسانی سپاہیوں کی اولاد ہیں، جو واگھیلا راجاؤں کی فوج میں ملازم تھے۔

سندھ اور گجرات میں شیعیت کی ابتداء

گجرات میں سنی مسلمانوں نے صرف غیر مسلموں میں ہی تبلیغ نہیں کی، بلکہ شیخ محمد بن طاہر پٹنی رحمۃ اللہ علیہ اور دوسرے بزرگوں نے اسماعیلیوں بالخصوص بوہروں کو سنی عقائد پر

مائل کیا، جب ۱۳۹۱ء میں سلطان مظفر اول دہلی سے گجرات کا صوبیدار ہو کر آیا تھا تو وہ اپنے ساتھ سنی علماء کی ایک جماعت لایا تھا، چنانچہ اب گجرات میں سنی مسلمان غالباً شیعہ مسلمانوں سے زیادہ ہیں اور دونوں کل آبادی کا دسواں حصہ ہیں۔

مولانا ابوظفر ندوی رحمۃ اللہ علیہ سندھ میں شیعیت کے سلسلے میں لکھتے ہیں کہ والی منصورہ (سندھ) عمرو بن حفص منصورہ پہنچ کر سلطنت کے انتظام میں مشغول ہو گیا، اسی اثناء میں عبداللہ الاشتر علوی نے چند جان نثاروں کے ساتھ بصرہ پہنچ کر چند اچھے اور عمدہ گھوڑے خریدے اور جہاز پر بیٹھ کر سندھ پہنچے اور لوگوں کو یہ بتایا کہ ہم لوگ گھوڑوں کے تاجر ہیں، حالانکہ ان کا مقصد بنی عباس کے خلاف سادات کے لئے خلافت حاصل کرنا تھا۔

والی منصورہ عمرو بن حفص کے پاس جب یہ لوگ پہنچے تو اس نے ان کی بڑی آؤبھگت کی، ان کو تاجر سمجھ کر گھوڑے پسند کئے اور حکم دے دیا کہ تمام شہر میں جتنے اچھے گھوڑے فروخت کے لئے ہوں وہ ان کے پاس حاضر کئے جائیں۔

خود عبداللہ نے تو اس معاملہ کو ابھی تک راز میں رکھنا چاہا، مگر ان کے ایک ساتھی نے والی منصورہ سے اس کا ذکر کر ہی دیا، اس نے کہا کہ گھوڑوں کے متعلق آپ نے جو حکم دیا ہے، اس کا میں مشکور ہوں، مگر اس سے زیادہ بہتر چیز میں آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں جو دنیا اور آخرت دونوں میں آپ کے لئے باعث نجات ہے، اس کے بعد حالات سے آگاہ کیا، والی خود ان لوگوں میں سے تھا جو سادات کے طرفدار تھے، اس لئے ان کی دعوت کو بڑی خوشی سے قبول کیا اور خود ان کو ایک مخفی جگہ میں رکھا اور شہر کے بڑے بڑے صاحب اثر لوگوں کو بلا کر ان سے مشورہ لیا اور آخر یہ طے پایا کہ ایک دن جمعرات کو بیعت لی جائے اور اس کے لئے ایک سفید عَلَم تیار کیا گیا اور سفید کپڑے عبداللہ کے لئے بنائے گئے، جن کو پہن کر وہ خطبہ دیتے۔

یہ تمام انتظام ٹھیک ہو چکے تھے کہ اتفاقاً اسی دن ایک جہاز بغداد سے آ پہنچا، جس میں ایک تاجر بھی تھا، وہ عراق سے ایک خط عمرو بن حفص کی بیوی کا لایا، جس میں لکھا تھا کہ محمد اور ابراہیم دونوں خلافت کی فوجوں سے شکست کھا کر مارے گئے، عمرو یہ خط لے کر عبداللہ کے پاس پہنچا اور ان کے باپ اور چچا کے مرنے پر تعزیت دی، یہ سن کر عبداللہ اشتر بہت گھبرائے اور مایوسی کے لحظہ میں کہا: میرا راز ظاہر ہو گیا اور اب میری جان تمہارے ہاتھ میں ہے۔

عمرو نے ان کو بڑی تسلی دی اور کہا کہ ہمارے جوار میں ایک بارعب اور بڑا بہادر راجہ رہتا ہے، اس سے خط و کتابت کر کے تمہارے لئے امن کی جگہ بنا دوں گا، چنانچہ اس نے اس سے اس معاملہ میں خط و کتابت کی، چوں کہ وہ ایک بڑی سلطنت کا مالک تھا اور خود مختار تھا، اس لئے خلیفہ کے حکم پر وہ مجبور نہیں کیا جا سکتا تھا اور اپنے قول و قرار کا بڑا پکا تھا، اس بناء پر بھروسہ کے قابل سمجھ کر عمرو نے عبداللہ کو اس کے پاس روانہ کیا، جہاں وہ آرام کی زندگی بسر کرنے لگے، کیوں کہ راجہ ان کی بڑی عزت کرتا تھا اور ہر طرح کی آزادی ان کو دے رکھی تھی۔

(تاریخوں سے یہ معلوم نہ ہو سکا کہ وہ کون راجہ تھا؟ سندھ یا ہندوستان کے کس حصہ پر قابض تھا، لیکن آگے جو بیان آتا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دریائے سندھ کی کسی شاخ کے پاس جو ریگستان سے متصل ہے اس کا مالک تھا، غالباً یہ ''کچھ'' سندھ اور ریگستان کے درمیان واقع ہو گا۔)

جب اس کی خبر ان کے ہوا خواہوں کو معلوم ہوئی تو لوگ ادھر ادھر سے ان کے پاس جمع ہونے لگے، یہاں تک کہ چار سو آدمی ان کے گرد جمع ہو گئے، وہ اپنا تمام وقت عیش و آرام و شکار میں گذارتے تھے اور زیدیہ فرقے کے عقائد کی اشاعت کرتے تھے، کہتے ہیں کہ سندھ

میں شیعیت اسی وقت سے داخل ہوئی۔(تاریخ سندھ:۱۵۰-۱۵۲)

ہندوستان میں اسماعیلی دعوت پر ایک نظر

ملتان کے اسماعیلی حکمران نے سالہا سال کی جدوجہد کے بعد اقتدار حاصل کر کے مصر وافریقہ کی فاطمی حکومت سے اپنا الحاق کرلیا تھا اور وہ اپنے اس مرکز کی مرضی اور اجازت کے بغیر کوئی کام نہیں کرتے تھے، سندھ سے لے کر افریقہ تک ہدایہ وتحائف کا سلسلہ جاری تھا اور دونوں طرف سے نامہ وپیغام اور آدمیوں کی آمدورفت جاری تھی، حتی کہ چند ہی سال کی حکومت میں یہاں اسماعیلی شیعوں نے یوں جڑ پکڑ لی کہ آج تقریبا چار سو سال سے ہندوستان ان کی دعوت کا مرکز ہے، اگر چہ ۳۹۶ھ میں سلطان محمود غزنوی کے ہاتھوں ملتان کی باطنی حکومت ختم ہوگئی تھی، لیکن باطنیوں کی طاقت اندر ہی اندر زور پکڑ رہی تھی اور غوریوں کے زمانہ میں وہ کبھی کبھی کھل کر مقابلہ اور کشت وخون پر بھی اتر آتے تھے، چنانچہ انہوں نے شہاب الدین غوری کے زمانہ میں پنجاب میں بڑی خطرناک صورت اختیار کرلی تھی اور ۶۳۴ھ میں دہلی قتل وغارت کر کے سلطنت پر قبضہ کرنا چاہا تھا۔

اس ملک کی باطنی تحریک کے بارے میں معلومات بہت ہی کم ہیں، کیوں کہ یہ مذہب اپنی ہر بات کو خفیہ رکھنے میں کامیابی سمجھتا ہے، البتہ زمانۂ حال کے ایک اسماعیلی فاضل ڈاکٹر ہمدانی مرحوم نے اپنی کتاب ''الصليحيون والحركة الفاطمية ''میں اسماعیلیت کے ہندوستان میں فروغ کی مختصر تاریخ لکھی ہے، اس کا خلاصہ ہم قاضی اطہر مبارک پوریؒ کے حوالہ سے درج کرتے ہیں:

''شمالی افریقہ میں فاطمی حکومت سے کچھ پہلے تیسری صدی کے آخر میں فاطمی ائمہ دنیا کے مختلف بلاد وامصار میں اپنے داعی اور مبلغ بھیجتے تھے، اسی ضمن میں انہوں نے ہندوستان میں بھی اپنے دعاۃ ومبلغین

روانہ کئے، چنانچہ اسی زمانہ میں یمن کے حاکم وامام ابوالقاسم منصور نے اپنے بھائی ہیثم کو بلاد سندھ کی طرف اسماعیلی دعوت کے لئے بھیجا، جس کے ہاتھ پر بہت سے لوگوں نے اسماعیلی مذہب قبول کیا، ۴۷۶ھ میں یمن کے حاکم الملک المکرّم احمد صلیحی نے مرزبان بن اسحاق بن مرزبان کا ہندوستان میں اسماعیلی دعوت کے لئے انتخاب کیا اور فاطمی پایۂ تخت قاہرہ کی ہدایت کے بموجب مرزبان کو یہاں بھیجا، اس کے مرنے پر ملکہ حرّہ نے فاطمی خلیفہ مستنصر سے مشورہ کرکے مرزبان کے بڑے لڑکے احمد بن مرزبان بن اسحاق کو ۴۸۱ھ میں ہندوستان بھیجا۔

نیز مؤید شیرازی متوفی ۴۷۵ھ نے مستنصر فاطمی کے زمانہ میں قاضی ملک بن مالک حمادی ہمدانی کو تیار کیا کہ وہ صلیحی دور کی دعوت یمینہ کی جانب سے ہندوستان میں داعی کا انتظام کرے، قاضی ملک نے ۴۶۰ھ میں اپنے داعی عبداللہ کو یہاں بھیجا، ان ہی ایام میں ایک روایت کے مطابق مؤید شیرازی کے ہاتھ پر مصر میں ہندوستان کے دو شخص بالم ناتھ (مولائی احمد) اور روپ ناتھ (مولائی نورالدین) اسماعیلی ہوئے، مؤید شیرازی نے قاضی ملک کے ساتھ ان دونوں کو یمن روانہ کیا اور قاضی ملک نے ان کو ہندوستان بھیجا، جنہوں نے گجرات اور دکن کے دیہاتوں اور شہروں میں اسماعیلی دعوت عام کی، یہ ہندوستان کی اسماعیلی دعوت میں یمن کی دعوت کے تابع

رہی، یہاں تک کہ ۹۴۴ھ میں اسماعیلی دعوت یمن سے منتقل ہوکر ہندوستان آگئی اوراس زمانہ سے اسماعیلی مذہب ودعوت کا مرکز بن گیا۔(الصليحيون والحركة الفاطمية فى اليمن، ص:۲۲۲تا۲۲۸ ملخصا)

میمن جماعت

اہل سنت والجماعت کی جس تبلیغی کامیابی کا سب سے زیادہ اثر گجرات کاٹھیاواڑ پر پڑا، وہ گجرات سے باہر حاصل ہوئی، اس وقت پاکستان اور ہندوستان کے تجارت پیشہ طبقے میں میمن جماعت کو جواہمیت حاصل ہے، وہ محتاج بیان نہیں، ان کے آباءواجداد ہندو تھے اور لوہانہ اورایک دودوسری ذاتوں میں منقسم تھے، انہوں نے سب سے پہلے پندرہویں صدی عیسوی میں علاقۂ سندھ میں اسلام قبول کیااور پھر وہاں سے کاٹھیاواڑ، گجرات، بمبئی وغیرہ میں منتقل ہوئے۔

میمن کہتے ہیں کہ پیران پیر حضرت عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ نے آخری وقت اپنے بیٹے تاج الدین کو تلقین کی تھی کہ وہ سندھ میں جاکر اشاعت اسلام کریں، وہ غالباً نہ کر سکے، لیکن ان کی نسل میں سے ایک بزرگ سید یوسف الدین قادری ۱۴۲۱ء میں عراق (عرب) سے سندھ تشریف لائے، اس وقت ٹھٹہ سندھ کا دارالخلافت تھا، سید صاحب نے اسی کو ارشاد وہدایت کا مرکز بنایا اور جلد ہی لوہانہ خاندانوں اوران کے سرگروہ اوران کے بیٹوں کو مسلمان بنانے میں کامیاب ہوگئے، میمن انہی خاندانوں کی نسل سے ہیں اوران کے جانشینوں نے کاٹھیاواڑ کے راجہ کی دعوت پر کاٹھیاواڑ کے مقام مندرہ کو اپنا مرکز بنایا، لیکن جو بیج سید صاحب نے بویا تھا، وہ پھلا پھولا اوراسلامیان ہندوپاکستان میں ایک محنتی، سمجھ دار،

راسخ الاعتقاد اور مخیّر جماعت کا اضافہ ہوا۔

عام طور پر اسماعیلی مصر کے فاطمی خلفاء کو اپنا سیاسی اور مذہبی سربراہ مانتے تھے اور ہندوستانی دو اسماعیلی فرقوں کا اختلاف ان خلفاء کی جانشینی پر ہوا، ان خلفاء میں سے خلیفہ مستنصر کے دو بیٹے تھے، بڑے کا نام نزار تھا اور چھوٹے کا مستعلی، خلیفہ کی وفات کے بعد ان میں جانشینی پر لڑائی ہوئی اور دو فرقوں کا آغاز ہوا، نزار سے جو فرقہ چلا، اس کی ترجمانی خوجے کرتے ہیں اور بوہرے مستعلی کی جانشینی کے قائل ہیں، لیکن یہ اختلاف فقط شخصی نہ رہا، نزاریوں میں حسن بن صباح (المتوفی: ۱۱۲۴ھ) نے اسماعیلی مذہب کو نئے سرے سے ترتیب دیا، مذہب کی اشاعت وتبلیغ کے نئے اصول وضع کئے اور اپنا رشتہ مصر سے توڑ لیا، اب ان کی دعوت کا مرکز ایران تھا، مصر ویمن کے اسماعیلی کی امامت کے قائل اور قدیم مذہبی روایات کے پابند رہے اور جب مصر میں انہیں زوال ہوا تو انہوں نے اپنی دعوت کا مرکز یمن میں منتقل کرلیا، جہاں سے ہندوستان میں ان کے خیالات کی اشاعت ہوتی رہی۔

قرامطہ

اسماعیلی خیالات کی سب سے پہلی جماعت جس کا ذکر پاک وہند کی تاریخ میں ملتا ہے، قرامطہ ہے، جن کے داعی نویں صدی عیسوی ہی میں قاہرہ، عراق، حضرموت اور یمن سے مغربی پاکستان میں آنے شروع ہوئے اور آہستہ آہستہ انہوں نے سندھ اور مغربی پنجاب میں بڑا اقتدار حاصل کرلیا، مذہب کے لئے ان کے دل میں بڑا جوش تھا، ملتان پر قابض ہونے کے بعد انہوں نے شہر کا قدیمی مندر جسے محمد بن قاسم نے برقرار رہنے دیا تھا، اسے مسجد میں تبدیل کردیا، ان کی تبلیغی کوششیں بھی بڑی وسیع اور منظّم تھیں، لیکن اہل سنت والجماعت سے ان کے شدید مذہبی اختلافات تھے اور ہندوستان پر محمود غزنوی کی مہموں کا ایک مقصد قرامطیوں کی بیخ کنی بھی تھا، چنانچہ اس نے منصورہ کے اسماعیلی گورنر کو شکست دے کر ایک سنی

مسلمان کوحکومت تفویض کی، محمود کے جانے کے بعد ان لوگوں نے پھر غلبہ پالیا اور محمد غوری کو دوسری دفعہ ۱۱۷۵ء میں ملتان ان کے قبضہ سے چھڑانا پڑا، سلطان محمد غوری کی موت بھی اسی فرقے کے ایک فدائی کے ہاتھوں ہوئی۔

اسلامی حکومت کے استحکام اور سنی خیالات کی اشاعت کے بعد قرامطہ کا زور جاتا رہا، اب وہ آپ ہی آپ اور خود رو طریقے سے اسماعیلی بن رہے تھے، لیکن غزنوی اور غوری ان سب کو ملحدین سمجھ کر (سیاسی اور مذہبی اسباب کی بناء پر) ان کی بیخ کنی میں سختی سے کوشاں تھے، اب جو لوگ اسماعیلی خیالات کے تھے؛ انہوں نے یا تو اپنے خیالات کے اظہار میں اخفاء سے کام لیا، یا حکومت کے مرکز سے دور گجرات اور کچھ کی طرف چلے گئے، ان لوگوں کے مذہبی عقائد اور سیاسی عزائم میں بھی کچھ تبدیلی ہوگئی، تیرہویں صدی عیسوی کے وسط کے بعد قرامطہ کا ذکر ہندوستانی تواریخ میں نہیں ملتا، لیکن ان کے جانشین خوجے اور بوہرے موجود ہیں، جن کی اہمیت ان کی تعداد سے کہیں زیادہ ہے۔

خوجے

بوہروں اور عام مسلمانوں کے عقائد وعبادات میں وہ اختلاف جو اسماعیلیوں کو فرقہ اہل سنت والجماعت سے ہے، موجود ہے اور ان میں بعض ہندوانہ باتیں بھی ایسی ہیں، جو نومسلم بوہرے اپنے قدیم مذہب سے لے آئے، یا جنہیں بوہرہ مبلغوں نے مقامی سہولتوں کے لحاظ سے اختیار کرلیا، لیکن ان بنیادی اور گنے تلے اختلافات کے علاوہ بوہرے ٹھیٹھ مسلمان ہیں، انہوں نے نزاریوں کی طرح اصول اسلام کو توڑ موڑ کر غیر مسلموں کے حسب مذاق نہیں بنایا، اسماعیلیوں کی دوسری جماعت یعنی آغا خانی خوجوں کی نسبت یہ نہیں کہا جاسکتا، بلکہ ان کے نظام وعقائد میں کئی باتیں نیم مسلم بلکہ خالص طور پر غیر اسلامی ہیں، ہمیں کئی ایسے

خوجوں کے ساتھ رہنے سہنے اور نماز وعبادت کا موقع ملا ہے، جنہیں عام مسلمانوں سے تمیز کرنا بڑا مشکل ہے، لیکن جماعت کا دائرہ بڑا وسیع ہے اور ان میں کئی ایسے طبقے شامل ہیں، جن کا اسلام سے بہت دور کا تعلق ہے۔

نوست گرو

خوجے زیادہ تر پنجاب، سندھ، کچھ، کاٹھیاواڑ اور صوبۂ بمبئی میں پائے جاتے ہیں، ان کے پہلے داعی کا اصلی نام غالباً نور الدین یا نور شاہ تھا۔

لیکن وہ عوام الناس میں نورست گرو کے نام سے مشہور تھے، انہیں بارہویں صدی میں قلعہ الموت سے بھیجا گیا، انہوں نے گجرات میں تبلیغ کی، پہلے وہ گجرات کے دارالخلافت پٹن میں آئے، پھر کچھ عرصے کے لئے ایران چلے گئے، واپس آ کر نوساری کے قرب وجوار میں ارشاد وہدایت شروع کی اور اسماعیلی روایات کے مطابق نوساری کے ہندو راجہ کی بیٹی سے شادی کی، اپنی کرامات سے بہت سے لوگوں کو مسخر کر لیا، اپنا نام ہندوانہ رکھا، لیکن مسلمان انہیں نور الدین یا سید سعادت کہتے تھے اور انہوں نے کنبی، کہار اور کولی قوم کے لوگوں کو جو گجرات کی نیچ ذاتیں تھیں، اسماعیلی مذہب میں شامل کیا۔

مؤرخین نے سلطانہ رضیہ کے واقعات حکومت کے ضمن میں لکھا ہے کہ ۱۲۳۷ء میں نور ترک نامی ایک شخص نے گجرات، سندھ وغیرہ ''قرامطہ وملاحدہ'' کے ساتھ دارالخلافت دہلی پر خروج کیا، اس واقعہ کے متعلق طبقات ناصری میں ذیل کا اندراج ہے:

''اور ان واقعات میں سے: جو سلطانہ رضیہ کے ابتدائے عہد حکومت میں رونما ہوئے، سب سے اہم یہ تھا کہ ہندوستان کے قرامطہ وملاحدہ نور ترک نامی ایک عالم نما شخص کے اکسانے پر ہندوستان کے دوسرے حصوں مثلاً گجرات اور سندھ، دارالخلافت دہلی کے گرد

ونواح اور جمنا اور گنگا کے کناروں سے جمع ہوئے اور مل کر بیعت کی اور اس نور ترک کی انگیخت پر اہل اسلام پر حملہ کیا، یہ نور ترک وعظ کہا کرتے تھے اور عوام الناس اس کے گرد جمع ہوجاتے تھے، وہ اہل سنت والجماعت کو ناصبی اور مرجی کہتا تھا اور عوام الناس کو حنفی اور شافعی علماء کے خلاف بھڑکاتا تھا، حتی کہ ایک دن مقرر ہوا اور ملاحدہ وقرامطہ کا یہ سارا گروہ ۶/رجب المرجب ۶۳۴ھ کو بروز جمعہ قریبا ایک ہزار آدمی کے ساتھ تلواروں، ڈھالوں اور کلہاڑوں سے مسلح ہوکر ایک فوج کی صورت میں جامع مسجد دہلی میں آگھسے، ان کا ایک حصہ نئے قلعے کی طرف سے جامع مسجد کے شمالی دروازے میں آیا اور دوسرا گروہ بازار بزازان میں سے ہوتا ہوا مدرسہ معزی کو جامع مسجد سمجھ کر اس میں آگھسا اور دونوں طرف سے مسلمانوں کو تہہ تیغ کرنا شروع کیا، چنانچہ بہت سے لوگ تو ملاحدہ کی تلواروں کا شکار ہوئے اور کئی ہجوم میں کچلے گئے، جب اس فتنے کے خلاف آواز بلند ہوئی تو دارالخلافت کے بہادر مثلاً نصیر الدین ایتمی اور امیر امام ناصر شاعر اور دوسروں نے زرہ اور خود پہن کر؛ نیزہ وسپر وغیرہ سے مسلح ہوکر مسجد کا رخ کیا اور وہاں پہنچ کر تیغ زنی شروع کی اور جو مسلمان جامع مسجد کی چھت پر تھے، انہوں نے اینٹ اور پتھر برسائے، حتی کہ ملاحدہ وقرامطہ راہئ دوزخ ہوئے اور اس فتنے کا خاتمہ ہوا۔ (ترجمہ از طبقات ناصری، ص:۱۸۹، تاریخ ہندوستان آب کوثر: ص: ۳۲۹-۳۴۱)

سید امام الدین اور مؤمنہ جماعت

نزاری سلسلہ کے ایک اور مبلغ سید امام الدین تھے، جنہیں عوام امام شاہ کہتے ہیں، ان کے پیرو آغا خانیوں کے سلسلۂ امامت کے پابند نہیں، لیکن وہ اپنے بانی کو نزار کی اولاد میں سے بتاتے ہیں اور انہوں نے عام اسماعیلی طریقۂ تبلیغ کی پیروی میں مقامی باشندوں کی کئی باتیں قبول کر لی ہیں، لیکن ان کا امام شاہی یا ست پنتھی طریقۂ اسماعیلی خوجوں کی نسبت کبیر پنتھی اور نانک پنتھی طریقوں سے زیادہ ملتا جلتا ہے اور اس فرقے میں نزاری سلسلۂ امامت کی بھی پابندی نہیں، تاریخ اولیاء گجرات میں سید امام الدین کی نسبت لکھا ہے:

آپ کے والد کا نام کبیر الدین تھا، عراق سے ہندوستان تشریف

لاکر ہدایت خلق میں مشغول ہوئے ،صاحب کرامات تھے،اکثر ہندوآپ کے ہاتھ پر مشرف باسلام ہوئے۔

سیدامام الدین کو گجرات میں نمایاں کامیابی ہوئی،ان کے پیرؤوں کومومنہ یاست پنتھی کہتے ہیں،چوں کہ ان میں ابھی بہت سی ہندوانہ رسمیں موجود ہیں،اس لئے اس ملک کے مشائخ اس طرف کم متوجہ ہیں،ان کے عرسوں میں کم جاتے ہیں،جماعت کا نظام سیدامام الدین کے ایک جانشین کے ہاتھ میں ہے،جسے ''کاکا'' کہتے ہیں اور جو تجرد کی زندگی بسر کرتا ہے،عرصے سے ''کاکا'' کوئی ہندو ہوتا ہے،لیکن خواجہ حسن نظامی کا بیان ہے کہ ''کاکا باطن میں مسلمان'' ہے،اس طریقے کے جو لوگ بظاہر ہندو رہتے ہیں ،انہیں ''گپتی'' یعنی پوشیدہ کہتے ہیں اور جو ظاہر طور پر بھی مسلمان ہوتے ہیں ؛انہیں مومنہ کا لقب دیا جاتا ہے،سیدامام الدین کی قبر احمد آباد کے قریب پیرانہ میں ہے۔

سیدامام الدین فی الحقیقت پیر سید کبیرالدین حسن کے بیٹے تھے،بمبئی گزیٹئر میں لکھا ہے کہ سندھی خوجوں نے ان کی مخالفت کی اور سندھ سے برگشتہ ہوکر انہوں نے گجرات کا رخ کیا،جہاں سلطان محمود بیگڑہ نے ان کا خیر مقدم کیا،ان کا طریق کار عام اسماعیلی طریقے سے مختلف تھا،اس کے علاوہ انہوں نے امام وقت کے لئے دھوندھ (یعنی پیرؤوں کی آمدنی کا دسواں حصہ) لینے کی مذمت کی،اس لئے امام وقت آغا عبدالسلام ابن آغا اسلام شاہ نے انہیں جماعت سے خارج کردیا،آغا عبدالسلام نے شاید اس خیال سے کہ پیروں کی تعیناتی سے انہیں نئے نئے طریقے شروع کرنے کا موقع ملتا ہے،نیا پیر یا نائب نامزد نہ کیا،لیکن اپنے ہندوستانی مریدوں کی ہدایت کے لئے پندیات جوانمردی ایک کتاب تصنیف کی، جسے خوجوں میں ایک پیر کا درجہ دیا جاتا ہے۔امام الدین کی وفات ۱۵۱۲ء میں ہوئی۔

بوہرے

۱۹۲۱ء کی مردم شماری کے وقت ہندوپاک کے علاقوں میں بوہرہ جماعت ڈیڑھ لاکھ

سے زیادہ تھی، بوہروں کی روایت ہے کہ ان کے مذہب کی اشاعت پہلے پہل عبداللہ یمنی اور سیدی احمد نے کی، جو مصر کے خلیفہ مستنصر کے ایماء پر ۱۰۶۷ء میں کھمبایت آئے اور جنہوں نے گجرات کے راجپوت راجہ سدھ راج جے سنگھ اور اس کے وزیر کو مسلمان کیا، لیکن بعض لوگ کہتے ہیں کہ بوہروں کے پہلے مبلغ ملا علی (پیر پرواز یا پیر رواں) تھے، جنہوں نے ۱۱۳۷ء میں وفات پائی اور جن کا مزار کھنبایت میں بڑا مقدس سمجھا جاتا ہے۔

سرکاری رپورٹوں کے مطابق تمام بوہرے ہندوؤں سے مسلمان ہوئے ہیں، لیکن بوہروں کو یمن سے خاص تعلق رہا ہے، کئی بوہرے وضع قطع اور خصائص و خصائل سے عربی النسل معلوم ہوتے ہیں اور عجب نہیں کہ ان میں سے ہندو نو مسلموں کے علاوہ بہت سے ان یمنی تاجروں کی اولاد ہوں؛ جنہوں نے تجارت کے ساتھ ساتھ تبلیغ مذہب کی اور بعض کے آباء واجداد سولہویں صدی میں یمن میں سلطان روم کی حکومت قائم ہونے کے بعد ہندوستان میں آ گئے ہوں۔

سولہویں صدی کے آخر سے بوہروں کی دو جماعتیں ہوگئی ہیں، سلیمانی اور داودی، ان کا اختلاف بھی زیادہ تر شخصی ہے، داودی بوہرے؛ یہ لوگ داود بن قطب شاہ اور سلیمانی لوگ سلیمان ابن یوسف کی جانشینی کے قائل ہیں، داودی جماعت کے داعی مطلق سورت کے ''ملاجی صاحب'' ہیں اور سلیمانیوں کے مرشد یمن میں ہیں، جہاں سے اکثر اسماعیلی مبلغین ہندوستان میں آتے رہے؛ لیکن ہندوستان میں سلیمانیوں کی تعداد داودیوں سے کم ہے۔

بوہرہ مبلغوں کی پر امن تبلیغی کوششیں صدیوں تک جاری رہیں اور تاجر اقوام کے کئی لوگوں نے ان کے عقائد اختیار کر لئے، یہ لوگ کئی باتوں میں ہندوانہ طریقوں پر عامل ہیں، وراثت کے معاملہ میں شرع کے پابند نہیں، سود علانیہ لیتے اور دیتے ہیں، دیوالی کے موقع پر

ہندوؤں کی طرح اپنے حساب کی کتابیں بدلتے ہیں، اس کے باوجود کئی باتوں میں وہ عام مسلمانوں سے زیادہ پابند شرع ہیں، ان کا لباس عام لوگوں سے جدا ہوتا ہے، اکثر راسخ العقیدہ بوہرے ڈاڑھی رکھتے ہیں، ہندوؤں کے ہاتھ کی مٹھائی نہیں کھاتے، نہ ہندو دھوبیوں سے کپڑے دھلاتیں ہیں اور اگر دھلاتے ہیں تو انہیں پھر پاک کر لیتے ہیں، عموماً نماز روزے کی پابندی کرتے ہیں، مسکرات بلکہ تمبا کو سے مجتنب رہتے ہیں، زکوۃ باقاعدہ دیتے ہیں۔

کئی بوہرے شاہان احمد آباد کے زمانہ میں سنی ہو گئے تھے، وہ اکثر زراعت پیشہ ہیں، شیعہ بوہرے زیادہ تر تجارت کرتے ہیں، ان میں داودی بوہروں کی تعداد زیادہ ہے اور ان کا ایک خاص نظام ہے، جماعت کے سرکردہ جنہیں داعی مطلق کہتے ہیں، وہ سورت کے ملاجی صاحب ہیں، انہیں جماعت کے متعلق کل اختیار حاصل ہیں، یہ لوگ عام مسلمانوں کی مسجدوں میں نماز نہیں پڑھتے، ان کے عبادت خانے علاحدہ ہوتے ہیں، قبرستان بھی جدا ہوتے ہیں، عیدین اور دوسرے تہوار بھی عام مسلمانوں سے مختلف ہوتے ہیں، وہ جمع صلاۃ کے قائل ہیں اور عام طور پر فقط تین وقت نماز پڑھتے ہیں، یعنی صبح، ظہر اور شام کے وقت اور جمعہ کی نماز با جماعت نہیں پڑھتے، وہ عموماً گجراتی زبان بولتے ہیں، موجودہ ''ملاجی صاحب'' عربی کے فاضل ہیں، حج کر چکے ہیں، لیکن وہ بھی اپنی جماعت کا جدا نظام قائم رکھنے کا بڑا خیال رکھتے ہیں، چنانچہ ۱۹۳۹ء میں لکھا گیا کہ اگر ضلع سورت وغیرہ میں کسی بوہرے سے پوچھا جائے کہ تمہارا مذہب کیا ہے؟ تو عموماً یہ نہیں کہے گا کہ مسلمان ہوں بلکہ کہے گا: میں بوہرہ ہوں۔ (تاریخ ہندوستان (آب کوثر): ص:۳۵-۳۵۵)

عرب و گجرات کے ثقافتی تعلقات

خلفائے بنو عباس کے دور میں گجرات کے ثقافتی تعلقات

خلفائے بنو عباسیہ کے دور میں گجرات کے ثقافتی تعلقات زیادہ استوار تھے، گندھار

کی عورتیں بغداد میں خلفاء اور امراء کے بچوں کی خدمات پر مامور تھیں، اس میں ایک باندی کا تذکرہ مولانا قاضی اطہر مبارک پوری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب رجال السند والہند میں کیا ہے۔

ڈاکٹر محمد یوسف نگرامی صاحب ''العلاقة السياسية والثقافية بين الهند والخلافة العباسية '' میں لکھتے ہیں:

ومن خلال دراستنا للعصر العباسى نجد النشاط الثقافى للهنود بارزا فى بغداد وقدمت الى بغداد كثيرمن النساء الهنديات من السند وكجرات بجنوب الهند وعشن فى بلاط الخلفاء وامتلأت بهن الأسواق والندوات ودخلن بيوت العرب كسيدات ومربيات للأطفال ومطربات وكانت من اشهر تلك الهنديات (خمار القندهارية) وهذه حكايتها كما روتها خديجة بنت هارون بن عبدالله الربيع" انها كانت من مدينة قندهار اشتراها جد خديجة بمائتى الف درهم" وكانت مغنية جميلة الصوت وروى لها صاحب الأغانى ما أنشدت من الأبيات وهى كما يلى:

إذا أسرها إمرؤ فيه مسرة   قضت لها مما تريد على نفسى

ومامر يوم ارتجى فيه راحة   فأذكره إلا بكيت على امس

دور عباسی کے ادبیات کے مطالعہ کے دوران ہمیں یہ نظر آتا ہے کہ ہندوستانیوں کی ثقافتی سرگرمیاں اس وقت (دور عباسی) بغداد میں پائی جاتی تھیں، سندھ اور جنوبی ہندوستان کے صوبہ گجرات کی بہت سی عورتیں اس وقت بغداد آچکی تھیں اور خلفاء کے شاہی محلات

میں زندگی گزار رہی تھیں، شہر بغداد کے بازار اور محفلیں ان سے
بھری ہوتی تھیں، نیز بعض ہندوستانی عورتیں بحیثیت نگران و بچوں
کی دایا اور مغنیہ عربوں کے گھروں میں داخل ہو چکی تھیں اور ان
ہندوستانی عورتوں میں سب سے زیادہ مشہور خمار گندھار (ضلع
بھروچ) تھیں، جس کا قصہ خدیجہ بنت ہارون بن عبداللہ الربیع نے
یوں بیان کیا ہے کہ وہ شہر گندھار کی تھیں، خدیجہ کے دادا نے دو لاکھ
درہم میں اس کو خریدا تھا، وہ بہت دلربا، خوب صورت آواز کی مغنیہ
تھیں، الأغانی کے مصنف نے اس کے پڑھے ہوئے بعض اشعار
اپنی کتاب میں نقل بھی کیے ہیں۔

گجراتی ادیب کی کتاب کلیلہ و دمنہ کی اہمیت

پرانے حکیموں کا دستور تھا کہ وہ اخلاق، حکمت اور دانائی کی باتیں قصوں کہانیوں اور تمثیلوں میں بیان کیا کرتے تھے اور کتوں، چوہوں، بلیوں، کووں کی زبانوں سے انسانوں کو سمجھاتے تھے، سنسکرت کی ایک خاص کتاب جس نے فارسی اور عربی میں اس حیثیت سے خاص شہرت حاصل کی کلیلہ دمنہ ہے، جس کا بیرونی کے بیان کے مطابق سنسکرت نام ''پنچ تنتر'' ہے، یہ کتاب اسلام سے پہلے سنسکرت سے ایران کے سامانی بادشاہوں کے زمانہ میں فارسی میں ترجمہ ہوئی، پھر عبداللہ بن مقفع نے دوسری صدی ہجری کے وسط میں عربی میں اس کو منتقل کیا، اس کتاب نے عربی میں اتنی شہرت حاصل کی اور سلاطین و امراء نے اس کی اتنی قدر کی کہ عربی سے فارسی میں، فارسی سے عربی میں، نظم سے نثر میں اور نثر سے نظم میں، اس کی متعدد نقلیں ہوتی رہیں اور مترجم، شاعر اور انشاء پرداز اس کے ترجمہ نظم اور انشاء میں اپنا جوہر دکھا

دکھا کر مسلمان بادشاہوں سے گراں قدر انعام پاتے رہے، دوسری صدی کے آخر میں ابان نامی ایک عربی شاعر جب اس کا عربی نظم میں ترجمہ کر کے ہارون الرشید کے وزیر جعفر برمکی کی خدمت میں پہنچ گیا تو اس نے اس کو ایک لاکھ درہم انعام دیا، عربی زبان سے اس کتاب کے تراجم دنیا بھر کی زبانوں میں ہوئے، یورپ، ایشیاء اور افریقہ کی کوئی مہذب زبان نہیں، جس میں اس کا ترجمہ نہ ہوا ہو، اس کتاب کے تراجم اور نسخوں کے الٹ پھیر کی خود ایک مستقل تاریخ ہے۔

کلیلہ ودمنہ گجرات کے راجہ دابشلیم کے لئے لکھی گئی

اس کتاب کا مصنف بیدیا پنڈت اور جس راجہ کے لئے لکھی، اس کا نام دابشلیم بتایا گیا ہے، بادشاہوں کو جن باتوں کی ضرورت ہے، جانوروں کے قصوں اور کہانیوں کے ذریعہ سے دس بابوں میں ان کی تعلیم دی گئی ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دابشلیم جس راجہ کا نام بتایا گیا ہے، وہ گجرات کا راجہ تھا، کیوں کہ چوتھی صدی ہجری (دسویں صدی عیسوی) کے عرب سیاح ابن حوقل نے گجرات کے راجہ ولبھ رائے کا نام لے کر لکھا ہے کہ "تمثیلوں والی کتاب، کتاب الامثال والا راجہ" اور عربی میں تمثیلوں والی کتاب یہی کلیلہ دمنہ سمجھی جاتی ہے، یعقوبی نے لکھا ہے کہ راجہ دابشلیم کے عہد میں بیدیا پنڈت نے یہ کتاب لکھی اور تاریخ فرشتہ میں ہے کہ سلطان محمود کے حملۂ گجرات کے وقت گجرات کے معزول راجہ کے خاندان کا لقب دابشلیم تھا۔

بہر حال یہ وہ اہم کتاب ہے، جس کو ہندوستان کے دماغ نے پیدا کیا اور عربوں کی کوششوں نے اس کو دنیا کے گوشہ گوشہ میں پھیلا دیا، بیرونی لکھتا ہے کہ عبداللہ بن مقفع جو مانی (مجوسی فرقہ) مذہب کا پیرو تھا، اس نے اپنے خیال واعتقاد کے مطابق اصل کتاب کے ترجمہ

میں تحریفیں کی ہیں، بیرونی کی دلی خواہش تھی کہ اس کی اصل کتاب پنچ تنتر سے صحیح اور ایمان دارانہ ترجمہ کرنے کا مجھے موقع مل سکتا، مگر معلوم ہوتا ہے کہ بیرونی کو اس کا موقع مل نہ سکا، یہ کتاب عربی میں عام ہے اور تخصص فی الادب العربی کے نصاب میں آج بھی کہیں کہیں داخل ہے۔

مختلف تجارتی، معاشرتی اور سیاسی تعلقات کا یہ نتیجہ ہوا کہ سندھ، گجرات، کارومنڈل، ملیبار، مالدیپ، سراندیپ اور جاوہ میں اسلام نے اپنے قدم آہستہ آہستہ بڑھانے شروع کئے، ان جزیروں میں ایک طرف ہندوؤں اور دوسری طرف جینیوں کے اثر سے بودھ مت پھیلا ہوا تھا، مگر صدی بصدی کے جغرافیوں اور سفرناموں کی کتابوں کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ لڑائی بھڑائی کے بغیر پورے امن اور چین کے ساتھ اسلام کے اثرات یہاں بڑھتے جاتے ہیں اور دونوں قوموں کے لئے ایک دوسرے سے واقفیت کا موقع بہم پہنچتا جاتا ہے۔

کھنبایت کا مناظرہ

مؤرخ مسعودی جو ۳۰۲ھ میں ہندوستان آیا تھا، کھنبایت کے حال میں لکھتا ہے:

> ”میں جب ۳۰۳ھ میں یہاں آیا تو یہاں کا حاکم ایک بانیا (بنیا) تھا، جو برہمی مذہب رکھتا تھا اور وہ مہانگر کے راجہ ولبھ رائے کا ماتحت تھا، اس کو مناظرہ کا بہت شوق تھا، اس کے شہر میں باہر سے جو نئے مسلمان یا اور مذہب کے لوگ آتے تھے، وہ ان سے بحث ومناظرہ کرتا تھا۔“

عربی ادب میں ہندوستانی اثرات

ان الـدارس يرى بعض الملامح الهندية فى الادب العربى فى ذلك الوقت خـصـوصـاً فـى القصص العربى، فقد انتقلت عدة قصص هندية الى اللغة العربية مثـل كليلة ودمنة والف ليلة وليلة وقصة سند باد وستحظى هذه القصص ببعض التفصيل.

ادب عربی کے مطالعہ کرنے والے کو ادب عربی میں اس وقت بعض ہندوستانی اثرات نظر آئیں گے،خصوصاً عربی قصے کہانیوں میں، چنانچہ متعدد ہندوستانی قصے عربی زبان میں منتقل ہوئے، جیسے کلیلہ دمنہ، الف لیلہ اور سند باد وغیرہ کے قصے اور ان قصوں کو بڑی مقبولیت بھی حاصل ہوئی۔

کلیلہ دمنہ کے تاریخی پس منظر کو بیان کرتے ہوئے ابن حوقل رقم طراز ہیں:

ان كتـاب كليلة ودمنة يعتبر من انتاج الهند و هناك قول عن سبب تأليف هـذا الـكتـاب ، ان الهـنـد كـانـت تواجه الفساد والطغيان ولذلك فوض الملك دابشـليم الى بيد با ان يكتب كتابا باللغة السنسكريتية يشتمل على النصح والعبر لكى يسود السلام والأمن.

بلاشبہ ''کلیلہ ودمنہ'' ہندوستان کی تخلیق سمجھی جاتی ہے،اس کتاب کے سبب تالیف میں یہ بات بیان کی جاتی ہے کہ ہندوستان چوں کہ فساد و بگاڑ اور سرکشی کا سامنا کر رہا تھا،اس لئے بادشاہ دابشلیم نے بید بافلسفی کو یہ کام سپرد کیا کہ وہ سنسکرت زبان میں ایک ایسی کتاب لکھے، جو پند ونصائح پر مشتمل ہو؛ تاکہ اس کے ذریعہ امن وسلامتی کا دور دورہ ہو اور صلح اور آشتی قائم ہو۔

من كان هذا الملك، و كان يحكم اى منطقة من الهند ؟

لیکن سوال یہ ہے کہ بادشاہ کون تھا اور ہندوستان کے کس علاقہ پر حکومت کرتا تھا؟

ان لدينا بعض القرائن بناءً على ذلك يمكن ان تحدد هذا الملك ، وأغلب الظن أنه كان ملك،(بهدات) الذى كان يحكم كجرات لان ابن حوقل كتب عنه ملك كتاب الامثال. (ابن حوقل،ص:۲۲۵)

بعض قرائن کی بنیاد پر یہ تعیین کرنا آسان ہے کہ یہ بادشاہ کون تھا؟ چنانچہ غالب گمان یہ ہے کہ بادشاہ ''بھدات'' تھا، جو گجرات کے علاقہ پر حکومت کرتا تھا، اس لئے کہ ابن حوقل نے اس کے بارے میں ''ملک کتاب الامثال'' (یعنی کہاوتوں والی کتاب والا بادشاہ) لکھا ہے۔

و كان هذا الملك يعرف باسم دابشليم والدليل على ذلك مايقوله صاحب تاريخ فرشته عندما هاجم محمود الغزنوى غجرات ان الاسرة الحاكمة عن غجرات كانت معروفة بلقب دابشليم. (تاریخ فرشتہ ص:۲۱۲)

نیز یہ بادشاہ دابشلیم کے نام سے معروف ومشہور تھا، اس کی دلیل ''تاریخ فرشتہ'' کے مصنف کا بیان ہے کہ جس وقت محمود غزنوی نے گجرات پر حملہ کیا، اس وقت گجرات پر حکومت کرنے والا خاندان ذبشلیم کے لقب سے معروف تھا۔

ومن ناحية أُخرى ان المؤرخ اليعقوبى قد اقر ان بيدبا قد كتب هذا الكتاب فى عهد دابشليم. (تاریخ یعقوبی:۱/۶۹)

دوسری طرف مؤرخ یعقوبی نے بڑے پرزور انداز میں یہ بیان کیا ہے کہ بیدبا فلسفی کی یہ کتاب (کلیلہ ودمنہ) دابشلیم ہی کے عہد میں تالیف کی گئی ہے۔

کلیلہ ودمنہ نے عربی ادب پر جو اثرات چھوڑے اس کو ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

وقد كان لكتاب كليلة ودمنة اثر كبير في الادب العربي وعني الناس به عناية كبرى، وحذوا حذوه من ذلك ان كثيرين نظموه مثل أبان اللاحقي وابن الهاربة في كتابه "نتائج الفطنة" وحذا حذوه كتّاب كثيرون، فابن الهبارية الف على منواله كتاب "الصادح والباغم" وكذلك الف على منواله "سلوان المطاع في عدوان الطباع" لابي عبدالله محمد بن ابي القاسم القرشي.

اور "کلیلہ ودمنہ" نامی کتاب کا ادب عربی میں بڑا اثر ہے، لوگوں نے اس پر بڑی توجہ دی ہے اور اس کے نقش قدم پر چلے ہیں، یہی وجہ ہے کہ بہت سے شعراء وادباء نے اس کو منظوم کیا ہے، جیسے ابان لاحقی اور ابن هباريه نے اپنی کتاب "نتائج الفطنه" میں اس کو منظوم کیا ہے، نیز بہت سے مصنفین نے اسی طرز نگارش کو اپنایا ہے اور اسی کے نقش قدم کی اتباع کی ہے؛ چنانچہ ابن الهباريه نے اس طرز واسلوب پر "الصادح والباغم" نامی کتاب تالیف کی ہے، اسی طرح ابوعبداللہ محمد بن ابوالقاسم قرشی نے بھی "سلوان المطاع في عدوان الطباع" اسی طرز پر تالیف فرمائی ہے۔

ويذكر كشف الظنون ان ابا العلاء المعري الف كتاباً اسمه "القائف" على مثال كليلة ودمنة وهو في ستين كراسة ولم يتمه وان له كتاب "منار القائف" يتضمن تفسيره في عشرة كراريس.

صاحب "کشف الظنون" بیان فرماتے ہیں کہ ابوالعلاء معری نے "کلیلہ ودمنہ" کے طرز پر "القائف" نامی کتاب تالیف کی ہے، جو ساٹھ دفاتر میں موجود تھی، مگر افسوس کہ یہ کتاب پایۂ تکمیل تک نہیں پہنچ سکی، نیز "منار القائف" ان کی دوسری تالیف ہے، جس کی تفسیر

وتوضیح دس کا پیوں پر مشتمل تھی۔

وفی ”رسائل اخوان الصفا“ رسالة فی المناظرة بین الحیوان والانسان لا تخلو من لون کلیلة ودمنة بل یطلق ”جولد زیهر“ ان اسم اخوان الصفا مقتبس من کلیلة ودمنة اذ ورد الاسم فی اول فصل ”الحمامة المطوقة“. (ضحیٰ الاسلام، ۲۲۰/۱)

”رسائل اخوان الصفا“ نامی کتاب میں ایک رسالہ انسان اور حیوان کے درمیان مناظرہ سے متعلق ہے، جو کلیلہ ودمنہ کے رنگ سے خالی نہیں ہے، حتی کہ ”گولدزیہر“ نے یہاں تک دعوی کیا ہے کہ ”اخوان الصفا“ کا نام بھی ”کلیلہ ودمنہ“ سے لیا گیا ہے؛ کیوں کہ اس کی پہلی فصل ”الحمامة المطوقة“ میں یہ نام آیا ہے۔

ادخل هذا الکتاب القصص علی السنة الحیوانات للتعبیر عن النزعات الانسانیة ومایختلج فی الصدور من آراء وافکار ومبادئ لاظهارها فی عصر الاستبداد والظلم والطغیان ، ثم ادی اعجاب العرب بهذا الکتاب الی نظمه بالشعر العربی مثل ابان بن الحمید الذی نظمه للبرامکة شعرا ویحتفظ کتاب الاوراق للصولی بقطع طویلة من النظم الذی یستهله بقوله :

هذا کتاب ادب محنه　　　　وهو الذی یدعی کلیلة ودمنة

فیه دلالات وفیه رشد　　　　وهو کتاب وضعته الهند

یہ قصے کہانیوں کی کتاب ظلم واستبداد، تمرد وسرکشی کے دور میں دلوں میں پیدا ہونے والے آراء وافکار اور نظریات وخیالات کے اظہار، نیز انسانی نزاعات وجھگڑوں کی تعبیروں کے لئے حیوانوں کی زبان میں لکھی گئی، پھر اس کتاب سے عربوں کا شغف اور دل چسپی اس کو عربی اشعار کے قالب میں ڈھالنے کا سبب بنی، چنانچہ ابان بن الحمید نے برامکہ کے لئے اس

کو عربی اشعار میں منظوم کیا اور صولی کی ''کتاب الاوراق'' نے اس نظم کے طویل قطعات محفوظ کر لیے ہیں، جس کا آغاز اس نے اپنے ان اشعار سے کیا ہے:

یہ ادب کی مشکل ترین کتاب ہے، اس کا نام ''کلیلہ ودمنہ'' ہے، اس میں اشارات ورہنمائی ہے اور یہ ایسی کتاب ہے جس کی تخلیق ہندوستان نے کی ہے۔

لقد اثرت الهند فی وضع المناهج للقواميس العربية و اول من فعل ذلك الخليل بن احمد (المتوفی سنة ١٧٥ هـ) قال الدكتور شوقی ضيف ، وقد وضع الخليل معجما للعربية بترتيب نماذج الحروف متأثرا بالهنود فی ترتيب حروف لغتهم ، ويساند هذا الرأی ما أورده البيرونی : ومن الممكن ان يكون الخليل ابن احمد سمع ان للهنود موازين فی الأشعار كما ظنه بعض الناس.

عربی لغات کا طریقۂ کار اور منہج

عربی لغات کا طریقۂ کار اور منہج متعین کرنے میں بھی ہندوستان نے اپنا اثر ڈالا اور اس کے زیر اثر سب سے پہلے جس شخص نے یہ کام کیا، وہ امام نحو ولغت خلیل بن احمد متوفی ۱۷۵ھ ہیں، ڈاکٹر شوقی فرماتے ہیں: خلیل نے ہندوستانیوں کی لغات کے حروف کی ترتیب میں ان سے متاثر ہو کر حروف کے نمونوں کی ترتیب پر عربی میں لغت تیار کی اور اس رائے کی تائید ''بیرونی'' کی اس تحریر سے بھی ہوتی ہے: ''بہت ممکن ہے کہ خلیل بن احمد نے یہ سنا ہو کہ ہندوستانیوں کے اشعار کے باب میں کچھ موازین ہیں، جیسا کہ ان کے بارے میں بعض لوگ خیال کرتے ہیں۔''

ويبدو من كلام البيرونی ان بعض العلماء فی عصره كانوا يعتقدون بوجود اثر الهند فی الخليل ، ولا يستبعد هذا الرأی علی ضوء بعض الحقائق التاريخية لان ابن النديم ـ كما وضحت فيما سبق ـ ذكر عدة كتب هندية ادبية

ترجمت الى العربية منذ عصر مبكر ، ومما يقوى هذا المنطق اننا نجد الخليل قد قسم فى كتابه "العين" الحروف الهجائية الى مجموعات صوتية بدأها بحروف الحلق وختمها بالحروف الشفوية ، وهذا الترتيب قد وافق من بعض الوجوه ترتيب حروف الهجاء فى اللغة السنسكريتية والى هذا الرأى ذهب جرجى زيدان.

بیرونی کے کلام سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کے دور میں بھی بعض علماء خلیل کے اندر ہندوستانی اثرات کے وجود کے قائل تھے اور بعض تاریخی حقائق کی روشنی میں اس رائے کو مستعبد بھی نہیں قرار دیا جاسکتا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ ابن ندیم نے - جیسا کہ میں سابق میں وضاحت کر چکا ہوں - ہندوستانی ادب کی متعدد کتابوں کا ذکر کیا ہے، جن کا ابتدائی زمانہ ہی میں عربی میں ترجمہ ہو چکا تھا اور ہماری اس بات کو اس سے بھی تقویت ملتی ہے کہ خلیل نے اپنی مشہور لغت کی کتاب ''العین'' میں حروف ہجائیہ کو صوتی مجموعوں میں تقسیم کیا ہے، ان کو حروف حلقیہ سے شروع کر کے حروف شفویہ پر ختم کیا ہے، خلیل کی وضع کردہ یہ ترتیب بعض اعتبارات سے سنسکرت زبان میں پائے جانے والے حروف ہجاء کی ترتیب کے موافق ہے، نیز جرجی زیدان بھی ہماری اسی رائے کے قائل ہیں۔

عرب اور گجرات کے علمی روابط

ہندوستان صدیوں تک اسلامی ثقافت وتہذیب کا مرکز رہ چکا ہے، جس کے آثار اس کے ذرہ ذرہ پر ثبت ہیں اور یہاں کے علماء، اصحاب کمال اور علم دوست سلاطین وامراء کے علمی وتہذیبی کارنامے کسی اسلامی ملک کے کارناموں سے کم نہیں ؛ بلکہ ہندوستان کو بعض ایسی خصوصیات حاصل تھیں جو اسلامی ملکوں کو حاصل نہ تھی، مثلا اسلامی ملکوں کے بیشتر علماء اپنے

ہی ملک کے تھے، اس کے مقابلہ میں ہندوستان کے مسلمان سلاطین وامراء کی فیاضی اور علمی قدردانی سے مختلف اسلامی ملکوں خصوصا وسط ایشیاء کے تمام علمی مرکزوں عراق وایران سے لے کر ترکستان بلکہ حجاز تک کے علماء کا عطر کھینچ کر ہندوستان میں جمع ہوگیا تھا، دوسری خصوصیت یہ ہے کہ اسلامی ملکوں کے علماء نے اسلامی علوم پر زیادہ تر عربی، اس کے بعد فارسی میں کتابیں لکھیں، دوسری زبانوں میں بلند پایہ کتابیں بہت کم لکھی گئیں اور ہندوستان کے علماء نے عربی، فارسی اور اردو تینوں زبانوں میں ان علوم کی یکساں خدمت کی۔(اسلامی علوم وفنون ہندوستان میں: ص:۱)

اسی ملک ہندوستان کا ایک صوبہ گجرات ہے، جس کا تعلق عرب ممالک سے بہت قدیم ہے اور وہ تعلقات رفتہ رفتہ اس طرح ترقی کر گئے کہ گجرات میں ایک شاندار اسلامی حکومت قائم ہوگئی اور ان بادشاہوں کی علم دوستی اور علمی سرپرستی کی بنیاد پر علماء کی گجرات میں بکثرت آمد ہوئی اور گجرات بقول مولانا سید حکیم عبدالحی رحمۃ اللہ علیہ شیراز ویمن کا ہمسر بن گیا۔

گجرات میں اسلام اور علوم اسلامیہ کی ترویج واشاعت پر گفتگو سے پہلے اس طرف متوجہ کرنا زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کی آمد کی ابتداء ہندوستان میں کب ہوئی اور یہاں اس قدر دینی علوم کی تیزی سے اشاعت کے اسباب کیا تھے۔

مولانا سید حکیم عبدالحی رحمۃ اللہ علیہ نے اسلام کی آمد کے بارے میں لکھا ہے کہ ۱۵ھ میں فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے بحرین وعمان کی حکومت پر عثمان بن ابوالعاص ثقفی رضی اللہ عنہ کو نامزد فرمایا، تو انھوں نے عنان حکومت اپنے ہاتھ لینے کے ساتھ اپنے بھائی حکم بن ابو العاص رضی اللہ عنہ کو ہندوستان پر فوج کشی کا حکم دیا، (یادایام: ص:۴۴) اور اس طرح یہ مقدس ہستیوں کے قدوم میمنت سے گجرات مشرف ومسعود ہوا۔

اس کے بعد دوسرا حملہ ۹۳ھ میں ہوا، جب کہ ملک سندھ مسلمانوں کے قبض وتصرف میں آیا اور ۱۰۷ھ میں ہشام بن عبدالملک خلیفۂ دمشق نے جنید بن عبدالرحمٰن مری کو سندھ کی حکومت تفویض کی، اس نے چند ہی روز میں گجرات کی طرف توجہ کی اور اپنی طرف سے لوگوں کو عربی فوجوں کے ساتھ کچھ پر روانہ کیا، جس کو عربی کتابوں میں (قصہ) لکھتے ہیں، یہ فوجیں بھروچ کو تہہ وبالا کرتی ہوئی مالوہ میں گھس آئیں اور ہر طرف جا جا کر انہوں نے فتوحات حاصل کی۔

اس طرح پہلی صدی کے آغاز سے ہی انفاس قدسیہ یعنی صحابۂ کرام اور تابعین رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کی گجرات میں آمد ہوگئی اور اسلام کی اشاعت اور علوم دینیہ کی بنیاد پڑی اور بعد میں پانچویں صدی میں علم دوست بادشاہ محمود غزنوی نے گجرات پر حملہ کیا، چھٹی صدی میں شہاب الدین غوری نے دھاوا بولا اور اسی صدی میں قطب الدین ایبک بھی حملہ ور ہوا اور ان تمام کوششوں سے ایک طرح اسلامی حکومت قائم ہونے میں مدد ملی۔

سید ظہیرالدین مدنی رقم طراز ہیں: گجرات میں نفوس قدسیہ کی آمد ساتویں عیسوی (پہلی صدی ہجری) سے پائی جاتی ہے، ہجری کے ابتدائی برسوں میں جو عرب بیڑے بھروچ، بھاڑ بھوٹ، گندھار وغیرہ کے ساحلوں پر لنگر انداز ہوئے، ان میں تابعین اور تبع تابعین بھی تشریف لائے تھے، سورت کے مقابل ''راندیر'' ایک زمانہ میں اہم بندرگاہ تھی، راندیر میں ایک تبع تابعی کے مزار کی نشاندہی بھی کی جاتی ہے، خلیفہ سفاح عباسی ۷۴۹ء کے عہد میں کوفہ سے ایک مومن قبیلہ راندیر آیا تھا، ان لوگوں نے راندیر میں اشاعت اسلام کی خدمت انجام دی تھی، ۱۱۵۶ء میں وہاں ایک مسجد تعمیر کی گئی تھی، وہ اب تک موجود ہے، ۱۱۲۹ء میں جب سلطان صلاح الدین نے مصر پر قبضہ کرلیا تو وہاں کے بعض اسماعیلیوں نے گجرات میں پناہ

لی،ایک شخص نورالدین ستاگر نامی سات اماموں کی تبلیغ کرتا تھا،گیارہویں صدی میں گجرات میں تبلیغ میں مصروف پایا جاتا ہے،اس نے ۱۰۹۴ء میں وفات پائی ،مستنصر باللہ۱۰۹۴ء کے عہد میں احمد نامی ایک شخص کو بغرض تبلیغ بھیجا گیا تھا،اس وقت گجرات میں راجہ سدھ راج جے سنگھ حکمران تھا،گجرات میں صوفیاء کی آمد کا سلسلہ راجہ سدھ راج کے باپ راجہ کرن سولنکی۱۰۷۲ ء تا ۱۰۹۴ء کے عہد سے پایا جاتا ہے،حضرت حاجی ہود اولین بزرگ ہیں، جنہوں نے نہروالا پٹن میں سکونت اختیار کی اور ۱۱۴۱ء میں وہیں وفات پائی،شیخ احمد عرفاتی متوفی ۱۲۴۷ء، باباحاجی متوفی ۱۲۷۱ء،شیخ احمد دہلوی المعروف بہ بابادھلیا (خلیفہ شیخ محی الدین علوی دہلوی) متوفی ۱۱۶۰ء،حضرت قاضی محمود دریائی کے جد اعلی شاہ علی سرمست اور دیگر نے گجرات کو اپنا وطن ثانی بنالیا اور رشد وہدایت کی خدمت انجام دی۔(سخنوران گجرات:۲۴)

اس کے بعد علماء وصوفیاء کی مساعی بھی خوب رہی ،مولانا محمد مشتاق تجاروی کے الفاظ میں:

> ہندوستان میں اشاعت اسلام کی کاوشوں کو اگر ترتیب سے دیکھا جائے تو سب سے قدیم تاجروں کی کاوشیں ہیں،علماء اور سلاطین کا زمانہ تقریبا ایک ہے، فتح سندھ کے ساتھ ہی جس طرح یہاں حکمران ہوئے ،اسی کے ساتھ علماء کی بڑی تعداد بھی یہاں آئی اور انہوں نے تبلیغ واشاعت کا کام انجام دیا،صوفیہ کی مساعی کا آغاز پانچویں صدی ہجری میں ہوتا ہے؛لیکن ان کی خدمات کی اہمیت اور اشاعت اسلام کے لئے جدوجہد تاریخ ہند کا روشن ترین باب ہے۔(برصغیر میں اشاعت اسلام کی تاریخ:ص:۱۸)

لیکن گجرات میں ایک دور انتہائی روشن اور قابل ذکر بھی گذرا ہے، جس طویل عرصہ میں مسلمان حکمرانوں کی علم دوستی اور علماء ومحدثین کی تشریف آوری سے گجرات اور خاص کر اس کے ساحلی علاقوں میں علوم دینیہ کی اشاعت خوب تیزی سے ہوئی اور یہاں سے بھی حصول علوم دینیہ کی غرض سے علماء گجرات کی عرب تشریف بری ہوئی، یہ روشن ترین دور تقریبا ۳؍صدیوں پر مشتمل ہے، یعنی ۸، ۹اور ۱۰ویں صدی ہجری۔

اس قدر تیزی سے گجرات میں علوم دینیہ کی اشاعت اور ترقی کے اسباب پر روشنی ڈالتے ہوئے پروفیسر محبوب حسین عباسی رقم طراز ہیں: گجرات میں آٹھویں صدی ہجری میں مسلمانوں کا اقتدار قائم ہونے کے فورا بعد جس سرعت سے علوم دینیہ کی ترقی وترویج عمل میں آئی اس کے درج ذیل دو اہم اسباب معلوم ہوتے ہیں:

(۱) عرب ممالک اور گجرات کے درمیان قرب مکانی اور (۲) سلاطین اور امرائے گجرات کی علم دوستی۔

(۱) جنوب مشرق جزیرۃ العرب اور مغربی گجرات کے درمیان بہت قلیل فاصلہ ہے اور سمندر کے علاوہ کوئی چیز حاجز نہیں، اس بناء پر دونوں طرف کی بندرگاہوں سے بحری راستوں کے ذریعہ آمدورفت کا سلسلہ قدیم زمانہ سے قائم ہے، گجرات کی قدیم تاریخ میں یہ بتایا گیا ہے کہ زمانۂ قبل از اسلام میں گجرات کی ولبھی سلطنت اور عربوں کے درمیان گہرے روابط اور ثقافتی تعلقات قائم ہوئے تھے اور یہاں سوداگروں کی نوآبادیاں قائم ہوگئیں تھیں، ان عربوں کو مقامی ریاستوں میں وزیر اور مشیر بھی بنایا جاتا تھا، عرب تاجروں کی آمدورفت اور مقامی لوگوں کے ساتھ میل جول کے نتیجہ میں عربی زبان اور طور وطریقوں کے مقامی طریقۂ بودوباش پر اثرات بھی پڑے تھے، مقامی بولیوں میں بھی عربی زبان کے الفاظ کثرت سے

استعمال ہوتے تھے، خاص طور پر جہاز رانی، بحری تجارت اور بندرگاہوں کے نظام سے متعلق عربی اصطلاحات رائج تھیں، اسی طرح ہندوستانی اشیاء اور لین دین سے متعلق مقامی بولیوں کے الفاظ کو عربوں اور خاص طور پر بحیرۂ احمر اور خلیج فارس کے سواحلی باشندوں نے اپنالیا تھا۔

ملک عرب میں جب اسلام کی روشنی پھیلی تو اس سے سب سے پہلے متأثر ہونے والے مشرقی علاقوں میں گجرات کا علاقہ بھی شامل تھا، مغربی ہند میں کچھ سے لے کر بحر جنوبی گجرات تک عرب مسلمانوں کی براہ راست آمد ہندوستان کی تاریخ کا ایک درخشاں باب ہے۔

۱۵ھ میں حکم بن ابی العاص ثقفی رضی اللہ تعالیٰ عنہ، ۱۰۷ھ میں اموی خلیفہ ہشام کے مقرر کردہ سندھ کے گورنر جنید بن عبدالرحمٰن کی طرف سے گجرات کے علاقوں میں دستے بھیجے گئے، ۱۴۰ھ میں خلیفہ منصور عباسی کے دور میں دریافت حال کے لئے عمرو بن جمل نامی عرب افسر نے ایک مہم چلائی تھی، ۱۵۹ھ میں مہدی باللہ عباسی کے دور میں عبدالملک بن شہاب مسمعی بڑی جماعت کے ساتھ بھاڑ بھوت آئے۔

اس طرح ابتدائی دو صدیوں کی آمد و رفت کے نتیجہ میں گجرات کے کناروں پر واقع متعدد بندرگاہوں میں مسلمانوں کی نوآبادیاں قائم ہوگئیں، جن کی شہادت تیسری اور چوتھی صدی ہجری میں گجرات میں آنے والے عرب سیاحوں نے دی ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ قرب مکانی کے باعث حجاز، یمن، بصرہ وغیرہ سے سمندری راستوں کے ذریعہ گجرات تک آمد و رفت آسان ہونے کے سبب سے بڑی تعداد میں مہم جو تاجر پیشہ افراد اور خاندان یہاں مختلف جگہوں پر آباد ہوگئے، ان آباد ہونے والوں نے مسجدیں اور درس گاہیں قائم کیں، جن کے ذریعہ ابتدائی سطح پر دینی تعلیم کی بنیاد پڑی۔

(۲) دوسرا سبب گجرات کے سلاطین وامراء کی علم دوستی اور علم پروری تھا، گجرات میں مسلمانوں کے اقتدار کے قیام سے پیشتر جو راجپوت راجے مہاراجے حکومت کرتے تھے، وہ بھی وسیع المشرب اور روشن خیال حکمران تھے۔

گجرات کے اس وقت کے پایۂ تخت انہلواڑ (نہروالا پٹن) میں بسنے والے مسلمان سوداگروں اور گجرات کی اس وقت کی سب سے بڑی اور پر رونق بندرگاہ کھمبایت میں رہنے والے مسلمان تاجروں کو گجرات کے راجپوت راجاؤں نے بڑی مراعات دے رکھی تھیں، یہاں تک کہ دینی امور میں انہیں مکمل آزادی حاصل تھی اور ان کے لئے خطیب وقاضی باہر کے ممالک سے بلائے جاتے تھے، جب آٹھویں صدی ہجری (چودہویں صدی عیسوی) میں گجرات میں مسلمانوں کا اقتدار قائم ہوا، تب مسلمانوں کے لئے فضا ہموار تھی اور علوم دینیہ کی اشاعت کا سامان فراہم تھا، ایسے میں گجرات میں ایک خود مختار اسلامی حکومت کے قائم ہو جانے سے درس وتدریس کے کاموں کو تقویت ملی، خاص طور پر مظفری خاندان کے حکمران طبقہ نے وہ کام کیا، جس کی مثال ہمیں مصر اور بغداد کی عہد وسطی کی خلافتوں میں ملتی ہے۔

سلطان احمد شاہ اول کی علم پروری کی شہرت حجاز ومصر تک پہنچ چکی تھی، ان کی شہرت سن کر سب سے پہلے بدرالدین دمامینی (متوفی ۸۲۷ھ/۱۴۲۴ء) نامی مصر کے عالم محدث نے ۵۷/سال کی پختہ عمر میں گجرات کا سفر اختیار کیا اور کھمبایت نیز پٹن میں قیام کر کے اپنی تصانیف سلطان احمد شاہ اول کو منسوب کیں، سلطان احمد شاہ اول عدل وانصاف، تقوی وپرہیز گاری اور سخاوت کے معاملہ میں بے نظیر تھے، سن بلوغ سے لے کر آخری عمر تک ان کی صبح کی نماز کبھی قضاء نہیں ہوئی تھی۔

سلطان احمد شاہ کے پوتے فتح خان عرف سلطان محمود شاہ بیگڑہ کا پچاس سالہ دور

حکومت گجرات میں علوم دینیہ کی ترقی کا زرین دور شمار ہوتا ہے، ان کا دربار عرب اور دیگر ممالک کے علماء دین سے ہمیشہ بھرا رہتا تھا، ان کے زمانۂ حکومت میں حجاز، یمن اور مصر سے گجرات آنے والے مشاہیر علماء ومشائخ میں علامہ ابن سوید، حدیث میں جن کی فضیلت کے پیش نظر سلطان محمود نے انہیں ملک المحدثین کا خطاب عطا کیا تھا، سب سے زیادہ قابل ذکر ہیں، سلطان مظفر ثانی کی سرپرستی حاصل کرنے والوں میں قاضی جمال الدین بحرق اور شیخ ابو القاسم ابن فہد کا بھی شمار ہوتا ہے، جو اپنے وقت کے اکابر علماء میں سے تھے، گجرات میں آکر علوم دینیہ کی خدمت اور اس کی اشاعت کرنے والے علماء کی فہرست بہت طویل ہے، یہاں صرف مشاہیر علماء کے نام لئے جاتے ہیں:

(۱) علامہ شہاب الدین عباسی مصری (۲) حافظ نورالدین ابوالفتاح الطاؤسی (۳) شیخ بن عبداللہ العیدروس (۴) علامہ جمال الدین محمد العمودی (۵) ابوالسعادات الفاکہی (۶) مولانا نورالدین شیرازی۔

(سلاطین وامراء گجرات کی علم پروری اور سخاوت کی یہ تفصیل ڈاکٹر ضیاءالدین دیسائی صاحب کے انگریزی مقالے: سولہویں-سترہویں صدی عیسوی میں ہندوستان کے مشرق وسطی کے ممالک کے ساتھ تعلقات: ص:۵۷ سے ۱۰۶ اور تیرہویں-پندرہویں صدی عیسوی میں ہندوستان اور مشرق وسطی، ص:۲۰۹ سے ۲۲۷ مطبوعہ سے لی ہے، ان کے مآخذ تمام تر عربی کتابیں ہیں۔)

مذکورہ بالا عوامل کے نتیجہ میں گجرات کے تعلقات حجاز، یمن اور مصر کے ساتھ قریب سے قریب تر ہوتے گئے، گجرات کے چند بڑے شہر مثلاً احمد آباد، پٹن، بھروچ اور سورت تو ملک حجاز کا حصہ معلوم ہونے لگے تھے، ان تعلقات میں حکومت اور سیاست کو بہت زیادہ دخل

نہیں تھا، ان کی بنیاد تجارت، ثقافت اور تعلیم وتعلم کے عمل پر رکھی گئی تھی، ان سے دونوں طرف کے عوام وخواص متاثر ہوئے تھے، ان کا اندازہ اس سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ عرب مؤرخین نے اپنی تصانیف میں گجرات کو اہم مقام عطا کیا اور گجراتیوں کے علوم دینیہ کے میدان میں کارہائے نمایاں کا خاص ذکر کیا ہے۔ (گجرات کے علماء حدیث وتفسیر:٦)

ہندوستان کے باشعور مؤرخوں مثلاً مولانا حکیم عبدالحی اور علامہ سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی عربوں کے ساتھ تعلقات اور علوم دینیہ کی اشاعت میں گجرات کے خاص مقام کو تسلیم کیا ہے۔ علامہ سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ ایک مقالہ میں رقم طراز ہیں:

> درحقیقت عرب اور ہندوستان کو ایک کرنے کی سعادت سلاطین گجرات کی قسمت میں تھی .....احمد شاہ اول وہ خوش قسمت سلطان ہے، جس نے گجرات کو عرب اور ہندوستان کے بیچ میں سلسلۃ الذہب بنادیا، علامہ نے اس بات کا بھی ذکر کیا ہے کہ سفر کی آسانی اور آمدورفت کی کثرت نے علماء ہند کو حجاز سے اور وہاں کے علوم سے آشنا ہونے کا موقع بہم پہنچایا۔ (ہندوستان میں علم حدیث، معارف، ج:٢٢، نمبر:۴، بابت اکتوبر، نومبر، دسمبر:١٩٢٨ء)

اس مختصر جائزہ سے ایک بات کا پتہ چلتا ہے کہ گجرات میں علوم دینیہ اور خاص طور پر علم حدیث وتفسیر کی عام اشاعت سے پیشتر زمین ہموار اور فضا سازگار ہوچکی تھی۔

گجرات میں نویں صدی سے لے کر تیرہویں صدی ہجری (مطابق پندرہویں صدی سے لے کر انیسویں صدی عیسوی) تک کے پانچ سو سالہ دور میں تمام قسم کے علوم دینیہ کی ترقی وترویج ہوئی ہے۔ (گجرات کے علماء حدیث وتفسیر:٦)

خلاصہ یہ ہے کہ ہندوستان میں اسلام کی اشاعت اور علوم دینیہ کی ترویج ایک مسلسل عمل ہے، جس میں مختلف افراد اور گروہوں کی کوششیں رہی ہیں، یہ کاوشیں ابتداء عہد اسلامی سے جاری ہیں اور ان کا سلسلہ ہنوز قائم ہے، کیوں کہ اشاعت اسلام میں جبر کا عنصر نہیں ہے۔

گجرات کا علاقہ زمانۂ قدیم سے علماء کا گہوارہ ہے، شیراز و یمن سے علماء وہاں پہنچے اور درس وافادہ کی مسند بچھائی اور ان کے مسند درس سے بڑے بڑے اہل فضل وکمال کامیاب ہوکر نکلے اور اس طرح سے گجرات کے چپہ چپہ میں اور دکن اور مالوہ میں علم کی شعاعیں روشن ہوئیں، شیراز و یمن سے گجرات آنے والے علماء میں بدرادین الدمامینی، خطیب گاذرونی اور عمادالدین طارمی وغیرہ تھے۔

خطیب ابوالفضل گاذرونی اور عمادالدین محمد طارمی جب گجرات اور امیر فتح اللہ شیرازی بیجاپور پہنچے اور اپنے ساتھ یہ علماء محقق دوانی، صدرالدین شیرازی اور فاضل مرزا جان کی کتابیں ساتھ لائے تو لوگوں نے ان کتابوں کو بڑے شوق سے قبول کیا۔

شیخ وجیہ الدین علوی گجراتی ان میں بڑے مشہور عالم گزرے ہیں، انہوں نے نصاب درس میں فلسفہ وحکمت رائج کیا، وہ بہت طویل مدت تک درس وافادہ کی مسند پر متمکن رہے اور ان کے بہت سے شاگرد فاضل وعالم بن کر نکلے، جن میں قاضی ضیاء الدین نیوتنی بھی ہیں، ان کے شاگرد جمال کوڑوی اور ان کے شاگرد لطف اللہ کوڑوی ہیں، شیخ لطف اللہ کوڑوی کے شاگردوں میں شیخ احمد بن سعید امیٹھوی، شیخ علی اصغر قنوجی، قاضی علیم اللہ گپندوی اور شیخ محمد زماں کاکوڑوی ہیں اور اس کے علاوہ بھی بہت سے شاگرد تھے اور ہر ایک نے اپنی اپنی جگہ پر درس وافادہ کی مسند بچھائی۔

اس زمانہ میں ہندوستان کے بعض علماء حج وزیارت کے لئے حجاز تشریف لے گئے اور وہاں کے مشہور محدثین کی خدمت میں رہ کر علم حدیث حاصل کیا اوران کے ذریعہ ہندوستان میں علم حدیث پہنچایا، مثلاً صاحب مجمع البحار شیخ محمد بن طاہر پٹنی، شیخ یعقوب بن حسن کشمیری اور شیخ عبدالنبی گنگوہی وغیرہ ہیں اور بعض علماء نے گجرات آکر درس وافادہ کی مسند بچھائی، مثلا شیخ عبدالمعطی، شیخ عبداللہ اور رحمت اللہ وغیرہ۔

اس طرح حدیث کا علم گجرات کے اطراف میں رواج پذیر ہوا۔(اسلامی علوم وفنون ہندوستان میں :ص:۳۶،۴۱-۴۳)

علماء گجرات میں محدثین، مفسرین کے ساتھ ساتھ فقہاء وقضاۃ کی خدمات بھی ناقابل فراموش ہے؛ حالانکہ ان کی فہرست بھی طویل ہے، ان کی فقہی خدمات اور فتاوی سے مدت مدیدہ تک لوگ فیضیاب ہوتے رہے، ان کی تصانیف کے مخطوطات آج مکتبات کی زینت بنے ہوئے ہیں۔

اسلامی حکومتوں میں جب تک اسلامی قانون جاری رہا اور اسلامی حکومتیں کسی نہ کسی حد تک دین کی ذمہ داری محسوس کرتی رہیں، اس وقت تک ایک طرف محکمۂ عدلیہ قضاء کا نظام جاری رہا اور دوسری طرف علماء امت کے ذریعہ ہر وقت افتاء کا کام ہوتا رہا، اسلامی حکومتیں دارالافتاء کی طرح دارالقضاء کی سرپرستی بھی کرتی رہیں، اسی وجہ سے فقہاء کی تصریح کے مطابق قاضی کے لئے علوم فقہ سے واقفیت ضروری اور شرط کے درجہ میں ہے، لہذا ہر قاضی کے لئے فقہ سے شناوری ضروری ہے۔

علماء گجرات میں بکثرت ایسی شخصیتیں گذری ہیں، جن کو متعدد علوم وفنون اور اصناف کمال میں دخل اور مشارکت رہی ہے، ان کے احوال زندگی اور خدمات دینیہ کے پیش نظر ان

کی شخصیت جامع علوم وکمالات نظر آتی ہے۔

ایک ہی وقت میں ایک عالم فقیہ بھی تھا، محدث و مفسر بھی، اصولی اور متکلم بھی، ماہر مدرس اور کامیاب مصنف بھی؛ لیکن اس جامعیت کے باوجود کوئی نہ کوئی ایک ذوق اس پر ایسا غالب رہا اور ایک فن اس کی علمی زندگی میں ایسی مرکزی حیثیت کا حامل رہا، جو اس کے لئے اس کے زمانہ اور طبقہ میں اس کا مابہ الامتیاز بن گیا، اس میں اس کے معاصرین پر امتیاز سب کو تسلیم تھا۔ (فقہاء گجرات اور ان کی فقہی خدمات: ص: ۱۵، ۱۶)

خلاصہ یہ ہے کہ گجرات ایک خاصی اہمیت رکھنے والا خطہ ہے، وہ اپنی مختلف خصوصیات میں شاندار علمی تاریخ کا حامل رہا ہے، اسلامی خصوصیات کے دائرہ میں یہاں کے اہل علم نے ایک شاندار تاریخ بنائی ہے، بڑے جید اور ممتاز علماء پیدا ہوئے اور انہوں نے علمی میدانوں میں درس وتدریس کے کاموں کے ساتھ ساتھ تصنیف وتالیف کے اہم علمی کارنامے انجام دیئے ہیں، ان کارناموں میں متعدد کام اپنے موضوع پر اعلی مقام رکھتے ہیں، اس طرح گجرات صدیوں تک علم وفن کا مرکز، ارباب ہنر کا گھوارہ، ارشاد وتلقین کا سر چشمہ اور اقتصادی ترقیات کے ساتھ ایک سرگرم تجارتی منڈی بھی رہا، روحانی اور مادی زندگی کی ساری نعمتیں یہاں جمع کی گئی تھیں، بعض اعتبار سے ہندوستان کے قرون وسطی کی تاریخ میں اس کو پورے ملک میں ایک امتیازی حیثیت حاصل تھی اور اسلام کے تعلق کے لحاظ سے ہندوستان کا یہی وہ علاقہ تھا، جس کے سرسبز پہاڑوں پر سب سے پہلے مسلمانوں کی نگاہ پڑی تھی، ارض ہند سے عربوں کے تعلق کی ابتداء حقیقتاً اسی خطۂ زمین سے ہوئی، حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے عہد خلافت میں عربوں نے سواحل گجرات پر قدم رکھا۔

گجرات کا خطہ چوں کہ ہندوستان کے مغربی ساحل پر واقع ہے، اسی طرح وہ جزیرۂ

عرب کے سامنے پڑتا ہے، اسی لئے عرب تجار اور مسلمان داعیوں اور مجاہدوں نے ہندوستان کی سرزمین پر پہلے یہیں قدم رکھا اور اس طرح اس علاقہ سے ان کا ربط و تعلق قائم ہوا، گجرات کے جو شہر اور مقامات اس کے دیگر مقامات میں ممتاز رہے اور انہیں نمایاں مقام ملا، ان میں مثال کے طور پر احمد آباد، سورت، بھروچ، پالن پور پیش کئے جاتے ہیں۔

گجرات کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ یہاں علامہ شمس الدین سخاوی، علامہ ابن حجر مکی وغیرہ کے تلامذہ کافی تعداد میں آکر بس گئے تھے اور انہوں نے علم حدیث کی ترویج واشاعت میں اپنی زندگیاں گزاردی تھیں، یہاں کی درس گاہیں اور خانقاہیں ہندوستان ہی نہیں؛ بلکہ بیرون ہند سے تشنگان علم ومعرفت کو کھینچتی تھیں، سولہویں اور سترہویں صدی ہجری میں تو یہ محسوس ہوتا ہے کہ دینی اور ثقافتی زندگی کا مرکز ثقل گجرات کی طرف منتقل ہوگیا اور شاید ہی کوئی دینی یا علمی شعبہ ایسا ہو جس کے متبحر عالم موجود نہ ہو۔

گجرات کی علم وفضل، ادب وکمال میں سبقت کو ہندوستان کی اسلامی تاریخ پر خصوصی نظر رکھنے والے ممتاز و مایۂ ناز مؤرخ پروفیسر احمد نظامی ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں:

> ”میر سید عبدالاول (متوفی: ۹۶۸ء) نے صحیح بخاری کی شرح فیض الباری کے نام سے لکھی تھی، شیخ عبدالملک عباسی نے صحیح بخاری کا اس قدر مطالعہ کیا کہ پوری کتاب ان کو حفظ ہوگئی، شیخ محمد طاہر نے صحاح ستہ کی شرح مجمع بحار الانوار کے نام سے لکھی اور مشکوۃ کی لغت پر ”رسالہ فی لغات المشکوۃ“ تصنیف فرمایا، گجرات کے ایک اور عالم شیخ ناصر ہمیشہ مشکوۃ کے مطالعہ میں مشغول رہتے تھے، برہان پور میں شیخ طیب نے مشکوۃ پر حاشیہ لکھا، سید ہبۃ اللہ المعروف

بہ ''شاہ میر شیرازی'' گجراتی المتوفی ۱۰۰۵ھ نے رسالہ ''سودمند''
تیار کیا جس میں تمام اقسام حدیث کو نہایت سلیقہ سے جمع کیا گیا تھا،
حکیم عثمان صدیقی شاگرد شیخ وجیہ الدین علوی نے صحیح بخاری کی
شرح لکھی، شیخ عبدالملک عباسی احمد آباد کے مشہور عالم تھے، حدیث
کی سند اپنے بھائی شیخ قطب الدین سے لی تھی، شیخ قطب الدین شیخ
سخاوی مصری شاگرد ابن حجر عسقلانی کے شاگرد تھے۔'' (مقدمہ شیخ
عبدالحق محدث دہلوی: ص:۴۲)

گجرات کے علاقہ میں مولانا نورالدین شیرازی، مولانا جمال الدین محمد بن عمر حضرمی، شہاب الدین احمد العباسی المصری، شیخ علی متقی، سید عبدالاول حسینی، مولانا وجیہ الدین علوی وغیرہ کے نام ہندوستان کی علمی تاریخ میں قابل فخر نام ہیں، شیخ علی مہائمی کے متعلق مولانا سید عبدالحی مرحوم کا یہ جملہ نظر انداز نہیں کیا جاسکتا کہ ''میرے نزدیک ہندوستان کے ہزار سالہ دور میں شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے سوا حقائق نگاری میں ان کا کوئی نظیر نہیں''۔

مولانا احمد بن سلیمان کردی (۱۰۸۷ھ) مولانا فرید بن علامہ محمد شریف (۱۳۰۶ھ) محمد بن عمر آصفی صاحب ظفر الوالہ بمظفر وآلہ، مولانا خیر الدین سورتی (۱۲۰۶ھ) مولانا ولی اللہ سورتی بن مولانا غلام محمد گجراتی (۱۲۰۷ھ) علامہ بدرالدین محمد بن ابوبکر صاحب مصابیح الجامع فی شرح صحیح البخاری اور سید عبدالاول بن علاء الحسینی صاحب فیض الباری فی شرح صحیح البخاری، قاضی جگن جن کی علمی شہرت اس وقت قسطنطنیہ تک پہنچ گئی تھی، ان شخصیتوں کے ساتھ ایک شخصیت اور قابل ذکر ہے اور بقول مولانا حبیب اللہ خان شیروانی ''تاریخ گجرات کا یہ واقعہ قابل اضافہ ہے کہ ظفر خان شاہ گجرات کا باپ سہارن فیروز شاہ بادشاہ دہلی کے

ہاتھ پر مسلمان ہوکر ایک معزز عہدہ پر ممتاز ہوا تھا، ان کے علاوہ مفتی رکن الدین بن حسام الدین ناگوری نہروالہ، مولانا راجح بن داود، مولانا علاء الدین نہروالہ، مولانا عبدالملک عباسی وغیرہ اور کتنی شخصیتیں ہیں۔

مجموعی طور پر مختلف علمی جہتوں میں جن حضرات نے مایۂ ناز کام انجام دیئے ہیں اور گجرات کو علمی لحاظ سے ممتاز مقام دلایا ہے، ان چند علماء ومصنفین ومدرسین کی غیر معمولی شخصیتوں میں سے چند کا تذکرہ ان کی امتیازی خصوصیت کے ساتھ آئندہ سطور میں بطور مثال پیش کیا جائے گا۔

جیسا کہ گذشتہ سطور میں عرض کیا گیا کہ ابتدائی دور ہی میں اسلام یہاں آ گیا تھا، قرن اول کے مسلمانوں نے ہند میں جنگ وجہاد کی طرح ڈال دی تھی تا کہ اس ملک کے باشندے ان پاکیزہ اخلاق وکردار، اعلی تہذیب وثقافت اور تعلیم وشائستگی کی ان بلند ترین اقدار سے بہرہ یاب ہوسکیں، جن کو اسلام میں بنیادی اور اساسی حیثیت حاصل ہے، لیکن پوری قوت اور عظیم فاتح کی حیثیت سے مسلمان اموی حکمران ولید بن عبدالملک کے عہد میں ۹۳ھ کو محمد بن قاسم ثقفی کے زیر کمان پاکستان کے موجودہ صوبہ سندھ کی طرف سے داخل برصغیر ہوئے، تھوڑے ہی عرصہ میں قبیلۂ بنوثقیف کے اس بہادر جرنیل محمد بن قاسم ثقفی نے سندھ کا تمام تر علاقہ فتح کرلیا اور اس کی سرحدوں کو عبور کر کے ملتان تک آگے بڑھ گئے، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ غیر اسلامی طاقتوں نے ہتھیار ڈال دیئے، پرچم کفر سرنگوں ہوگیا اور اسلام کے فروغ و اشاعت کی راہیں لحہ بہ لحہ کھلتی چلی گئیں۔

قبیلۂ بنوثقیف کے لوگوں نے ابتدائے اسلام میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو بڑی اذیتیں پہنچائی تھیں، طائف میں تبلیغ اسلام کے لئے تشریف لے گئے تو انہوں نے پتھر مار مار

کر آپ کولہولہان کر دیا تھا، یہ لوگ بہت سے قبائل عرب کے بعد آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور نعمت اسلام سے متمتع ہوئے تھے، لیکن ان کو یہ شرف حاصل ہے کہ خدمت اسلام کے بعض نہایت اہم گوشوں میں اللہ تعالیٰ نے ان کو اولیت کی سعادت سے نوازا اور ان کی سعیٔ مسلسل اور تگ وتاز مجاہدانہ سے دنیا کے دور دراز کونوں تک صدائے حق پہنچی، اسی بت کدۂ ہند کی تاریخ کو سامنے رکھئے کہ یہاں سب سے پہلے اسی قبیلہ کے بہادر فوجیوں اور نبیٔ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے جان نثار صحابہ نے توحید کی آواز بلند کی۔ (برصغیر میں اسلام کے اولین نقوش: ۴۴، ۴۵)

ان میں سب سے پہلے جو صحابہ رضی اللہ عنہم کی آمد کا سبب بنے وہ حضرت عثمان بن ابوالعاص ثقفی رضی اللہ عنہ ہیں، سطور ذیل میں ان ہی سے ابتداء کرتا ہوں:

اس خطۂ ارض کا جسے عربی اور فارسی کی قدیم کتب تاریخ میں ''ہند'' کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے اور آزادی کے بعد جسے برصغیر پاک وہند کہا جانے لگا ہے، ملک عرب اور باشندگان عرب سے بہت پرانا تعلق ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جب خلعت نبوت سے سرفراز کر کے دنیا میں مبعوث کیا گیا اس وقت عرب کے مختلف حصوں میں رومی بھی آباد تھے، ایرانی بھی موجود تھے، حبشی بھی فروکش تھے اور ہندی بھی مقیم تھے، ان سطور میں ہمارا مقصد صرف عرب اور ہند کے علمی روابط، دونوں جانب سے علماء کی آمد ورفت، زبان عربی سے تعلق بیان کرنا ہے۔

خطۂ برصغیر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پچیس صحابہ کرام تشریف لائے، بارہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے عہد میں، پانچ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے عہد میں، تین حضرت علی رضی اللہ عنہ کے دور امارت میں، چار حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے ایام حکومت

میں اور ایک یزید بن معاویہ رضی اللہ عنہ کے زمانۂ حکمرانی میں۔(برصغیر میں اسلام کے اولین نقوش:۴۱)

حضرت عثمان بن ابوالعاص ثقفی رضی اللہ تعالیٰ عنہ

نام:عثمان،کنیت:ابوعبداللہ اور سلسلۂ نسب یہ ہے:عثمان بن ابوالعاص بن بشیر بن عبد دہمان بن عبداللہ بن ہمام بن ابان بن یسار بن مالک بن حطیط بن جشم بن قسی ثقیف۔ بعض کتابوں میں عبد دہمان کے بجائے عبدو ہمان ہے،ثقیف کی شاخ بنو مالک کے خاندان بنی یسار میں ایک خانوادہ آل ابوالعاصی ہے،آپ اسی خانوادہ سے ہیں۔

قبیلۂ ثقیف میں آپ کا گھرانہ آل ابوالعاص جاہلی نقطۂ نظر سے بہت معزز ومحترم مانا جاتا تھا اور ثقیف کے بت لات کا متولی تھا۔

مکہ مکرمہ میں قریش بنو ہاشم کعبہ کے متولی تھے اور طائف میں لات کے متولی آل ابی العاص تھے اور ان دونوں گھرانوں میں تعلقات بہت وسیع اور خصوصی تھے اور قرابت داری کی طرح آمد ورفت جاری تھی ، چنانچہ جس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ منورہ ہجرت فرمائی تو آپ کی صاحبزادی حضرت زینب رضی اللہ عنہ ابوالعاص کے یہاں تھیں اوران کوحضرت عباس رضی اللہ عنہ اپنے ساتھ مکہ مکرمہ لائے۔

کہنا چاہئے کہ بنوثقیف میں آل ابوالعاص وہ خوش نصیب گھرانہ ہے،جس نے سب سے پہلے ایک طرح سے نبوت کی برکت پائی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صاحبزادی نے ان کے یہاں قیام کر کے ان کو طائف میں اسلام کے احکام وتعلیمات کا مرکز بنادیا، چنانچہ بعد میں اسی گھر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے امارت پسند فرمائی۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی والدہ کا نام فاطمہ بنت عبداللہ بن ربیعہ ہے، یہ بھی قبیلۂ

ثقیف سے تھیں، فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا عرب کی ان خوش نصیب عورتوں میں تھیں؛ جن کو منجبات کہتے تھے، ان کے بطن سے ابوالعاص کے چار لڑکے پیدا ہوئے، عثمان، حکم، ابوامیہ، ابوعمرو اور ان چاروں نے اپنے زمانہ میں نجابت وشرافت اور عزت وشہرت کی زندگی پائی۔

ابن حزم نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی والدہ کا نام صفیہ بنت امیہ بن شمس لکھا ہے۔

اسلام رمضان ۹ ھ میں: مکہ اور حنین کی فتح کے بعد اہل طائف نے اسلام کی عداوت کے بارے میں اپنا رویہ بدل دیا اور پورے انشراح صدر کے ساتھ اسلام قبول کرنے کے لئے تیار ہوگئے، اس سلسلہ میں باہمی مشورہ کرنے کے بعد طے ہوا کہ اپنے معزز سردار عبد یالیل بن عمرو بن عمیرہ کو خدمت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں مدینہ منورہ بھیجا جائے، مگر عبد یالیل نے تنہا جانے اور ذمہ دارانہ طور پر بات چیت کرنے سے انکار کردیا، چوں کہ بنوثقیف اب ہر قیمت پر اسلام قبول کرنے کے لئے تیار ہوگئے تھے، اس لئے طے ہوا کہ ثقیف کی دوشاخ احلاف اور بنو مالک سے ذمہ دار اشخاص کا ایک وفد عبد یالیل کی سرکردگی میں خدمت نبوی میں حاضر ہو، چنانچہ احلاف سے دو اور بنو مالک سے تین، کل پانچ افراد کا انتخاب ہوا، جن کی سیادت وقیادت عبد یالیل کے سپرد کی گئی، تاکہ واپسی پر ہر شخص اپنے اپنے خاندان کو دعوت اسلام دے، اس وفد میں بنو مالک سے عثمان بن ابوالعاص ارکان وفد میں سب سے کم عمر اور نوخیز تھے۔

طبقات ابن سعد کی روایت کے مطابق احلاف اور بنو مالک سے ملاکر کل ۷۰ر آدمیوں کا وفد مدینہ منورہ آیا تھا، احلاف کے ارکان وفد حضرت مغیرہ بن شعبہ کے یہاں فروکش ہوئے اور بنو مالک والوں کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حجرۂ مبارکہ اور مسجد کے

درمیان ایک خیمہ میں ٹھہرایا، ان ستر آدمیوں میں چھ حضرات بحیثیت ارکان وفد کے ذمہ دارانہ طور پر آئے تھے، باقی لوگ اپنے طور پر ذوق وشوق سے آ گئے تھے۔

حضرت عثمان بن ابوالعاص رضی اللہ عنہ سب سے کم سن اور نوعمر تھے، اس لئے لوگ ان کو خیمہ میں سامان وغیرہ کی حفاظت کے خیال سے چھوڑ کر دن میں خدمت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں حاضر ہوتے اور رات کو خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عشاء کے بعد ان کے خیمہ میں تشریف لاتے اور دیر تک ان سے گفتگو فرماتے، جس میں قریش کے مظالم کا بھی تذکرہ ہوا کرتا تھا، اس درمیان میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے یہ ترکیب نکالی کہ جب ارکان وفد خدمت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے واپس آ کر دوپہر میں اپنے خیمہ میں سوجاتے تو چپکے سے اٹھ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت اقدس میں حاضر ہوتے اور اسلام کے بارے میں آپ سے براہ راست معلومات حاصل کرتے اور قرآن شریف پڑھتے، اس طرح انہوں نے کئی سورتیں زبان رسالت سے سن کر یاد کرلی، اگر آپ آرام فرما ہوتے تو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس جا کر دین کی تعلیم حاصل کرتے اور قرآن شریف پڑھتے، کبھی کبھی حضرت ابی ابن کعب رضی اللہ عنہ سے بھی دینی سوال وجواب کرتے اور قرآن سیکھتے، اس طرح وہ ثقیف کے وفد سے پہلے ہی اسلام قبول کر کے دین اور قرآن کریم کی تعلیم سے بہرہ ور ہوگئے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نوعمری میں ان کی اس دینی حرص، جودت طبع اور دین داری کو دیکھ کر خوشی اور تعجب کا اظہار فرماتے۔

کچھ دنوں کے بعد جب ارکان وفد مسلمان ہو کر طائف واپس ہونے لگے، تو انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ آپ ہم میں سے کسی کو ہمارا امیر مقرر فرما دیجئے؛ چوں کہ آپ نے عثمان بن ابی العاص کی دینی تڑپ اور اسلام سے رغبت دیکھی

تھی، نیز انہوں نے اسی مدت میں قرآن پاک کا ایک معتد بہ حصہ پڑھ لیا تھا، اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارکان وفد کو مخاطب فرمایا: انه كيس ، وقد اخذ من القرآن صدرا ، عثمان بہت سمجھ دار شخص ہیں، انہوں نے قرآن کا ایک حصہ بھی حاصل کرلیا ہے۔

نیز حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے عثمان کی امارت کی سفارش کرتے ہوئے شہادت دی کہ ''یا رسول اللّٰه ﷺ ! انی قد رأیت هذا الغلام منهم من احرصهم علی التفقه فی الاسلام و تعلیم القرآن'' یارسول اللہ! (صلی اللہ علیہ وسلم) میں نے ثقیف والوں میں اس لڑکے کو سب سے زیادہ اسلامی مسائل کے سمجھنے اور قرآن کریم حاصل کرنے میں حریص پایا ہے۔

اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے عبد یالیل اور دوسرے عمر رسیدہ اور اعیان کے ہوتے ہوئے اس نوعمر، نوخیز اور نو جوان کو بنوثقیف اور طائف کا امیر وحاکم مقرر فرمایا۔

وفد کے طائف پہنچ جانے پر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ امام اور امیر ہوکر نماز کی امامت اور قرآن کی معلّمی کرتے رہے۔ ابن سعد کا بیان ہے: فقدم معهم الطائف، فكان يصلی بهم ويقرئهم القرآن ، ''حضرت عثمان رضی اللہ عنہ وفد کے ساتھ طائف آئے اور لوگوں کو نماز پڑھاتے اور قرآن کریم کی تعلیم دیتے رہے۔''

یہ واقعہ رمضان ۹ ھ کا ہے، اس کے بعد تمام بنوثقیف پورے انشراح اور اخلاص سے اسلام پر جم گئے۔

طائف کی امارت

یوں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی زندگی میں متعدد صحابہ رضی اللہ عنہم کو مختلف مقامات کا امیر وحاکم مقرر فرمایا تھا؛ مگر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی امارت ان سب میں اس

اعتبار سے مثالی رہی کہ آپ کے وصال کے بعد بھی وہ پورے دور صدیقی اور ابتدائی دور فاروقی تک طائف میں اپنے عہدے پر قائم رہے اور انہوں نے اپنی قابلیت وصلاحیت سے ثقیف اور اہل طائف کی ہر معاملہ میں رہنمائی فرمائی، طائف میں آپ کی امارت کی مدت تقریبا چھ سال رہی، جس میں سے ڈیڑھ سال عہد نبوت میں، ڈھائی سال عہد صدیقی میں اور دو سال عہد فاروقی میں، پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے آپ رضی اللہ عنہ کو ۱۵ھ میں عمان اور بحرین کا امیر بنایا، اسی دور امارت میں آپ رضی اللہ عنہ اور آپ کے بھائیوں نے ایران اور ہندوستان میں جہاد کیا۔

بحرین اور عمان کی امارت

حضرت عثمان ثقفی رضی اللہ عنہ نے ۹ رہجری میں بحرین اور عمان دونوں صوبوں کی زمام امارت یوں سنبھالی کہ خود تو عمان چلے گئے اور بحرین پر اپنے بھائی حکم بن ابوالعاص ؓ کو اپنا نائب مقرر کر کے ان کو طائف سے بلایا اور یہاں آتے ہی اپنی انتظامی صلاحیت سے عوام کو رام کر لیا اور دونوں صوبوں کا پورا علاقہ مطیع اور فرمان بردار ہو گیا، جب ادھر سے اطمینان ہو گیا تو ایران میں فتوحات کا سلسلہ جاری کیا، اسی سلسلہ میں ہندوستان بھی جہاد کیا۔

۱۵ھ سے ۲۹ھ تک حضرت عثمان ثقفی رضی اللہ عنہ کا مستقل وطن مدینہ منورہ رہا اور عمان و بحرین کی امارت کے دوران آپ حسب ضرورت یہیں قیام فرماتے تھے، ویسے آپ کا یہ زمانہ اکثر و بیشتر جہاد و غزوات میں گزرا۔

بصرہ میں جاگیر و زمین

بحرین اور عمان کی امارت کے ہی زمانہ میں حضرت عثمان ثقفی رضی اللہ عنہ اور ان کے لڑکوں نے بصرہ میں اُبلّہ کے قریب ایک قطعۂ زمین حاصل کر کے اسے کاشتکاری اور آبادی

کے قابل بنایا تھا، ۲۹ھ کے بعد جب حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے عثمان ثقفی رضی اللہ عنہ کو بصرہ میں مستقل جاگیر عطا کی تو اسی کے ساتھ ان کے اس مقبوضہ قطعہ زمین کو جاگیر میں شامل کرلیا۔

عہدعثمانی میں ۲۹ھ میں معزولی اور بصرہ میں مستقل قیام

حضرت عثمان ثقفی رضی اللہ عنہ عہد فاروقی میں نو دس سال تک اپنے عہدے پر رہ کر متعلقہ خدمات بحسن وخوبی انجام دیتے رہے اور چھ سال تک عہد عثمانی میں بھی اپنے منصب پر رہے، یہاں تک کہ ۲۹ھ میں حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ان کو معزول کر کے ان کی جگہ عبداللہ بن عامر بن کریز کو مقرر کیا، اس کے بعد حضرت عثمان ثقفی رضی اللہ عنہ نے بصرہ میں مستقل طور سے قیام فرمایا اور وہیں وفات پائی۔

احادیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی روایت

حضرت عثمان ثقفی رضی اللہ عنہ امیر ومجاہد اور فاتح ہونے کے ساتھ محدث وفقیہ بھی تھے، وہ ان جامع شخصیتوں میں سے تھے جو اسلامی رزم و بزم دونوں میں برابر کے حصہ دار ہیں، آپ اپنے ساتھ عِلم وعَلم دونوں رکھتے تھے، چنانچہ وہ حاملین علوم نبوت میں سے بھی شمار کئے جاتے ہیں اور ان سے متعدد احادیث مروی ہیں، خاص طور سے اہل مدینہ اور اہل بصرہ نے ان سے روایت کی ہے اور امام حسن بصری ان کے خصوصی شاگرد ہیں، جنھوں نے ان سے بہت زیادہ روایت کی ہے۔

امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ نے کتاب العلل ومعرفۃ الرجال میں لکھا ہے کہ امام حسن بصری کہتے ہیں کہ میں نے عثمان بن ابی العاص رضی اللہ عنہ سے افضل کسی کو نہیں دیکھا، ہم ان کے مکان پر جاکر ان سے حدیث کی روایت کرتے تھے۔

امام نووی نے تہذیب الاسماء واللغات میں تصریح کی ہے کہ عثمان بن ابوالعاصؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ۹/احادیث کی روایت کی ہے، جن میں سے تین حدیثیں صحیح مسلم میں ہیں، باقی سنن کی کتابوں میں ہے۔

حافظ ابن عبدالبر نے لکھا ہے : وروی عنه اهلها واهل المدينة ايضا ، والحسن اروى الناس عنه. وقيل : انه لم يسمع منه.

حضرت عثمان ثقفی رضی اللہ عنہ سے اہل بصرہ اور اہل مدینہ نے روایت کی ہے اور حسن بصریؒ نے ان سے سب سے زیادہ روایت کی ہے اور ایک قول یہ ہے کہ حسن بصریؒ نے ان سے حدیث کا سماع نہیں کیا ہے۔

حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ نے زندگی کا بیشتر حصہ بصرہ میں گزارا اور وہیں ۱۱۰ھ میں وفات پائی، حضرت عثمان ثقفی رضی اللہ عنہ بھی ۲۹ھ میں مستقل بصرہ میں سکونت پزیر تھے اور ان کے انتقال کے وقت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ کی عمر ۳۰/سال سے زائد تھی، اس زمانہ میں تابعین صحابہ سے ملنے اور ان سے براہ راست حدیث کی روایت وسماع کا بہت زیادہ اہتمام کرتے تھے اور حضرت امام محمدؒ نے حسن بصری کے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے سماع وروایت کی تصریح خود حسن بصری کی زبانی کی ہے، ان حقائق کے ہوتے ہوئے یہ کہنا کہ حسن بصریؒ نے عثمان ثقفی رضی اللہ عنہ سے حدیث کا سماع نہیں کیا ہے، یہ بعید بات معلوم ہوئی۔

حضرت عثمان ثقفی رضی اللہ عنہ سے جن حضرات نے روایت کی ہے ان میں سے ان کے بھائی حکم بن ابوالعاص، بھتیجے یزید بن حکم بن ابوالعاص اور غلام ابوالحکم ہے، ان کے علاوہ علماء رجال نے ان حضرات کے نام ذکر کئے ہیں: سعید بن مسیّب، موسی بن طلحہ بن عبداللہ، نافع بن جبیر بن مطعم، محمد بن عیاض، محمد بن سیرین، عبدالرحمٰن بن جوشن غطفانی، حسن بصری

رحمۃ اللہ علیہم۔ان تمام حضرات میں حسن بصری اپنے شیخ کے علوم ومعارف کے سب سے زیادہ راوی وناشر ہیں۔

وفات: حضرت عثمان رضی اللہ عنہ ۲۹ھ میں معزولی کے بعد اپنے لڑکوں اور بھائیوں سمیت بصرہ میں مستقل طور سے سکونت پزیر ہو گئے تھے اور انہوں نے اپنی زندگی کے باقی ایام وہیں نہایت امن واطمینان اور عزت کے ساتھ گزارے، اس درمیان میں ان کی کسی خارجی یا داخلی مہم یا سیاسی، ملکی اور فوجی سرگرمی کا پتہ نہیں چلتا، البتہ ان کے بصرہ میں انتقال کی تصریح کتابوں میں موجود ہے۔

ابن عبدالبر نے الاستیعاب میں، ابن قتیبہ نے المعارف میں، ابن حجر نے الاصابۃ اور تقریب التہذیب میں اور نووی نے تہذیب الاسماء واللغات میں تصریح کی ہے کہ حضرت عثمان ثقفی رضی اللہ عنہ نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں بصرہ میں وفات پائی، سن وفات ابن حجر نے اصابہ میں ۵۱ھ یا ۵۵ھ لکھا ہے اور تہذیب التہذیب میں بھی ۵۱ھ لکھ کر تحریر کیا ہے کہ ابن برقی، خلیفہ بن خیاط، عسکری نے ۵۵رہجری میں بتایا ہے۔

اولاد: اللہ تعالیٰ نے حضرت عثمانؓ کو اولاد کے بارے میں بھی بڑا خوش نصیب بنایا تھا، ان کے لڑکے ان کے سامنے پروان چڑھے، اسلامی جہاد میں شریک ہوئے، باپ کے ساتھ زندگی کے مسائل ومعاملات میں تجربات حاصل کئے، بعد میں ان کی نسل میں اچھے اچھے علماء ومحدثین اور مشاہیر دوران گزرے ہیں۔

یہ تو اس صحابی کا حال تھا جو گجرات میں انفاس قدسیہ اور مقدس ہستیوں کے آمد کا سبب بنے اور انہوں نے جن کو گجرات روانہ کیا وہ حضرت حکم رضی اللہ عنہ ہیں جن سے ان کا اخوت

کا رشتہ تھا، اولا ان کے کچھ مختصر حالات کے بعد گجرات آمد پر گفتگو کی جائے گی۔

حضرت حکم بن ابوالعاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ

کنیت ابوعثمان یا عبدالملک ہے اور نام ونسب یہ ہے: حکم بن ابوالعاص بن بشر بن عبد دہمان ثقفی، حضرت عثمان ثقفی رضی اللہ عنہ کے حقیقی بھائی اور ان کی تمام حاکمانہ، فاتحانہ اور امیرانہ سرگرمیوں میں برابر کے شریک اور ثانی اثنین ہیں۔

حضرت حکم رضی اللہ عنہ بھی ۹ھ میں اسلام لائے؛ البتہ بنوثقیف کے وفد کے ساتھ خدمت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں ان کی حاضری سے علامہ ابن سعد نے اپنی لاعلمی ظاہر کی ہے۔

آپ رضی اللہ عنہ کو صحابیٔ رسول ہونے کا شرف حاصل ہے، ابن سعد نے لکھا ہے:
واخوہ الحکم بن ابی العاص بن بشر بن عبد دھمان ، وقد صحب النبی ﷺ .

حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے: قال ابن سید :یقال:له صحبة.

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی طائف کی امارت کے زمانہ میں حضرت حکم رضی اللہ عنہ کی دینی خدمات

حضرت حکم رضی اللہ عنہ بھی اپنے بھائی عثمان رضی اللہ عنہ کی طرح امارت وسیاست میں بہت دوراندیش اور انتظامی واصلاحی امور میں پیش پیش رہتے تھے اور عثمان رضی اللہ عنہ کی طائف کی امارت کے پورے زمانہ میں ہر کام میں ان کے دست راست بن کر کام کرتے رہے؛ حتی کہ جب ۱۵ھ میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ بحرین وعمان کی امارت پر آئے تو حضرت حکم رضی اللہ عنہ کو یہاں بھی اپنے ساتھ رکھا۔

طبری کی روایت کے مطابق عہد صدیقی میں جب ردت کی وبا پھوٹی تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے طائف میں ایک رضا کارانہ فوج تیار کی، جس کے بیس بیس سپاہی اطراف وجوانب کی بستیوں میں تعینات کئے گئے تھے؛ تاکہ ان میں ارتداد نہ پھیلے، اس جماعت کے سربراہ حضرت حکم رضی اللہ عنہ تھے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایام ردت میں عثمان رضی اللہ عنہ کی طرح حضرت حکم رضی اللہ عنہ نے بھی نہایت مستعدی اور اخلاص سے کام لیا اور ارتداد کے روکنے میں اپنے امیر بھائی کی پوری مدد کی۔

طائف کی امارت

حضرت حکم رضی اللہ عنہ کے بھائی عثمان رضی اللہ عنہ ۹ھ سے ۱۵ھ تک طائف کے امیر رہے، اس مدت میں حکم رضی اللہ عنہ نے ہر موقع پر اپنے بھائی کا ساتھ دیا اور اپنی بہترین انتظامی صلاحیت سے ان کی امارت میں چار چاند لگائے، اس لئے جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان کو بحرین وعمان کی امارت کے لئے طلب کیا اور کہا کہ اپنے کسی معتبر ومعتمد آدمی کو اپنا نائب بنا کر میرے پاس آجاؤ، تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے طائف کی امارت اپنے بھائی حکم کے حوالے کی، بلکہ اصابہ میں حکم کے تذکرہ میں یہ ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عثمان رضی اللہ عنہ کو صراحت کے ساتھ لکھا کہ اپنے بھائی حکم کو اپنا نائب بنا کر میرے پاس آجاؤ، اس تصریح کی رو سے یہ نیابت نہیں؛ بلکہ مستقل امارت تھی، جس کی تقرری اور منظوری خلیفۂ وقت کی طرف سے ہوئی تھی اور حضرت حکم نے اپنی قابلیت وصلاحیت سے کچھ دنوں تک طائف کی امارت وحکومت کا عہدہ سنبھالا اور کسی قسم کی ابتری پیدا نہ ہونے دی۔

بحرین کی امارت وفتوحات

جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ۱۵ھ میں حضرت عثمان ثقفی رضی اللہ عنہ کو بحرین

اورعمان کی امارت وحکومت دی تو انہوں نے بہت جلد اپنے بھائی حکم کو طائف کی امارت دیدی، یہ دونوں صوبے مرکز خلافت سے بہت دور اور دشوار گزار علاقے میں تھے، ساتھ ہی بڑے شورش پسند اور ہنگامہ خیز بھی تھے، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے سوچا کہ مجھ سے تنہا ان دونوں صوبوں کا انتظام بوجوہ احسن نہیں ہوسکتا، اس لئے حکم رضی اللہ عنہ کو بحرین کی امارت وحکومت دیدی، یہ امارت وحکومت بھی امیر المؤمنین ہی کی مرضی واجازت سے تھی، اس لئے علماء نے اسے مستقل امارت لکھا ہے۔ ابن اثیر نے لکھا ہے: کان امیرا علی البحرین یعنی حضرت حکم بحرین کے امیر تھے۔

علامہ ذہبی نے تصریح کی ہے: لہ صحبة و امر علی البحرین یعنی حضرت حکم رضی اللہ عنہ صحابی ہیں اور بحرین کے امیر بنائے گئے۔ بلاذری نے لکھا ہے: فوجه اخاه الحَكم الى البحرين و مضى الى عمان.

یہاں دونوں بھائیوں نے مل کر ملکی استحکام وانتظام اور غزوات وفتوحات میں سرگرمی دکھائی اور حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے حکم ومنشاء اور خلافت کے مشورہ کے بعد حضرت حکم رضی اللہ عنہ اپنے وظائف بجالاتے رہے۔ حافظ ابن حجر نے لکھا ہے: و ولاه اخوه عثمان البحرين فافتتح فتوحا كثيرة یعنی حضرت حکم رضی اللہ عنہ کو ان کے بھائی عثمان رضی اللہ عنہ نے بحرین کی ولایت دی تو انہوں نے بہت سی فتوحات حاصل کیں، ابن عبدالبر نے لکھا ہے: وافتتح عثمان والحكم فتوحا كثيرة بالعراق فى سنة تسع عشرة و سنة عشرين.

الغرض حکم ثقفی رضی اللہ عنہ نے بھی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے ساتھ ایران وہندوستان کی فتوحات میں حصہ لیا، کئی غزوات میں خود امیر تھے اور اسلامی فتوحات کے ایرانی

مرکز توج سے ایک طرف خراسان وبجستان کے بلاد وامصار فتح کرتے اوردوسری طرف ہندوستان میں جہادفرماتے ،اس کی تفصیل بعد میں ذکر کی جائے گی۔

اوصاف وکمالات

حضرت حکم صحابیٔ رسول صلی اللہ علیہ وسلم تھے اوران میں بھی صحابیت کی پوری شان پائی جاتی تھی، معاملہ فہمی ،حسن انتظام اورتقوی وطہارت میں شہرت رکھتے تھے، ساتھ ہی احادیث رسول کے راوی بھی تھے۔

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے تاریخ کبیر میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ اورحضرت حکم رضی اللہ عنہ کے مابین ایک معاملہ کا تذکرہ مختصر طور سے کیا ہے اورابن اثیر نے اس کی تفصیل حضرت حکم سے یوں بیان کی ہے کہ ایک مرتبہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مجلس میں کہا کہ میرے پاس یتیموں کا کچھ مال رکھا ہواہے، جو زکوۃ ادا کرنے کی وجہ سے کم ہوتا جاتا ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ مال یوں ہی پڑا پڑا ختم ہوجائے گا، کیاتم میں کوئی تاجر ہے؟ میں نے اپنے آپ کواس کام کے لئے پیش کیا،تو آپ نے مجھے دس ہزار کی رقم دی، میں یہ رقم لے کر کچھ دنوں کے لئے باہر چلا گیا، جب واپس آیاتو آپ نے مجھ سے دریافت فرمایا کہ ہمارے مال کا کیا ہوا؟ میں نے کہا: یہ آپ کا مال موجود ہے اورایک لاکھ کی رقم سامنے رکھ دی اور بتایا کہ دس ہزار کی رقم تجارت کی وجہ سے اس مقدار تک پہنچ گئی ہے۔

احادیث کی روایت

حضرت حکم ثقفی رضی اللہ عنہ اپنے بھائی عثمان رضی اللہ عنہ ہی کی طرح امیر ومجاہد اور فاتح ہونے کے ساتھ احادیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور دینی علوم سے بھی حصہ ٔوافر رکھتے

تھےاور بصرہ کے علماء ومحدثین میں شمار کئے جاتے تھے۔

انہوں نے براہ راست رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مرفوع احادیث کی روایت کی ؛مگر بعض محدثین نے ان کی احادیث کومرسل بتایاہے۔ابن عبدالبر لکھتے ہیں: يعد في البصريين ومنهم من يجعل احاديثه مرسلة ، حکم بصرہ کے محدثین میں شمار کئے جاتے ہیں اور بعض ان کی احادیث کومرسل قرار دیتے ہیں۔

حضرت حکم رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ اوراپنے بھائی عثمان رضی اللہ عنہ سے احادیث کی روایت کی ہےاوران سے معاویہ بن قرہ نے روایت کی ہے۔

وفات: حضرت حکم رضی اللہ عنہ بھی اپنے بھائی عثمان رضی اللہ عنہ سے پہلے ۲۴ھ میں بحکم امیر المؤمنین حضرت عثمان رضی اللہ عنہ معزول ہوکر بصرہ میں مقیم ہوگئے،حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے دوسرے بھائیوں کی طرح ان کوبھی اپنے علاقہ شط عثمان ثقفی رضی اللہ عنہ سے ایک قطعۂ زمین جاگردی جسے حکمان کہتے تھے،آپ نے اسی میں اپنامکان بنایااور بود وباش اختیار کی اور بصرہ ہی میں ۲۵ھ کے بعد انتقال کیا۔

اولاد: حضرت حکم کے چارلڑکوں کے نام معلوم ہوسکے، جودرج ذیل ہیں:

(۱) یزید بن حکم ثقفی رضی اللہ عنہ، یہ شاعر تھے اور حجاج بن یوسف نے ان کو اپنی امارت عراق کے زمانہ میں علاقۂ فارس کا حاکم بنایا تھا،انہوں نے اپنے چچا عثمان رضی اللہ عنہ سے حدیث کی روایت کی ہے۔

(۲) عبدالرحمٰن بن حکم ثقفی رضی اللہ عنہ (۳) یحییٰ بن حکم ثقفی رضی اللہ عنہ، ان کے پوتے حکم بن ایوب بن یحییٰ ثقفی رضی اللہ عنہ حجاج بن یوسف کے نائب تھے۔

(۴) یعلی بن حکم ثقفی رضی اللہ عنہ؛ یہ شاعر تھے۔

حضرت عثمان ثقفی رضی اللہ عنہ کی اولاد کی طرح ان کے بھائی حکم کی اولاد بھی اعیان واشراف میں شمار ہوتی تھی اور بصرہ میں ان کو بڑا جاہ وجلال حاصل تھا۔

حضرت حکم رضی اللہ عنہ کی گجرات آمد

اس سے قبل گزر چکا ہے کہ حضرت عثمان ثقفی رضی اللہ عنہ نے ۱۵ھ میں عمان اور بحرین کی امارت سنبھالی، اسی دور میں آپ اور آپ کے بھائیوں نے ایران اور ہندوستان میں جہاد کیا اور یہ بھی بیان کیا جا چکا ہے کہ آپ کا شمار صحابہ کرام میں ہوتا ہے۔

حضرت مولانا سید حکیم عبدالحی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے عنان حکومت اپنے ہاتھ میں لینے کے ساتھ اپنے بھائی حکم بن ابو العاص رضی اللہ عنہ کو بحرین کی حکومت پر نامزد کر کے حکم دیا کہ وہ ہندوستان پر فوج کشی کریں، حضرت حکم رضی اللہ عنہ نے کشتیوں کے ذریعہ دریائی سفر کی سخت منزلیں طے کیں اور اپنی فوج کو لئے ہوئے سب سے پہلے سواحل گجرات پر قدم رکھا یا یوں کہنا چاہیے کہ ہندوستان کی سرزمین میں سب سے پہلے گجرات کو یہ شرف حاصل ہوا کہ اس خدائے یکتا پر ایمان لانے والوں کا اور اسی ایک ہستی کو وحدہ لاشریک لہ جاننے اور اسی کو قادر مطلق اور مصرف الامور ماننے والوں کا پاک قدم پہلے اسی سرزمین پر پڑا اور اسی سرزمین کے دشت وجبل ہندوستان میں سب سے پہلے اللہ اکبر کے نعروں سے گونجے۔ (یاد ایام: ص:۴۴)

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے عمان میں امارت سنبھالی تھی اور بحرین اپنے بھائی حکم

رضی اللہ عنہ کو بھیج دیا تھا، اسی عمان میں انہوں نے متطوعین اور فدائیان اسلام کی فوج تیار کی اور اس کی قیادت اپنے بھائی حکم کو دے کر ہندوستان روانہ کیا، اس مہم میں تھانہ اور بھروچ دونوں ساحلی مقامات پر حکم بن ابوالعاص رضی اللہ عنہ نے اپنی فوج کو لے کر حملہ کیا اور فتح پائی، نیز حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اپنے دوسرے بھائی مغیرہ بن ابوالعاص کی زیر قیادت ایک رضا کارانہ بحری فوج دیبل کی طرف روانہ کی جہاں سے اسلامی لشکر مظفر و منصور واپس ہوا۔

جب ہندوستانی لشکر واپس ہوا تو حضرت عثمان ثقفی رضی اللہ عنہ نے امیر المؤمنین حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اس کی پوری تفصیل لکھی؛ چوں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اس فوج کشی سے بے خبر تھے اور اس سے پہلے بحری راستہ سے اسلامی فوج ادھر نہیں آئی تھی، اس لئے آپ رضی اللہ عنہ نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے اس اقدام کو ناپسند فرمایا اور تہدید آمیز خط لکھا کہ اس خطرناک اور غیر منظّم مہم میں مسلمانوں کا جانی نقصان ہوا تو تمہارے قبیلۂ ثقیف سے ایک ایک کا بدلہ لوں گا، الغرض وصال نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے چار سال بعد صحابۂ کرام اسلام کی دولت لے کر ہندوستان تشریف لائے اور یہ سرزمین ان کی تشریف آوری سے سعادت مند ہوئی۔

حضرت قاضی اطہر مبارک پوری رحمۃ اللہ علیہ بلاذری کے حوالہ سے اس کی تفصیل یوں بیان فرماتے ہیں:

قال البلاذری : أخبرنا علی بن محمد بن عبد اللّٰہ بن ابی سیف قال : ولی عمر بن الخطاب رضی الله عنه عثمان بن ابی العاص الثقفی البحرین وعمان سنة خمس عشرة

فوجه اخاه الحكم الى البحرين ومضى الى عمان فاقطع جيشا الى تانه فلما رجع الجيش كتب الى عمر يعلمه ذلك ، فكتب اليه عمر : يا اخا ثقيف ! حملت دودا على عود ، وانى احلف بالله ان لو أصيبوا لاخذت من قومك مثلهم ، ووجه الحكم ايضا الى بروص ، ووجه اخاه المغيرة بن ابى العاص الى خور دبيل ، فلقى العدو ، فظفر.

چوں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے دور میں بحری راستوں سے غزوات کی نوبت نہ آئی تھی ، اس لئے بھی حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس سفر کو ناپسند فرمایا؛ تاکہ نبی اقدس صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے نقش قدم پر چل کر ان کی اتباع سے سرفرازی نصیب ہو۔

قاضی اطہر مبارک پوری رحمۃ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں:

وكانت تطوعا من غير اذن عمر رضى الله عنه وعلمه لانه كان لا يأذن بغزوة البحر تأسيا بالنبى ﷺ وابى بكر حتى أذن بها فى سنة سبع عشرة. (العقد الثمين :ص:۴۰،۴۴، ط:المطبعۃ الحمیدیۃ ،اعظم گڈھ)

اس غزوہ میں گمان وظن یہی ہے کہ وہ پاک طینت اور مقدس ہستیاں جو اس لشکر میں موجود تھیں ، انہوں نے یہاں جام شہادت نوش فرمایا ہو اور اس خطہ میں ان کے مبارک اجسام کنز مخفی کی طرح محفوظ ہو۔ حضرت مولانا حکیم سید عبدالحی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

اس حملہ میں جن سعادت مندوں کو مرتبۂ شہادت نصیب ہوا، ان میں غالباً وہ انفاس قدسیہ بھی تھے، جنہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ

وسلم کا جمال جہاں آرا دیکھا تھا اور آپ کی پاکیزہ صحبت وروحانی تعلیم سے بھی مستفید ہو چکے تھے، ان فدائیان اسلام کی قدسی صورتیں اسی سرزمین کی آغوش محبت میں گنج بے رنج کی طرح مدفون ہوئیں ؛اگرچہ ہم کو اس کنز مخفی کا پتہ نہیں ؛ مگر یہ یقینی ہے کہ بمبئی اور بھروچ کے گرد ونواح میں یہ خزانہ سپرد خاک ہوا ہوگا۔(یاد ایام: ۴۴،۴۵،ط: مرکز تحقیقات لکھنؤ)

چوں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ناپسندیدگی وناراضگی کا اظہار کیا تھا،اس لئے یہ لشکر ان مقامات ثلاثہ سے آگے نہ بڑھ سکا اور یہیں سے واپس ہوگیا اور اس کے بعد ایک مدت تک حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی طرف سے کوئی جنگی مہم کا پتہ نہیں چلتا۔قاضی اطہر صاحب رحمۃ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں: معلوم ہوتا ہے کہ ۱۵ھ سے ۲۰ھ تک خود حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے کوئی جنگی سرگرمی نہیں دکھائی ؛ بلکہ ۲۱ھ میں پہلا حملہ انہوں نے توج پر کیا اور اسی میں اپنے بھائی حکم سے مدد لی، چنانچہ حموی نے معجم البلدان میں لکھا ہے کہ حضرت عثمانؓ نے اپنے بھائی حکم کو عمان سے بحری مہم پر روانہ کیا اور انہوں نے فارس کے شہر برکان کو فتح کر کے توج کا رخ کیا۔

ہندوستان (اور خاص طور سے گجرات) طائف اور اس کے قبیلۂ بنوثقیف کا یہ احسان کبھی نہیں بھول سکتا ہے کہ انہوں نے ہندوستان کو اپنی دینی اور روحانی توجہ کا مرکز بنا کر جب بھی اسے اقتدار ملا،اس کی طرف رخ کیا،عہد فاروقی میں حضرت عثمان ثقفی رضی اللہ عنہ نے بحرین وعمان کی گورنری پاتے ہی اپنے دو بھائیوں حکم اور مغیرہ کو یہاں اسلام کی برکت دے کر روانہ کیا اور اموی دور خلافت میں حجاج بن یوسف ثقفی نے عراق کی گورنری پا کر اپنے جواں

سال بھتیجے محمد بن قاسم کو خلافت کے زیر اہتمام با قاعدہ اسلامی فوج کے ساتھ ہندوستان روانہ کیا۔ (محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ کا ہندوستان مع ہندوستان صحابہ کے زمانہ میں: ص: ۱۵۴، ط: فرید بک ڈپو، نئی دہلی)

گجرات میں انفاس قدسیہ کی پہلی آمد ۱۵ھ میں ہوئی، اس کے بعد گجرات پر دوسرا حملہ مہدی باللہ عباسی کے دور میں ہوا، جب کہ اس نے بغداد میں باگ ڈور سنبھالی، تو اس نے ۱۵۶ھ مطابق ۷۷۵ء میں ایک لشکر کافی ساز وسامان کے ساتھ جہاد کے لئے روانہ کیا، جن کے قائد وامیر عبدالملک بن شہاب مسمعی تھے، یہ لشکر قدیم تاریخی شہر بھروچ سے تقریبا ۲۰ رکیلو میٹر دوری پر واقع مقام ''بھاڑ بھوت'' پہنچا، عربی مؤرخین نے اس کا نام معرب بنا کر ''باربد'' لکھا ہے، اس فوج میں مشہور محدث ابوبکر ربیع بن صبیح رحمۃ اللہ علیہ بھی تھے۔

یہ فوج ۱۶۰ھ میں بھاڑ بھوت پہنچی اور فتوحات عظیمہ حاصل کیں، وہ زمانہ دریا کے چڑھاؤ کا تھا، اترنے کے انتظار میں عبدالملک نے کچھ دنوں وہاں قیام کرنا مناسب سمجھا، یہ اسی انتظار میں تھا کہ دفعۃً ہوا میں عفونت پیدا ہوئی اور ایک ہزار آدمی وبا کا شکار ہو گئے، حضرت ربیع بن صبیح رحمۃ اللہ علیہ کا بھی اسی بیماری میں انجام بخیر ہو گیا اور اسی زمین میں وہ پیوند خاک ہو گئے، یہ دوسرا اشرف اس سرزمین گجرات کو حاصل ہے کہ ایسا شخص اس کی آغوش میں سو رہا ہے جو فن حدیث میں پہلا مصنف ہے؛ بلکہ صاحب کشف الظنون کی رائے میں مسلمانوں میں پہلا شخص ہے جس نے کتاب تصنیف کی ہے۔ (یاد ایام: ص: ۴۶، اضواء علی تاریخ الحرکۃ العلمیۃ فی غجرات: ص: ۱۶، ط: مطبعۃ ندوۃ العلماء لکھنؤ)

مولانا غلام علی آزاد بلگرامی نے اول مصنف کے بارے میں مختلف اقوال ذکر کئے ہیں، ان میں بھی ربیع بن صبیح رحمۃ اللہ علیہ کا ذکر فرمایا ہے۔ عبارت ملاحظہ ہو:

قـال صـاحـب كشف الظنون : اختلف في اول من صنف فـي الاسـلام فـقيـل : انـه الامـام عبد الملك بن عبد العزيز البـصري المتوفى في سنة ست وخمسين ومائة ، وقيل ابو الـنـصر سعد بن عروفة المتوفى سنة ست وخمسين ومائة وذكـرهـمـا الـخـطيـب البغدادي. وقيل : ربيع بن صبيح الـمتـوفـى سـنة ستين ومائة ، قاله ابو محمد الرامهرمزي .

(سبـحة الـمـرجـان فـي آثـار هندوستـان : ص: ٦٤، ج : ١، ط:معهد الدراسات الاسلامية ، علی گڈه)

سرزمین بھروچ کی آغوش میں یہ عظیم المرتبت شخصیت آسودۂ خواب ہیں اوران کا بھی اس خطہ کے مسلمانوں پراحسان ہے، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان کے حالات زندگی پر مختصر روشنی ڈالی جائے۔ چوں کہ سن کے اعتبار سے نام درج کئے گئے ہیں، اس لئے آئندہ سطور میں ان کے مفصل حالات ذکر کئے جائیں گے۔

عبدالرحمٰن بیلمانی رحمۃ اللہ علیہ

عبدالرحمٰن بن ابوزید بیلمانی رحمۃ اللہ علیہ کا شماران لوگوں میں ہوتا ہے، جو حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے دورخلافت میں خمس کے طور پران کے حصے میں آئے ، انہیں موالی عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ میں گردانا جاتا ہے، ان کی کنیت ابوحاتم تھی ، یہ وہ تابعی ہیں ؛ جنہوں نے صحابہ میں سے عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ، عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ، عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ، سعید بن زید رضی اللہ عنہ، عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ، معاویہ رضی اللہ عنہ، عمرو بن عبسہ رضی اللہ عنہ اور عمرو بن اوس رضی اللہ عنہ سے روایت حدیث کی، تابعین کی جماعت میں سے

انہوں نے عبدالرحمٰن اعرج اور نافع بن جُبیر بن مطعم سے روایت کی۔

عبدالرحمٰن بن ابوزید بیلمانی سے بھی بہت سے حضرات نے حدیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی روایت کا شرف حاصل کیا، جن میں ان کے بیٹے محمد بن عبدالرحمٰن بیلمانی رحمۃ اللہ علیہ کے علاوہ یزید بن طلق، ربیعہ بن ابوعبدالرحمٰن، خالد بن عمرو، سماک بن فضل اور ایک جماعت شامل ہے۔

عبدالمنعم بن ادریس کہتے ہیں کہ عبدالرحمٰن بن ابوزید دراصل اہل یمن سے تعلق رکھتے تھے اور بہترین شاعر تھے، حرّان میں ان کی آمدورفت کا سلسلہ جاری تھا، انہوں نے اموی خلیفہ ولید بن عبدالملک سے ملاقات کی اور وہ ان سے بہت اچھی طرح پیش آیا، اس کا عہد حکومت ۸۶ رہجری سے ۹۶ رہجری تک دس سال کا ہے، اسی کے عہد میں ان کی وفات ہوئی۔

ترمذی شریف میں طواف وداع کے بارے میں عبدالرحمٰن بیلمانی رحمۃ اللہ علیہ سے حدیث مروی ہے اور نسائی شریف میں عمرو بن عبسہ سے ان کے قبول اسلام کے متعلق واقعہ بیان کیا گیا ہے، ابن حبان نے ان کو ثقات میں شمار کیا ہے اور دارقطنی نے ضعیف قرار دیا ہے اور لکھا ہے: ضعیف لا تقوم بہ حجۃ. ''یعنی عبدالرحمٰن بیلمانی رحمۃ اللہ علیہ ضعیف راوی ہیں، ان کی روایات کو قابل حجت نہیں مانا جاسکتا۔''

یہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے مولی تھے اور بیلمانی تھے، بیلمان، بھیلمان کا معرب ہے جو سندھ، گجرات، کاٹھیاواڑ اور مارواڑ کے درمیان ایک قصبہ ہے اور یہ قصبہ جنید بن عبدالرحمٰن کے ہاتھوں بنوامیہ کے مشہور حکمران ہشام بن عبدالملک کے عہد حکومت میں فتح ہوا۔ (برصغیر میں اسلام کے اولین نقوش: ۱۱۴، ۱۱۵)

حارث بیلمانی رحمۃ اللہ علیہ

حارث بیلمانی رحمۃ اللہ علیہ وہ تابعی تھے، جنہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے

مشہور وممتاز صحابی حضرت عبدالرحمٰن بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت حدیث کا شرف حاصل کیا، پھر خود مسند تدریس آراستہ کی اور ان سے جو حضرات سماعِ حدیث کی سعادت سے بہرہ اندوز ہوئے، ان میں ان کے بیٹے محمد بیلمانیؒ کا اسم گرامی بھی شامل ہے۔

بیلمان: یہ ''بھیلمان'' کی تعریب ہے، اس زمانہ میں یہ ایک گاؤں یا قصبہ تھا جو سندھ، گجرات، کاٹھیاواڑ اور مارواڑ کے درمیان کہیں واقع تھا۔

یہ معلوم نہیں ہوسکا کہ حارث کس علاقہ اور شہر سے ''بھیلمان'' آئے، کب آئے، کس کام کے سلسلہ میں آئے، کتنا عرصہ وہاں قیام رہا اور ان کی کیا سرگرمیاں تھیں۔ (تہذیب التہذیب: ۹/۱۰۴، ۲۹۴، ۲۹۵، بضمن محمد بن الحارث البیلمانی ومحمد بن عبدالرحمٰن البیلمانی)

محمد بن ابراہیم بیلمانی

محمد بن ابراہیم بیلمانی کا تعلق بھی برصغیر سے تھا اور یہ بیلمان کے رہنے والے تھے، ان سے عبیداللہ بن ربیع نجرانی نے روایت حدیث کی، ان کے مفصل حالات نہیں مل سکے۔

محمد بن حارث بیلمانی

محمد بن حارث دراصل بھیلمان کے رہنے والے تھے، انہوں نے اپنے والد حارث بیلمانی سے روایت حدیث کی اور پھر ان سے محمد بن حارث نے روایت کی۔

حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ صحیح بات یہ ہے کہ محمد بن حارث حارثی بھیلمانی نے محمد بن عبدالرحمٰن بیلمانی سے روایت کی۔

محمد بن حارث بیلمانی وہ تبع تابعی تھے، جو سندھ اور ہند سے تعلق رکھتے تھے۔ (تہذیب التہذیب، ج: ۹، ص ۱۰۴، ۲۹۳، ۲۹۴، برصغیر میں اسلام کے اولین نقوش: ۲۱۷)

امام حضرت ربیع بن صبیح بصری ہندی رحمۃ اللہ علیہ

حضرت امام حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ متوفی ۱۱۰ھ کے دو بصری شاگردوں کو ہندوستان سے خصوصی تعلق تھا اور ان کے واسطہ سے آپ کے فیوض وبرکات اس ملک میں پھیلے ہیں، ان میں سے ایک حضرت امام ابوحفص ربیع بن صبیح بصری ہندی محدث فقیہ ہیں اور دوسرے حضرت امام موسی اسرائیل بن موسی بصری ہندی محدث ہیں۔

اول الذکر ۱۶۰ھ میں ہندوستان کے علاقہ گجرات میں ایک جہاد میں آئے اور یہیں وفات پائی اور ثانی الذکر کئی بار ہندوستان آئے اور گئے۔

امام حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ کے دونوں تلامذہ کا ہندوستان سے خصوصی تعلق رکھنا اس خاص ذہن کی بنیاد پر تھا، جسے حضرت امام حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ نے ہندوستان کے بارے میں ان میں پیدا فرمایا تھا، اس سلسلہ میں امام حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ کے وطن بصرہ اور ان کی زندگی کے بعض حالات پر توجہ ضروری ہے، آپ کا آبائی وطن عراق کا ایک معمولی سا شہر میسان تھا جسے دست میسان بھی کہتے ہیں اور جو بصرہ کے نشیبی علاقہ میں واقع تھا۔

علامہ سمعانی رحمۃ اللہ علیہ نے میسان کے بارے میں لکھا ہے: "ھی بلیدۃ باسفل البصرۃ" میسان بصرہ کے نشیبی علاقہ میں ایک چھوٹا شہر ہے۔

آپ کے والد یسار وہیں سے گرفتار کر کے مدینہ منورہ لائے گئے اور آپ کی پیدائش عہد فاروقی میں مدینہ منورہ میں اور نشو ونما وادی القری میں ہوئی ؛مگر آپ نے بصرہ کو مستقل مسکن بنایا، بصرہ عراق کا وہی مقام ہے؛ جو پہلے ارض الہند کے نام سے مشہور تھا، یہاں کی قریبی بندرگاہ اُبُلّہ میں عمان، بحرین، فارس، ہندوستان اور چین کے تجارتی جہاز آ کر ٹھہرتے تھے۔

۱۴ھ میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت عتبہ بن غزوان رضی اللہ عنہ کو ایرانیوں سے مقابلہ کے لئے عراق کے اس علاقہ میں امیر لشکر بنا کر روانہ کیا تو فرمایا: اے عتبہ! میں نے تم کو ارض الہند کا امیر بنایا ہے، یہ مقام ہمارے دشمن ایرانیوں کی بہت بڑی جولانگاہ ہے۔ عتبہ نے یہاں پہنچ کر ایرانیوں سے مقابلہ کیا اور جب ابلہ جو بصرہ سے تھوڑے فاصلہ پر تھا؛ فتح ہوا تو عتبہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو لکھا کہ اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ اس نے ہمیں ابلہ پر فتح دی یہاں پر عمان، بحرین، فارس، ہندوستان اور چین سے بحری کشتیاں آ کر ٹھہرتی ہیں۔

پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے حکم سے عتبہ نے ابلہ کے پاس ہی بصرہ آباد کر کے ارض الہند کو تاریخ کے ایک نئے دور میں داخل کیا اور رقبۃ الاسلام بصرہ اور ہندوستان کے درمیان وہ دینی، علمی، فکری اور ثقافتی تعلق پیدا ہوا، جس کے مقابلہ میں دور جاہلیت کے تمام تجارتی اور معاشی تعلقات ہیچ ہو گئے اور ارض الہند کے آس پاس ابلہ اور میسان وغیرہ میں ہندوستان کی جو روایات بکھری ہوئی تھیں، وہ سب سمٹ سمٹا کر بصرہ میں آ گئیں۔

بصرہ کی مرکزیت اور ہندوستان سے اس کے قدیم و جدید تعلقات کی وجہ سے حضرت امام حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے دونوں تلامذہ ربیع بن صبیح بصری رحمۃ اللہ علیہ اور اسرائیل بن موسی بصری رحمۃ اللہ علیہ کو سرزمین ہند سے ایک خاص قسم کا علمی اور دینی ربط پیدا ہو گیا۔

نام و نسب: آپ کا نام ربیع، والد کا نام صبیح اور کنیت ابو حفص اور ابو بکر ہے، مگر ابو حفص زیادہ مشہور ہے، قبیلہ بنو سعد کے آزاد کردہ غلام ہیں، اس لئے سعدی کی نسبت سے متعارف ہیں، صبیح بروزن فعیل ہے۔ مولانا عبد الرحمٰن مبارک پوری رحمۃ اللہ علیہ تحفۃ الاحوذی میں لکھتے ہیں: وهو ابن صبيح بفتح الصاد المهملة السعدی البصری. ربیع کے والد صبیح میں

صاد پر فتحہ ہے، وہ بصری اور سعدی ہیں۔

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے تاریخ کبیر میں اور ابن سعد رحمۃ اللہ علیہ نے طبقات کبری میں ان کی کنیت ابو حفص بتائی ہے، امام ربیع کی ولاء کا تعلق جس قبیلۂ بنوسعد سے ہے، اسے امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے صرف بنی سعد لکھا ہے اور عام طور سے ان کو بنوسعد بن تمیم بتایا گیا ہے، مگر ابن سعد نے بنی سعد بن زید بن مناۃ بن تمیم لکھا ہے، آپ کا اصلی وطن بصرہ تھا، جس پر تمام تذکرہ نویس متفق ہیں۔

حصول تعلیم اور شیوخ

آپ نے دوسری صدی ہجری کے اوائل میں آنکھ کھولی، جس میں ہر اعتبار سے اسلام ترقی پزیر تھا، سندھ سے لے کر مغرب اقصی تک مجاہدین اسلام کے قافلے رواں دواں تھے، پورا عالم اسلام دینی علوم وفنون کے اساتذہ وتلامذہ سے معمور تھا، آپ کا وطن قبۃ الاسلام بصرہ اسلامی تہذیب وثقافت کا مرکز بنا ہوا تھا، اس ماحول کی برکتوں سے آپ پوری طرح فیض یاب ہوئے اور اس دور کے جلیل القدر علماء سے علم حاصل کیا اور اس زمانہ کی سب سے بڑی اور پر عظمت شخصیت امام حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ کے اسوہ کو اپنی زندگی کا نصب العین بنایا، آپ کے شیوخ واساتذہ میں علم دین کے یہ ائمہ واساطین شامل ہیں۔

امام حسن بصری، عطاء بن ابی رباح مکی، یزید رقاشی، قیس بن سعد، حمید الطّویل، ابو الزبیر، ابو غالب صاحب امامہ، ثابت بنانی، مجاہد بن جبر وغیرہم رحمہم اللہ تعالیٰ۔ امیر ابن ماکولا نے آپ کے شیوخ میں حازم کرمانیؒ اور حبان الصائغ رحمۃ اللہ علیہ کو بھی شمار کیا ہے، یہ تمام اساتذہ وشیوخ اپنی اپنی ذات سے علم دین کی ایک ایک انجمن تھے، جن کے فیوض وبرکات سے پورا عالم اسلام متمتع ہو رہا تھا، اس فہرست میں اس دور کے ہر علم وفن کے ائمہ موجود ہیں،

محدث،فقیہ،جرح وتعدیل کے امام،عباد وزہاد اور غازی ومجاہد سب ہی امام ربیعؒ کے اساتذہ میں شامل ہیں،اس سے آپؒ کی جامعیت اور فضل وکمال کا بخوبی اندازہ ہوجاتا ہے۔

تلامذہ اور اصحاب:اسی طرح آپؒ کے تلامذہ واصحاب میں اس دور کے ہر طبقۂ علم وفن کے ارباب کمال پائے جاتے ہیں،جن میں سرفہرست حضرت امام محمد بن حسن شیبانی صاحبؒ امام ابوحنیفہؒ کا نام نامی ملتا ہے،آپ نے براہ راست امام ربیع سے احادیث کی روایت کی ہے،چنانچہ کتاب الحجة علی اهل المدينة میں مختلف مقامات پر امام محمد نے اخبرنا الربیع بن صبیح البصری کہہ کران سے یزید رقاشی اور حسن بصری کی مرویات نقل فرمائی ہیں،ان کے علاوہ امام ربیع کے حلقۂ تلامذہ میں یہ ائمۂ دین پائے جاتے ہیں:سفیان ثوریؒ،عبدالرحمٰن بن مہدی،عبداللہ بن مبارکؒ،وکیع بن جراح،ابوالولید طیالسیؒ،آدم بن ابو ایاسؒ،علی بن عاصمؒ،سلیمان وارائیؒ،محمد بن قاسم اسدیؒ،علی بن جعدؒ،سعید بن عامرؒ اور روحؒ وغیرہم رحمہم اللہ،آپ کے ان شاگردوں میں بھی ائمۂ حدیث وفقہ،جرح وتعدیل اور مجاہد وغازی موجود ہیں۔

علمی اوصاف وکمالات اور ثقاہت

امام ربیع بن صبیح فقہائے محدثین میں شمار کئے جاتے ہیں،بلاذری نے فتوح البلدان میں ایک موقع پر آپ کا ذکر کرتے ہوئے آپ کے نام کے ساتھ الفقیہ کا لقب استعمال کیا ہے،آپ کے فضائل ومناقب کے لئے یہی کافی ہے کہ آپ تبع تابعین کے زمرے میں نمایاں شخصیت رکھتے ہیں۔

ابن شاہین نے کتاب اسماء الثقات میں آپ کا تذکرہ کیا ہے اور علماء جرح وتعدیل

کے اقوال سے ثقاہت ثابت کی ہے۔

الربیع بن صبیح ؛ قال یحیی: ثقة ، وقال مرة اخری: ضعیف ، وقال: فیه لا بأس به ؛ رجل صالح . ربیع بن صبیح کے بارے میں یحیی نے ایک موقع پر ثقہ اور دوسرے موقع پر ضعیف کہا ہے اور ساتھ ہی کہا ہے کہ ان سے حدیث کی روایت میں کوئی حرج نہیں ہے، وہ صالح آدمی تھے۔

امام جرح وتعدیل عبدالرحمٰن بن مہدی آپ کے شاگردوں میں ہے اور بلاتردد آپ سے روایت کرتے ہیں، چنانچہ ابوحفص عمرو بن علی کا بیان ہے: کان عبد الرحمن بن مهدی یحدث عن الربیع بن صبیح. عبدالرحمٰن بن مہدی ربیع بن صبیح سے حدیث کی روایت کیا کرتے تھے۔

امام احمد بن حنبلؒ کا قول ہے: لابأس به ؛ رجل صالح. ان سے روایت کرنے میں مضائقہ نہیں، وہ صالح آدمی تھے۔ ابوالولید طیالسی کا قول ہے: ماتکلم احد فیه الا والربیع فوقه. جو شخص بھی ربیع کی ذات میں کلام کرتا ہے، ربیع اس سے بلند ہے۔ عثمان دارمی کا بیان ہے کہ میں نے یحیی بن معین سے ربیع بن صبیح کے بارے میں دریافت کیا تو انہوں نے فرمایا: لیس به بأس. ان سے روایت کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں۔

حضرت امام ربیع بن صبیح کی ثقاہت وعدالت اور جلالت شان پر ائمۂ دین کی یہ شہادتیں شاہد عدل ہیں، یہی وجہ ہے کہ ان سے احادیث کے اعاظم رجال نے روایت کی، مگر بعد میں زہد وتقوی، عبادت وریاضت اور جہاد ومرابطت میں ان کی محدثانہ وفقیہانہ حیثیت بعض ائمۂ جرح وتعدیل اور محدثین کے نزدیک اس معیار پر نہ رہی جو ان کے اصول روایت ودرایت کے لئے مقرر ہے اور بہت سے ائمۂ حدیث کو ان سے روایت کرنے میں کلام کی

گنجائش نکل آئی، انہوں نے امام ربیع کی ذات وصفات کا احترام کرتے ہوئے ان کے بارے میں جرح کے الفاظ بھی استعمال کئے اور حدیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی حفاظت وصیانت میں ان کے زہدو اتقاء کی نرمی کو غیر معیاری قرار دیا۔

حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: کان ربیع بن صبیح رجلا غزّاءً ، واذا مدح الرجل بغیر صناعته فقد وهص یعنی دقّ. ربیع بن صبیح کثیر الغزوہ آدمی تھے اور جب کسی شخص کی تعریف اس کی حدیث دانی کے بغیر کرتے ہیں تو اسے تعریف وتوصیف کر کے ختم کر دیتے ہیں۔

ابن ابی شیبہ نے ابن المدینی کا قول نقل کیا ہے: ھو عندنا صالح ، ولیس بقوی، ربیع بن صبیح ہمارے نزدیک صالح ہونے کے باوجود حدیث کے معاملہ میں قوی نہیں ہے۔

ابن سعد نے طبقات میں لکھا ہے: وکان ضعیفا فی الحدیث ، وقد روی عنه الثوری واما عفان فترکه فلم یحدث منه. ربیع بن صبیح حدیث میں ضعیف تھے، ان سے سفیان ثوری نے روایت کی، مگر عفان نے ان سے احادیث کی روایت نہیں کی۔

ان تمام اقوال سے معلوم ہوتا ہے کہ ائمۂ جرح وتعدیل امام ربیع بن صبیح کے زہد وتقوی، عبادت وریاضت، صداقت وامانت اور صالحیت ونیکی پر متفق ہیں اور اس بارے میں ان کی دورائیں نہیں ہے، مگر زہد وعبادت کے غلبہ کی وجہ سے ان میں سچائی، نیکی، نیک نیتی اور اخلاص کا اس قدر ذوق پیدا ہو گیا کہ اس دور میں احادیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی روایت کے اصول پر وہ پورے نہ اتر سکے اور علم حدیث سے زیادہ وہ زہد وعبادت اور جہاد ومرابطت کے آدمی بن گئے۔

ان کے ضعیف ہونے کی دوسری وجہ ان کا وہم ہے، جیسا کہ ساجی اور ابن حبان کا قول

ہے اور بقول ابن حبان وہ وہم میں پڑ کر منکر حدیثوں کی روایت کر دیتے ہیں؛ مگر ان کو پتہ نہیں چلتا، اس لئے جن احادیث کے تنہا وہی راوی ہے اور دوسرے طرق سے وہ مروی نہیں ہے، ان سے استناد واحتجاج نہیں کرنا چاہئے، یہ وہم بھی دورِ زہد کا معلوم ہوتا ہے جب کہ وہ عبادان میں مرابطت کر کے رات دن عبادت اور جہاد میں مصروف رہتے تھے۔

تیسری وجہ یہ ہے کہ ان کی احادیث میں قلب ہوتا تھا اور ان کی روایات اور احادیث مقلوب ہوتی تھیں جیسا کہ عفان نے کہا ہے، یعنی ان کی احادیث میں ایک دوسرے کے رواۃ اور متون خلط ملط ہو جاتے تھے، یہ بھی وہم کا ہی نتیجہ ہوسکتا ہے۔

امام ربیع بن صبیح بصری رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں ان تمام اقوال اور جرح وتعدیل کے الفاظ میں حزم واحتیاط اور ادب واحترام کی جو روح پائی جاتی ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے بارے میں ضعف، وہم، قلب وغیرہ کے بیانات ان کی صالحیت وصداقت اور ثقاہت وعدالت تسلیم کرنے کے بعد ہیں اور ان کا تعلق آپ کے خاص اوقات اور خاص حالات سے ہے، ان سے ہٹ کر وہ ثقہ، صدوق اور صالح محدث وفقیہ ہیں۔

بہادری، جہاد اور اسلامی حمیت

دوسرے دینی اور علمی اوصاف وکمالات کے ساتھ ساتھ آپ بہادری، جہاد، مرابطت اور اسلامی حمیت میں بھی جوہر فرد تھے، امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے: كان الربيع بن صبيح رجلا غزاءً. ربیع ابن صبیح بہت بڑے غازی ومجاہد تھے۔ ابن شاہین نے تاریخ اسماء الثقات میں امام شعبہ کا یہ قول نقل کیا ہے: لقد بلغ ربيع بن صبيح في عصرنا هذا ما لم يبلغه الأحنف بن قيس. ربیع بن صبیح بہادری اور جوانمردی میں ہمارے زمانہ میں اس مقام پر پہنچ گئے جہاں احنف بن قیس بھی نہ پہنچ سکے۔

آپ نے بصرہ کے قریب عبادان کو اپنی مجاہدانہ اور بہادرانہ سرگرمیوں کا مرکز بنایا،

بصرہ کے لوگوں سے رقم وصول کر کے عبادان میں قلعہ بندی اور رضا کار فوج تیار کی اور ان متطوعین وفدائین کو لے کر اسلامی سرحدوں کی حفاظت ومرابطت کی۔ بلاذری کا بیان ہے: جمع مالا من اهل البصرة فحصن به عبادان و رابط فيها. ربیع نے اہل بصرہ سے مال جمع کر کے عبادان کی قلعہ بندی کی اور اسی میں مرابطت کا نظام قائم کیا۔

مرابطت اور رباط اسلامی حربی سیاست میں بہت ہی اہم شعبہ ہے، اس کے ذریعہ اسلامی سرحدوں کی حفاظت کی جاتی ہے اور دشمن سے باخبر رہا جاتا ہے، ساتھ ہی اندرونی بدامنی کو فرو کیا جاتا ہے، جہاد کی طرح رباط کے بھی بڑے بڑے فضائل ہیں۔

حضرت امام ربیع کی غزوۂ باربد (بھاڑ بھوت، گجرات) میں شرکت

جن دنوں امام ربیع بن صبیح رحمۃ اللہ علیہ عبادان کی قلعہ بندی کر کے متطوعین اور فدائیوں میں اسلامی حمیت کی روح پھونک رہے تھے، ان ہی دنوں بعہد خلیفہ ابوجعفر منصور مجاہدین اسلام سندھ سے گزر کر ہندوستان میں فتوحات حاصل کر رہے تھے، بلاذری نے لکھا ہے کہ امیر المؤمنین منصور نے سندھ پر ہشام بن عمرو ثقفی رحمۃ اللہ علیہ کو مقرر کیا تو انہوں نے ناقابل تسخیر مقامات کو فتح کر کے عمرو بن جمل کو جنگی کشتیوں کے ساتھ باربد کی طرف روانہ کیا، اس کے بعد جب خلیفہ مہدی کا زمانہ آیا تو اس نے بذات خود غزوۂ باربد میں دل چسپی لی اور عبدالملک بن شہاب مسمعی کی سرگرمی میں فوج روانہ کی، اسی دوسری مہم میں حضرت ربیع بن صبیح بھی شریک ہوئے اور مظفر ومنصور ہو کر واپسی پر باربد میں فوت ہوئے۔

غزوۂ باربد اور اسی میں حضرت ربیع بن صبیح رحمۃ اللہ علیہ کا تذکرہ ابن سعد، بلاذری، طبری، ابن اثیر اور ابن خلدون وغیرہ نے معمولی فرق کے ساتھ کیا ہے، ہم یہاں تاریخ طبری سے اس غزوہ کی تفصیل پیش کرتے ہیں، امام طبری نے ۱۵۹ھ کے واقعات وحوادث میں لکھا

ہے کہ اس سال خلیفہ مہدی نے عبدالملک بن شہاب مسمعی کو براہ سمندر بلاد ہند روانہ کیا اوران کے ہمراہ مندرجۂ ذیل فوجوں اور رضا کاروں کو بھیجا۔

۲۰۰۰ (دو ہزار) بصرہ کی مختلف سرکاری فوج سے۔

۱۵۰۰ (پندرہ سو) عام متطوعین ومرابطین سے جو اپنے طور پر حسبۃً للہ شریک ہوئے۔

۷۰۰ (سات سو) اہل شام سے، ان کے امیر وقائد یزید بن حباب مذحجی شامی تھے۔

۱۰۰۰ (ایک ہزار) بصرہ کے متطوعین ومرابطین سے، جو اپنے خرچ سے نکلے تھے، اسی فوج میں حضرت ربیع بن صبیح بصریؒ بھی تھے۔

۴۰۰۰ر (چار ہزار) اساورہ اور سیابچہ سے، (ان میں اکثریت ہندوستانی نسل والوں کی تھی) یہ کل نو ہزار دو سو افراد پر مشتمل فوج تھی، جس کے امیر عبدالملک بن شہاب مسمعی تھے، خلیفہ مہدی کو اس مہم سے بہت زیادہ دل چسپی تھی، اس نے اس کے انتظامات کے لئے ابوالقاسم محرز بن ابراہیم کو خاص طور سے مقرر کیا، چنانچہ پورے انتظام واہتمام کے ساتھ یہ فوج روانہ ہوئی اور ۱۶۰ھ میں بلاد ہند کے مقام باربد میں پہنچ گئی۔

اس کے بعد امام طبری رحمۃ اللہ علیہ نے ۱۶۰ھ کے واقعات میں اس غزوہ کی تفصیل یوں لکھی ہے کہ اس سال عبدالملک بن شہاب مسمعی کو فوج لے کر شہر باربد پہونچے اور دو دن کے بعد جنگ شروع کردی، اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو زبردست فتح دی، اسلامی فوج کے سوار بستی میں ہر طرف پھیل گئے اور دشمن اپنے بت خانہ میں پناہ لینے پر مجبور ہوگئے، آخر ان کو شکست ہوئی اور ان کے تمام آدمی کام آئے، مسلمانوں میں سے بیس سے کچھ زائد آدمی شہید ہوئے، اس طرح اللہ تعالیٰ نے یہ شہر مسلمانوں کے قبضہ میں دے دیا، مگر جنگ کے بعد سمندر میں طغیانی آگئی، اس لئے اسلامی فوج فوراً واپس نہ ہوسکی اور موسم کے خوش گوار ہونے اور مد وجزر ختم ہونے تک ٹھہر گئی، اسی زمانہ قیام میں مجاہدوں میں ایک وبائی بیماری پھیل گئی،

جسے ''حمام قر'' کہا جاتا ہے، یہ منہ میں پھوڑے پھنسی کی طرح پیدا ہوتی تھی، اس بیماری میں ایک ہزار آدمی کے قریب مر گئے، ان ہی مرنے والوں میں ربیع بن صبیحؒ بھی ہیں، جب حالات سازگار ہوئے تو مسلمانوں کی فوج وہاں سے روانہ ہوئی۔

امام ربیع رحمۃ اللہ علیہ کی جائے وفات اور مدفن

غزوۂ باربد (بھاڑ بھوت) کی تفصیل سے یہ بات بالکل واضح ہے کہ یہ غزوہ صوبۂ گجرات کے ایک شہر باربد میں ہوا، جو اس زمانہ میں ایک راجہ کی راجدھانی تھا اور امام ربیع بن صبیح مع دوسرے ایک ہزار مجاہدین اسلام کے اسی جگہ یا اس کے قریب کہیں وبائی مرض میں انتقال کر گئے اور جائے انتقال ہی پر ان کی تجہیز و تکفین ہوئی۔ ان حضرات کے ہندوستان میں باربد یا اس کے آس پاس انتقال کرنے کے شواہد موجود ہیں؛ طبری نے لکھا ہے: وفیھا وجه المھدی عبد الملك بن شھاب المسمعی فی البحری الی بلاد الھند. ۱۵۹ھ میں مہدی نے عبدالملک بن شہاب مسمعی کو بحری راہ سے بلاد ہند کی طرف روانہ کیا۔

پھر آگے چل کر لکھا ہے: فمضوا لوجھھم حتی اتوا باربد من بلاد الھند. یہ لوگ سیدھے ہند کے شہر باربد میں پہنچ گئے۔

ابن اثیر نے الکامل میں لکھا ہے کہ مہدی نے ۱۵۹ھ میں بحری راہ سے ایک فوجی مہم جس کے امیر عبدالملک ابن شہاب مسمعی تھے، بلاد ہند کو روانہ کی، اس میں بہت سے فوجی اور رضا کار شامل تھے، ان میں ربیع بن صبیحؒ بھی تھے اور یہ لوگ باربد آئے۔

امام ذہبی نے العِبَر فی خبر مَن خَبَر میں لکھا: ۱۶۰ھ میں مسلمانوں نے عبدالملک مسمعی کی زیر قیادت ہندوستان کا ایک بہت بڑا شہر فتح کیا۔

اسی طرح دوسرے مؤرخوں نے ہندوستان کے غزوۂ باربد کا حال لکھا ہے اور امام ربیع

بن صبیحؒ کی وفات اسی سلسلہ میں بتائی ہے، مگران کے مدفن کی تعیین تاریخی دلائل وشواہد کی روشنی میں نہیں ہوسکتی کہ کس مقام میں ان کی وفات ہوئی اور کس جگہ وہ دفن کئے گئے۔ علامہ ابن سعد نے طبقات میں لکھا ہے: خرج غازیا الی الھند ودفن فی جزیرۃ من الجزائر ۱۶۰ھ فی اول خلافۃ المھدی اخبرنی بذلك شیخ من اھل البصرۃ کان معه. ربیع غزوہ کے لئے ہندوستان گئے اور ۱۶۰ھ میں مہدی کے ابتدائی دور خلافت میں اسی اثنا میں فوت ہوگئے اور اس کے جزیروں میں سے ایک جزیرہ میں دفن کئے گئے، اس کی خبر مجھے بصرہ کے ایک شیخ نے دی ہے، جو ان کے ساتھ تھے۔

ان تمام مؤرخوں اور تذکرہ نویسوں کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ امام ربیع کی جائے وفات اور مدفن خود باربد یا اس کے اور سمندر کے درمیان کوئی جزیرہ اور ٹاپو ہے، گجرات کے مسلمانوں میں اب تک عام طور سے مشہور ہے کہ بھاڑ بھوت ضلع بھروچ اور راندیر ضلع سورت میں کسی تابعی کا مزار ہے، بلکہ راندیر میں ایک خاص مزار کو تابعی کی طرف منسوب کیا جاتا ہے، مگر یہ محقق نہیں ہے، ظاہر ہے کہ ان دونوں جگہوں میں سے کسی میں یا آس پاس حضرت ربیع بن صبیح رحمۃ اللہ علیہ اور دوسرے ہزاروں مجاہدین اسلام آسودۂ خواب ہیں، غالب گمان ہے کہ یہ مقدس خطہ بھاڑ بھوت یا اس کے قریب کہیں ہوگا۔

امام ربیع کی اولاد واحفاد

آپ کی اولاد عبادان اور دوسرے مقامات پر پھلی پھولی اور ان کی نسل سے علماء وصلحاء پیدا ہوئے، مگران کے بارے میں زیادہ معلومات نہ ہوسکی۔

مرویات: اب تبرک کے طور پر امام ربیع بن صبیح بصری رحمۃ اللہ علیہ کی بعض مرویات واحادیث نقل کی جاتی ہیں، سنن ترمذی میں ابواب تفسیر القرآن عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

میں تفسیر سورۂ آل عمران کے سلسلہ میں ایک روایت ہے۔اس روایت کو امام احمد نے اپنی مسند میں اور ابن ماجہ نے اپنی سنن میں بھی بیان کیا ہے، البتہ ان دونوں کی روایت کے الفاظ میں کچھ کچھ فرق ہے۔امام ربیع کے تلمیذ رشید امام محمد شیبانی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی آپ کی احادیث ومرویات کو اپنی کتابوں میں درج فرمایا ہے۔

اس طرح دو صدیوں تک صحابہ اور خیر القرون کے لوگوں کی گجرات آمد سے گجرات وعرب کے مابین ایک علمی تعلق پیدا ہوگیا اور مختلف ادوار میں جانبین سے علماء کی آمد ورفت ہوتی رہی اور لوگ ان سے فیض یاب ہوتے رہے، خصوصاً ۹/اور ۱۰/ویں صدی، جس میں علماء اور خصوصا محدثین کی آمد ورفت زیادہ رہی اور گجرات کی شہرت بلاد عرب میں بھی عام ہوگئی، یہاں ان ہی لوگوں کا تذکرہ کیا جاتا ہے جو بلاد عرب سے یہاں تشریف لائے اور تاحین حیات یا ایک مدت مخلوق کی دینی وعلمی خدمت میں مشغول رہے اور گجرات سے جو علماء بلاد عرب تشریف لے گئے اور حصول علم کیا۔

اب ذیل میں ان علماء وشیوخ کا تذکرہ کیا جاتا ہے، جو عرب سے یہاں آئے اور اس کے برعکس یہاں سے عرب تشریف لے گئے، ان میں سے ایک شیخ احمد عرفاتی ہیں۔

شیخ احمد عرفاتی عباسی

شیخ احمد نام، عرفاتی لقب، طائف آپ کا وطن تھا، عرصہ تک مکہ مکرمہ میں قیام رہا، جبل عرفات پر عبادت الٰہی میں مشغول رہے، اس لئے لوگ آپ کو عرفاتی کہنے لگے، مکہ مکرمہ سے پٹن سدھ راج جے سنگھ کے عہد ۵۶۱ھ میں تشریف لائے، آپ بلند مرتبہ صوفی تھے، مذہب

شافعی رکھتے تھے، سلسلۂ نسب آپ کا صادق بن عباس تک پہنچتا تھا، ۶۴۵ھ میں آپ کی وفات ہوئی۔(تاریخ اولیاء گجرات:۱۱۹)

مخدوم شیخ احمد کھٹو

حضرت شیخ احمد نے جن کو گنج بخش بھی کہتے ہیں، نعمت ارادت واجازت اپنے مرشد بابو اسحاق سے پائی، جو قصبہ کھٹو میں آرام فرما ہیں۔

آپ کا سلسلہ بیعت معربیہ ہے، جب آپ حج کے لئے تشریف لے چلے تو پٹن پہنچے، ملک فتح الملک سے ملاقات کی، جو راستی خاں فرحۃ الملک ناظم گجرات کا باپ تھا، غرض آپ بندر کھنبایت سے حج کے لئے تشریف لے گئے اور واپسی میں سندھ کے مشہور بندر ٹھٹھ میں اترے اور وہاں سے بخارا روانہ ہوگئے، جس کی تفصیل رسالہ ''کبر'' مصنف شیخ ابوالقاسم امام مسجد میں مذکور ہے، ۸۰۲ھ میں بہ عہد مظفر خاں جو ابھی خود مختار نہیں ہوا تھا گجرات تشریف لائے اور شہر سے مغربی جانب تین کوس پر موضع سرخس (سرکھیج) میں ''بڈا'' نامی ایک بہرہ کے یہاں مقیم ہوئے۔

اور بموجب درخواست سلطان احمد شہر کی بنیاد رکھتے وقت رسی کا سرا آپ کے ہاتھ میں تھا، آپ کی کرامات بے شمار ہیں اور عوام وخواص میں بہت مشہور ہیں اور ان میں سے اکثر ملفوظات میں موجود ہیں، ۱۴رشوال جمعرات کے دن قبل زوال ۸۴۹ھ میں آپ کا وصال ہوا۔

آپ نے تمام عمر تجرد کے ساتھ گذاری، شادی نہیں کی، صلاح الدین لڑکے کو متبنی کر لیا تھا، آپ کا مزار موضع سرخس میں موجود ہے، سلطان محمد شاہ نے ایک گنبد، خانقاہ، مسجد اور

تالاب کی بنیاد رکھی اور اس کے لڑکے سلطان قطب الدین نے ان عمارتوں کی تکمیل کی، آپ کا مزار زیارت گاہ عوام وخواص ہے۔(تاریخ اولیاء گجرات:۴۹-۵۰)

حضرت قطب عالم

برہان الدین لقب، ابومحمد کنیت، نام عبداللہ اور مشہور بہ قطب عالم بن ناصر الدین محمود بن مخدوم جہانیاں جہاں گشت رحمۃ اللہ علیہ، آپ کا خاندان بخاری ہے اور سلسلۂ نسب سید جعفر مثنی برادر حضرت امام عسکری تک منتہیٰ ہوتا ہے، ۱۴/رجب شب دوشنبہ قریب صبح ۷۹۰ھ میں آپ کی ولادت ہوئی، دس سال کی عمر میں آپ کے سر سے سایۂ پدری اٹھ گیا، آپ کے حقیقی چچا سید راجو قتال نے آپ کی پرورش اور تربیت کی، دوسال خاص طور پر رشد وہدایت کی تعلیم دی اور پھر فرمایا کہ اہل گجرات کی ہدایت آپ کے ذمہ کی گئی ہے، لہذا وہاں جاکر ہدایت کیجئے، غلاف، بالش، تلوار کے ساتھ دوسرے تبرکات جو آپ کی ولادت سے پہلے آپ کے نام منسوب تھے اور آپ کی نسبت خبر دی گئی تھی وہ سب آپ کے حوالہ کیا، آپ اپنے بزرگوں سے رخصت ہوکر اپنی والدہ بی بی ہاجرہ سعادت خاتون کے ساتھ پٹن پہنچے اور حسب ارشاد سید راجو قتال، بہ مشورہ حضرت شیخ رکن الدین نبیرہ حضرت شیخ فریدالدین گنج شکر، جو ان دنوں پٹن میں مقیم تھے، امور ظاہری وباطنی میں مشغول ہوگئے، لوگوں کا بیان ہے کہ چوں کہ سلطان مظفر شاہ جہانیاں جہاں گشت حضرت مخدوم کا مرید تھا، اس لئے اس خبر کے ملتے ہی کہ آپ کے پوتے پٹن تشریف لارہے ہیں، فوراً استقبال کے لئے حاضر ہوا اور کمال احترام کے ساتھ پٹن میں لایا، آپ نے ظاہری علوم کی تعلیم مولانا شیر علی صاحب سے حاصل کی، جب احمد آباد آباد ہوا تو سلطان احمد کی استدعا پر آپ احمد آباد تشریف لے آئے۔

ابتداء میں آپ کی سکونت سابرمتی کے کنارے قدیم اساول میں رہی، وہاں ایک مسجد بھی تعمیر کی، چنانچہ ابھی تک مکانوں کے قدیم آثار موجود ہیں۔

کچھ دنوں کے بعد آپ بٹوہ میں مقیم ہوگئے اور سلطان نے اس موضع کی آمدنی آپ کے اخراجات کے لئے مقرر کردی۔

۶۸/سال کی عمر میں چار ماہ چوبیس دن ۸۵۸ھ ذوالحجۃ الحرام وقت طلوع صبح عالم جاودانی کورحلت فرمایا ''مطلع یوم الترویۃ'' سے ایک شخص نے آپ کی تاریخ وفات نکالی ہے۔

بٹوہ میں آپ کی قبر پر ایک عالیشان گنبد، بارگاہ اور پتھر کی مسجد موجود ہے اور آج تک لوگ فاتحہ خوانی کے لئے جاتے ہیں، موضع بٹوہ، موضع پالڑی سینھ ری کی آمدنی عرس اور صاحب سجادہ اور فرزندان کے اخراجات کے لئے مقرر ہوئی اور موضع کمود سادات قطبیہ کے لئے دیا گیا اور بموجب فرمان سلاطین سابقہ ابھی تک یہ لوگ اس پر قابض ہیں۔(تاریخ اولیاء گجرات:۴۲-۴۴)

قاضی اسماعیل اصبہانی

قاضی اسماعیل بن عبداللہ اصبہانی گجراتی، فقہ واصول فقہ میں ماہر تھے، بچپن ہی میں اپنے والد کے ہمراہ گجرات تشریف لائے اور والد محترم اور دیگر کبار علماء گجرات سے علم حاصل کیا۔

اس کے بعد بھروچ میں منصب قضاء پر فائز ہوئے، ایک مدت تک یہاں خدمت انجام دہی کے بعد احمد آباد میں منصب قضاء سنبھالا، یہ وقت سلطان محمود ثانی کی حکمرانی کا تھا اور مدت حیات تک اس منصب پر فائز رہے۔

آپ نیک، صالح اور عفیف ومتقی تھے، آپ نے راہ سلوک وتصوف شیخ محمد بن عبداللہ

حسینی گجراتی کے ہاتھوں طے کیا، اور ۲۶؍ربیع الاول ۸۶۵ھ میں آپ جاں بحق ہو گئے۔
(نزہۃ الخواطر: ۳/۲۳)

شریف ابوبکر عیدروس حضرموتی

آپ شیخ عیدروس کے جد کلاں ہیں، جن کی قبر احمد آباد شہر کے جوہری واڑ میں موجود ہے، ۶؍شعبان المعظم ۸۹۲ھ میں آپ کا وصال ہوا اور قرۃ عین نبی سے سال وفات معلوم ہوتا ہے اور آپ کی عمر ''جلوہ'' کے لفظ سے معلوم ہوتی ہے، جس کے عدد ۴۴؍ ہوتے ہیں، بٹوہ میں آپ کی قبر مشہور ہے، فاتحہ خوانی کے لئے لوگ آتے رہتے ہیں، اسی کے ساتھ آپ کے لڑکے سید عرب شاہ کی قبر ہے، جن کا عرس ۱۰؍ربیع الاول کو ہوتا ہے۔ (تاریخ اولیاء گجرات: ۶۱-۶۲)

شیخ غوث الدین گجراتی

یہ بلند پایہ عالم وفقیہ تھے، بغداد سے سلطان محمود ثانی کے دور میں گجرات آئے اور احمد آباد کو اپنا مسکن بنایا اور ایک بڑے مدرسہ کی بنیاد ڈالی اور اسی میں خدمت خلق ودین میں مشغول ہو گئے، ایک طویل زمانہ تک درس وتدریس میں مشغول رہنے کے بعد حرمین شریفین کا قصد کیا اور حج وزیارت سے فراغت کے بعد پھر گجرات واپس لوٹے۔

آپ بلند پایہ عالم، محدث اور فقیہ تھے، درس وافادہ ہی مشغلہ تھا، آپ کے تلامذہ میں شیخ یعقوب بن خوندمیر گجراتی کا نام ملتا ہے، ان کے علاوہ اور بھی لوگوں نے آپ سے کسب فیض کیا ہے۔ آپ کی وفات ۲۲؍صفر المظفر ۸۹۵ھ میں ہوئی۔ (نزہۃ الخواطر: ۳/۸۴)

شیخ احمد بن بدر الدین

شیخ عالم محدث احمد بن بدر الدین لقب، شہاب الدین، علم وفضل میں نامور، صلاح

وتقوی میں مشہور تھے، شیخ عبدالقادر نے آپ کا تذکرہ ''النورالسافر'' میں اس طرح کیا ہے:
آپ کا سال ولادت ۹۰۳ھ اور مولد مصر ہے، اور وہیں کے اساتذہ سے تحصیل علم کیا، منجملہ ان اساتذہ کے شیخ الاسلام زین الدین زکریا انصاری، شیخ علامہ برہان الدین بن ابوشریف، شیخ کمال الدین، شیخ زین الدین الغزی، شیخ نورالدین ملتجی ہیں۔

شیخ الاسلام ابوالعباس طبنداوی بکری سے زبید میں ۹۳۶ھ میں ملاقات ہوئی اور ان سے استفادہ کیا۔

آپ تقوی میں فائق تھے اور قلیل الاختلاط تھے، شب جمعہ ۴/رمضان المبارک ۹۹۲ھ کو احمد آباد میں داعی اجل کو لبیک کہا اور وہیں آسودۂ لحد ہوئے۔

النورالسافر میں آپ کے متعلق لکھا ہے کہ شیخ شہاب الدین احمد بن شیخ بدرالدین عباسی مصری شافعی، آپ کی ولادت مصر میں ہوئی، تاریخ وفات ۹۰۳ھ ہے، آپ نے ۹۹۲ھ /۱۵۸۴ء ۴/صفر شب جمعہ میں احمد آباد میں وفات پائی، انتقال کے وقت آپ کی عمر نوے سال تھی اور عرب کے قبرستان میں احمد آباد میں آپ کو دفن کیا گیا، جہاں آپ کے قریب آپ کے شاگرد اور آپ کے ساتھی شیخ محمد بن عبدالرحیم عودی کی بھی قبر بنائی گئی ہے۔(مشائخ احمد آباد:۲۱۵-۲۱۶)

عرب و گجرات کے درمیان علمی روابط تو بہت پرانے ہیں، جیسا کہ ابتداء میں معلوم ہو چکا اور کئی ایک حضرات عرب سے گجرات تشریف لائے جن سے لوگ فیضیاب ہوئے؛ لیکن گجرات سے عرب تحصیل علم اور افادہ واستفادہ کی غرض سے جانے کی ابتداء کب ہوئی؟ وہ کون ہے جو پہلے مذکور غرض سے عرب تشریف لے گئے؟ اس کا علم نہ ہوسکا، ہاں! بہت سے افراد یہاں سے عرب تشریف لے گئے، اس کے بعد کچھ حضرات وہیں افادہ

واستفادہ کے لئے مقیم رہے اور بعض حضرات وطن میں تشریف لائے اور علوم دینیہ سے تشنہ لوگوں کو سیراب کیا، اس طرح گجرات سے عرب جانے والوں میں ایک راجح بن داود گجراتی ہیں۔

راجح بن داود گجراتی

ولادت اور نام ونسب: آپ کی ولادت ۹/صفر المظفر ۸۷۱ھ میں احمد آباد میں ہوئی، آپ کا نام ونسب یہ ہے، راجح بن داود بن محمد بن عیسی بن احمد گجراتی، مسلکاً آپ حنفی ہیں۔

حصول علم اور اساتذہ: اپنے ہی شہر میں علی محمود بن محمد مقری حنفی سے نحو، صرف، منطق وغیرہ علوم پڑھے، علی مخدوم بن برہان الدین سے معانی اور بیان پڑھا اور علی محمد بن تاج حنفی سے ہیئت وکلام پڑھا اور علوم وفنون میں ممتاز وماہر ہو گئے، جودۃ فہم کا حال یہ تھا کہ اشعار میں بھی ان کو ملکہ حاصل تھا۔

حصول علم کے لئے مکہ میں: یہاں سے پھر عرب پہنچے اور مکہ مکرمہ میں علامہ سخاوی سے ملے، علامہ سخاوی فرماتے ہیں: وہ مجھے ۸۹۴ھ میں مکہ مکرمہ میں ملے، ان کے ساتھ ان کے بھائی قاسم اور ان کے چچا بھی حج کے لئے آئے ہوئے تھے، حج کے بعد بغرض زیارت مدینہ منورہ تشریف لے گئے، جب مدینہ سے واپسی ہوئی تو شرح الفیۃ الحدیث پڑھی اور میں نے انہیں اجازت بھی لکھ دی۔

انہوں نے بدر دمامینی کے حالات دریافت کئے، جن کی وفات ہند میں ہوئی تھی تو وہ بھی میں نے بتائے، نیز میں نے علاء بخاری حنفی کے حالات سے بھی انہیں واقف کیا، جو ابن عربی اور ان کے معتقدین کے بارے میں کفر کا مسلک اور رائے رکھتے ہیں، تا کہ وہ ہندوستان میں لوگوں کو صحیح حال سے باخبر کریں خاص کر وہ حضرات جو ان سے معتقد ہیں اور

ان کی تصانیف کا مطالعہ کرتے ہیں۔

وفات: ۹۰۴ھ میں احمد آباد میں واصل بحق ہوئے، مگر افسوس کہ اب کوئی یہ بھی نہیں جانتا ہے کہ ان کی قبر کہاں ہے؟ (یادایام: ص: ۹۵، نزھۃ الخواطر: ۴/ ۹۷، ۹۸)

آپ کی مکہ مکرمہ سے گجرات آمد کب ہوئی؟ نیز آپ نے گجرات میں کتنے سال اور کہاں فیض پہنچایا اور آپ سے فیض حاصل کرنے والے کون ہیں؟ یہ تمام گوشے ایسے ہیں جس پر مؤرخین اور سوانح نگار خاموش ہیں، ان کے حالات کے اس حصہ کی معلومات دست یاب نہ ہوسکی۔

ابوالقاسم بن احمد مکی

نام ونسب اور ولادت: ابوالقاسم بن احمد بن محمد بن محمد بن محمد بن محمد بن عبداللہ بن محمد بن فہد شریف محمد بن محمد بن المحب ابوبکر بن تقی ہاشمی شافعی مکی، وہ بھی اپنے اسلاف کی طرح ابن فہد سے معروف تھے، ان کی ولادت ۸۴۶ھ، ۱۲/ربیع الاول، یوم شنبہ بوقت عشاء مکۃ المکرّمہ میں ہوئی۔

علمی سفر اور ہندوستان آمد

انہوں نے حصول علم کے لئے رخت سفر باندھا اور قاہرہ دمشق پہنچے، وہاں حصول علم میں لگے رہے؛ تا آں کہ اجازت سے سرفراز ہوئے، اس کے بعد گجرات میں تشریف آوری ہوئی، یہاں وہ طویل مدت تک لوگوں کو فیض پہنچاتے رہے اور آخری عمر میں مندو چلے گئے اور آخری سانس تک وہیں مقیم رہے۔

محمد بن عمر آصفی نے ذکر کیا ہے کہ جب وہاں ہندوستان تشریف لائے تو ان کے پاس ان کے والد محترم اور چچا کے ہاتھوں لکھا ہوا بخاری کا نسخہ تھا جو کسی سلطان کے سامنے پیش

کیا تھا۔

وہ محمود شاہ بیگڑہ کی وفات کے وقت گجرات میں تھے،اس کے بعد مندو چلے گئے اور ۹۲۵ھ میں واصل بحق ہوئے، وقت وفات ان کی عمر ۸۰/سال سے کچھ زائد تھی۔(نزہۃ الخواطر :۴/۱۲، ط:مجلس دائرۃ المعارف حیدرآباد،اضواء علی تاریخ الحرکۃ العلمیۃ فی غجرات:ص:۶۵)

مولانا قاسم کاہی

سید نجم الدین نام اور کاہی تخلص تھا،ان کے آباء واجداد اصفہان میں آباد تھے، جب تیمور نے اصفہان پر حملہ کیا تو وہ اس کے لشکر میں جا ملے، پھر اس کے ہمراہ سمرقند میں جا کر آباد ہوگئے، وہاں سے ''سعد'' کی ایک بستی کوفن میں منتقل ہوئے، کاہی اسی جگہ ۱۴۶۳ء/ ۸۸۸ھ میں پیدا ہوئے، پندرہ سال کی عمر میں ہرات گئے اور مولانا جامی رحمۃ اللہ علیہ کے درس میں شریک ہوئے، سات سال تک ان سے مستفید ہوتے رہے، علوم عقلی ونقلی کی متداول کتابیں پڑھیں اور تزکیۂ باطن سے بھی بہرہ ور ہوئے، ۱۴۸۳ء/ ۹۰۸ھ میں کابل آگئے اور ایک عرصہ تک وہاں مقیم رہے، وہیں مولانا ولد مجذوب سے تصوف وعرفان کی تربیت حاصل کی، کاہی دو مرتبہ ہند آئے، پہلی مرتبہ ۱۵۲۸ء سے ۱۵۴۹ء تک بھکر میں ہاشمی کرمانی کے وہاں قیام کیا اور ان سے کسب فیض بھی کیا، اس مدت میں سے ۱۵۳۴ء سے ۱۵۴۹ء کے درمیان وہ سومناتھ اور گجرات میں مقیم رہے، سلاطین گجرات بہادر شاہ (۱۵۲۶ء تا ۱۵۳۶ء) اور محمود شاہ ثالث (۱۵۳۷ء تا ۱۵۵۳ء) نے ان کی قدر ومنزلت کی، دوسری مرتبہ وہ ۱۵۵۳ء میں اس سرزمین میں آئے، دہلی کے ہمایوں بادشاہ نے واپسی پر انہیں عالی رتبہ دے کر نوازا اور وہ خواص وعوام میں مقبول ہوئے۔(تاریخ مشائخ احمد آباد:۱۶۹،۱۷۰)

محمد بن مالکی مصری

نام وولادت: آپ کا نام ونسب: محمد بن محمد بن عبدالرحمٰن بن حسن بن جلال الدین ہے، وطنا مصری اور مسلکا مالکی ہے، اپنے اسلاف کی طرح ابن سوید سے مشہور ہوئے، آپ کی ولادت ۱۶؍شعبان المعظم ۸۵۶ھ میں ہوئی۔

حصول علم واساتذہ: چوں کہ آپ کی والدہ ام ولد تھیں، اس لئے اپنے والد کے سایۂ عاطفت میں تربیت پائی، قرآن کریم حفظ کیا، کافیہ، شروح کافیہ اور الفیۃ النحو پڑھی، باپ کے انتقال کے بعد بہت کچھ میراث میں پایا تھا، مگر بہت ہی کم وقت میں ادھر ادھر خرچ کر کے تنگ دست ہو گئے۔

اس کے بعد آپ صعید (مصر) ہوتے ہوئے مکہ مکرمہ چلے گئے اور علامہ سخاوی سے موطا، مسند امام شافعی، سنن ترمذی اور ابن ماجہ پڑھی، نیز شرح الفیہ اور علامہ سخاوی کی دیگر تصانیف کی سماعت کی اور طویل مدت تک ان سے استفادہ کرتے رہے، اسی لئے علامہ سخاویؒ نے اپنے اس شاگرد کی بہت ہی اچھے الفاظ میں تعریف کی ہے؛ لکھتے ہیں: وکان صاحب ذکاء وفضیلة فی الجملة واستحضار وتشدق فی الکلام. **البتہ آپ پر** ان الفاظ میں کچھ تنقید بھی کی: وکانت سیرته غیر مرضیة.

تدریس وگجرات آمد: اس کے بعد آپ یمن پہنچے اور ''زبید'' میں تدریس وخدمات حدیث میں مشغول ہو گئے، وہاں سے گجرات کی طرف متوجہ ہوئے اور کھنبایت اترے، جہاں آپ کا خیر مقدم کیا گیا۔

جاراللہ بن فہد نے آپ کے گجرات کے حالات تفصیل سے تحریر کئے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

’’بلاد گجرات میں آپ کی خوب تکریم وتعظیم ہوئی اور بڑا درجہ پایا، سلطان وقت محمود شاہ کے مقربین میں آپ کا شمار ہوتا ہے، آپ کی معرفت حدیث اور فصاحت و بلاغت کی بنیاد پر بادشاہ نے آپ کو ملک المحدثین کا لقب دیا تھا، اس علاقہ میں یہ لقب پانے والے آپ پہلے شخص ہیں، اسی وجہ سے گجرات میں آپ کا درجہ اور عظمت بڑھ گئی؛ حتی کہ اکابر علماء آپ کے مطیع ومنقاد ہوگئے اور آپ کا گھر طلبہ کے لئے پناہ گاہ اور ٹھکانہ بن گیا۔‘‘

اہل حکومت سے روابط کی بنیاد پر اہل حرمین شریفین کو عطایا برابر بھیجتے رہے، لیکن جب محمود شاہ کی وفات ہوگئی اور ان کا بیٹا مظفر شاہ تخت نشین ہوا، تو بعض وزراء کے حسد کی بنا پر آپ سے بعض وظائف واپس لے لئے گئے، پھر بھی آپ انتقال تک دینی خدمات میں مشغول رہے۔

ظفر الوالہ میں آصفی نے لکھا ہے: علامہ سخاوی فرماتے ہیں کہ میں نے ان کی بیس الگ الگ مشائخ سے مروی چالیس احادیث جمع کی ہے، ان احادیث کی سند بڑی عالی ہے اور اس کا نام ’’فتح المبین‘‘ ہے۔

وفات: آپ کی وفات ۹۲۹ھ میں احمد آباد میں ہوئی اور وہیں دفن ہوئے؛ لیکن آج ان کے مدفن سے کسی کو واقفیت نہیں ہے۔ (نزہۃ الخواطر: ۴/۲۷۹، گجرات کے علماء حدیث وتفسیر: ۲۵، مشائخ احمد آباد: ۴۸)

جمال الدین محمد بن عمر بحرق حضرمی

ولادت اور نام ونسب: ان کی ولادت ۸۶۹ھ میں ۱۴/شعبان المعظم کی شب کو حضر موت میں ہوئی، سلسلۂ نسب اس طرح ہے: جمال الدین محمد بن عمر بن مبارک بن عبداللہ بن علی حمیری حضرمی، جو بحرق ہی سے مشہور ہوگئے، پروفیسر محبوب حسین عباسی کا خیال یہ ہے

کہ بحرق یمن میں ایک جگہ کا نام ہے، جو ان کی جائے ولادت ہے، جب کہ دیگر سوانح نگاروں کے مطابق یہ علامہ کا عرف ہے۔

حصول علم اور اساتذہ: ابتدائی تعلیم اپنے وطن ہی میں حاصل کی، وہیں حفظ قرآن کریم کیا، اس کے بعد معظم الحاوی اور الفیۃ النحو حفظ کرلی، اس کے علاوہ اور بھی کچھ کتابیں پڑھیں اور حضرموت کی ایک جماعت سے علم حاصل کیا۔

اس کے بعد عدن چلے گئے اور عبداللہ بن احمد مخرمہ کے یہاں حاضر خدمت ہوکر زانوئے تلمذ تہہ کیا، ان کی صحبت میں رہتے ہوئے فقہ، اصول فقہ اور لغت عربی میں خوب فائدہ اٹھایا؛ نیز ان کے پاس سیرت ابن ہشام اور الفیۃ ابن مالک مکمل پڑھی اور فقہ میں الحاوی الصغیر کا خاصہ حصہ ان سے پڑھا، ان کے علاوہ شیخ محمد بن احمد بافضل سے بھی استفادہ کیا۔

پھر آپ زبید تشریف لے گئے اور وہاں علماء حدیث وفقہ سے استفادہ کیا، اس کے علاوہ اور بھی علوم وفنون پڑھے اور تعمق پیدا کیا، چنانچہ زبید میں زین الدین محمد بن عبداللطیف شرجی سے علم حدیث، محمد بن ابوبکر صائغ سے علم اصول تفسیر، نحو وغیرہ حاصل کئے اور انہیں سے ابوزرعہ کی شرح بهجة الوردية پڑھی اور جب ۸۹۴ھ میں حج کے لئے تشریف لے گئے، تو وہاں حافظ سخاوی سے سماعت کی اور علمی پیاس بجھائی۔

خدمات دینیہ اور گجرات تشریف آوری: مختلف علوم وفنون میں علمی مہارت حاصل کرنے کے بعد درس وتدریس میں مشغول ہوئے اور فتوی بھی دینے لگے، جو پسندیدہ نظر سے دیکھے جانے لگے اور میدان تصنیف وتالیف میں بھی قلمی جولانیاں دکھائی۔

اس کے ساتھ مقام شحر (زبید) میں عہدۂ قضاء پر بھی فائز ہوئے، بعد میں کسی وجہ سے

خود ہی اس منصب سے علیحدگی اختیار کرلی ، پھر عدن تشریف لے گئے ، جہاں قبول عام نصیب ہوااور امیر بھی آپ کو چاہنے لگا،لیکن امیر کے انتقال کے بعد عدن سے دل اچاٹ ہوگیاتو ہندوستان کا رخ کیااور گجرات کے سلطان مظفرشاہ دوم کے دربار میں سفیر کی حیثیت سے آنے کا موقع ملا، سلطان نے بھی آپ کی تعظیم وتکریم میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا اوران کے شایان شان سلوک کیا،حتی کہ سلطان نے علامہ سے حدیث بھی پڑھی،خلاصہ یہ کہ دربارشاہی میں ایک عالم اورایک امیر کی حیثیت سے کافی مقبولیت حاصل کرلی۔

تالیفات: چوں کہ آپ علماءراسخین اورائمہ متبحرین میں سے تھے،جمیع علوم وفنون میں آپ کو یدطولی حاصل تھا،وہ تحقیق،جودت فکراور باریک بینی میں بلندیوں پر پہنچے ہوئے تھے، اکثر فنون میں آپ کی تالیف اس کی شاہد ہے،جو ان کے علمی اور کثرت مطالعہ پر دلالت کرتے ہیں،سوانح نگاروں نےتقریبا۳۰؍تالیفات کا تذکرہ کیاہے۔

وفات: شیخ بحرق نے گجرات آنے کے بعد ایک سال کے عرصہ میں نہ صرف یہ کہ سیرت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم پرایک عمدہ کتاب لکھ کر اپنی قابلیت کا سکہ منوایا؛ بلکہ بادشاہ کی نظروں میں مقرب ہوگئے اور بادشاہ آپ کی خوب تعظیم وتکریم کرنے لگا، یہی چیز آپ کی شہادت کا باعث بنی اوربعض وزراء نے آپ سے حسد کیااورآپ کوزہر پلادیاجس کی وجہ سے آپ ۲۰؍شعبان المعظم ۹۳۰ھ کو راہ گزین حیات جاویدانی ہوگئے۔(شذرات الذھب :۷/ ۲۶،۶۵،۱۷۷،الضوء اللامع :۳/۲۵۳،گجرات کے علماءحدیث وتفسیر ۲۵،۲۶،۶۵،مشائخ احمد آباد:۵۱-۶۰)

قاضی عبداللہ سندھی

شیخ عالم فقیہ قاضی عبداللہ بن ابراہیم عمری سندھی مہاجر مدنی مولد دربیلہ صوبہ سندھ، تحصیل درسیات شیخ عبدالعزیز ابہری شارح مشکوۃ سے کی اورخود مدت تک تدریس فرمائی،

جب سلطان شاہی بیگ قندھاری سندھ پر قابض ہوا تو آپ حرمین شریفین کی زیارت کے ارادے سے روانہ ہوئے۔

۹۴۷ھ/۱۵۴۰ء میں گجرات پہنچے، جہاں شیخ علی متقی برہان پوری سے ملاقات ہوئی، جن کی شہرت چار دانگ گجرات میں تھی، حتی کہ بہادر شاہ بھی ان کا معتقد تھا اور چاہتا تھا کہ آپ کی خدمت میں حاضر ہو، لیکن شیخ متقی اجازت نہیں دیتے تھے، بہر حال کچھ مدت احمد آباد میں شیخ علی متقی کی خدمت میں رہ کر مدینہ منورہ تشریف لے گئے اور تھوڑی مدت میں وہاں انتقال فرمایا۔

تاریخ معصومی سے ان مقتدر مشاہیر علماء کے ترک وطن کرنے کی شہادت ملتی ہے، اولاً ۹۲۷ھ میں قلعہ بھکر سے سادات کو بے دخل کیا گیا، اس کے بعد قاضی عبداللہ بن ابراہیم ۹۳۴ھ میں گجرات چلے گئے اور وہاں سے حجاز مقدس جا پہنچے اور وہیں وفات ہوئی۔ (مشائخ احمد آباد: ۲۲۹-۲۳۰)

سید احمد جعفر شیرازی

سید احمد بن سید جعفر شیرازی جن کا مزار اندرون شہر استوریہ میں واقع ہے، سادات صحیح النسب شیراز کے ہیں، ان کے دادا سید محمود شیراز سے سندھ آ کر مقیم ہو گئے اور سید جعفر سندھ سے گجرات چلے آئے اور ایک مدت تک یہاں رہے، پھر اپنے لڑکے سید احمد کو اپنا جانشین کر کے سندھ واپس چلے گئے۔

سید مذکور علوم وفنون کے ساتھ علم تجوید میں کمال درجہ ماہر تھے، آپ کے والد جب سندھ واپس گئے تو آپ کی عمر بارہ برس کی تھی، سید احمد جعفر کی بہت کرامات ہیں اور بڑے بڑے بزرگوں سے نعمت پائی اور ریاضت شاقہ سے بڑے مرتبہ پر پہنچے، تہجد کی دو ہی رکعت

میں پندرہ پارے تلاوت فرماتے تھے، محض زیادتی ثواب کے لئے پاپیادہ سفرحج فرمایا، راستہ میں غذا نہ ملتی تو درختوں کی پتیوں پر گذارہ فرماتے، آپ ہمیشہ عمدہ لباس پہنتے، حکام وقت نے بارہا آپ کا وظیفہ مقرر کرنا چاہا مگر ہر دفعہ آپ نے انکار فرمایا، جب ہمایوں بادشاہ گجرات پر قابض ہوگیا تو اکثر لوگ بھاگ گئے، آپ استقلال کے ساتھ مع ہمراہیوں کے احمد آباد میں مقیم رہے اور ہر شخص کو دو سیر غلہ پہنچاتے تھے، چالیس سال خلوت گزیں رہے، صرف جمعہ اور عیدین کے لئے باہر نکلتے تھے اور پانچوں وقت کی نماز فرض جماعت کے ساتھ اپنے حجرہ کے سامنے پڑھا کرتے تھے اور یہ واقعہ عالم ہشیاری کا ہے، مستی کے حال سے کوئی آگاہ نہ ہوا اور ایک واقعہ کے سبب بارہ سال تک جمعہ وعیدین کے لئے بھی باہر نہ نکلے، وہ واقعہ یہ ہے کہ رانا سانگا چتوڑ کا راجہ احمد نگر پر حملہ کر کے چند سید کی لڑکیوں کو اٹھالے گیا اور ان کو گانا بجانا سکھایا، اس سبب آپ نے عہد کرلیا کہ جب تک سلطان گجرات اس کا معاوضہ نہ لے گا وہ باہر نہ نکلیں گے، جب سلطان بہادر شاہ گجراتی نے چتوڑ فتح کرلیا، اس وقت خلوت سے باہر آگئے، ایک مرتبہ سلطان محمود بیگڑہ کو غیر موسم کے اس کے استدعا پر خادم کے اظہار کرنے پر آم دئے، چنانچہ حاضرین میں سے ہر ایک کو دو دو آم ملے، آپ کی وفات ۱۶ رصفر المظفر ۹۴۴ھ میں ہوئی۔ (تاریخ اولیاء گجرات: ۷۶، ۷۷)

احمد بن محمد نہروالی

نام ونسب اور ولادت: آپ کا نام ونسب اس طرح ہے: احمد بن محمد بن قاضی خان بن بہاء الدین بن یعقوب بن اسماعیل بن علی بن قاسم بن محمد بن ابراہیم بن اسماعیل عدنی خرقانی ابوالعباس علاؤالدین احمد نہروالی گجراتی۔

یہ مفتیٔ مکۃ المکرّمہ علامہ قطب الدین نہروالی کے والد ہیں اور جدامجد قاضی خان سے مراد صاحب فتاوی (قاضی خان) نہیں ہے، آپ کی ولادت ۸۷۰ھ میں ہوئی۔

حصول علم اور اساتذہ: اپنے وطن ہی میں چند ممتاز علماء سے علم حاصل کیا، اس کے بعد حرمین شریفین تشریف لے گئے، وہاں عزالدین عبدالعزیز بن نجم الدین عمر بن فہد اور دیگر ائمۂ حدیث سے حدیث پڑھی، آپ کی صحیح بخاری کی سند بہت ہی عالی ہے، جو آپ نے حافظ نورالدین ابوالفتوح احمد بن عبداللہ طاؤسی سے حاصل کی، شیخ مذکور گجرات بھی تشریف لائے ہیں، صلاح وتقوی میں مشہور تھے، انہوں نے (شیخ طاؤسی نے) شیخ یوسف ہروی سے بخاری کی سماعت کی ہے، شیخ ہروی سہ صد سالہ سے مشہور تھے، یعنی انہوں نے ۳۰۰/سال کی عمر پائی تھی، شیخ ہروی نے شیخ محمد بن شاد بخت فرغانی سے سماعت کی، شیخ فرغانی بھی معمرین (طویل العمر لوگوں) میں سے ہے، انہوں نے شیخ ابولقمان یحییٰ بن عمار بن مقبل بن شاہان ختلانی سے سماعت کی ہے، ان کا شمار سمرقند کے ابدال میں ہوتا ہے اور یہ بھی معمرین میں سے ہے، انہوں نے ۱۴۳/سال کی عمر پائی، انہوں نے محمد بن یوسف فربری سے سماعت کی اور شیخ فربری نے صاحب صحیح محمد بن اسماعیل بخاری سے۔

اوصاف: آپ صاحب صلاح، متقی اور پرہیزگار تھے، مکہ المکرّمہ کا سفر کیا اور وہیں ٹھہر گئے، آخری عمر میں بینائی ختم ہوچکی تھی۔ علامہ عبدالحی فرماتے ہیں: میرا خیال ہے کہ مکہ المکرّمہ میں مدرسۂ احمد شاہ گجراتی میں دینی خدمات کی ذمہ داری سپرد کی گئی اور وہیں وہ تدریس وافادہ میں مشغول رہے۔

وفات: آپ کی وفات ۹۴۹ھ میں مکہ المکرّمہ میں ہوئی۔ (نزہۃ الخواطر: ۴/۲۲)

مفکر ملت حضرت مولانا عبداللہ کاپودروی صاحب دامت برکاتہم نے ان کے

بارے میں مزید تفصیل ذکر فرمائی ہے۔ چنانچہ وہ تحریر فرماتے ہیں: ''ان کی ولادت ۸۷۱ھ میں نہروالا میں ہی ہوئی، انہوں نے اپنے والد اور دادا نیز بہت سے علماء سے علم حاصل کیا، جن میں شیخ محمود بن ادریس زیادہ مشہور تھے، جب علوم اسلامیہ میں کمال حاصل کر لیا تو سلطان محمود شاہ نے ان کو گجرات کا منصب قضاء سپرد کیا۔''

۸۹۹ھ میں شیخ احمد نے نہروالا سے مکہ مکرمہ کا سفر کیا اور حج ادا کر کے مکہ مکرمہ ہی میں مقیم ہوئے اور مکہ مکرمہ اور دیگر اسلامی شہروں سے روابط پیدا کئے، علامہ سخاوی کی خدمت میں حاضر ہو کر ان سے بھی کسب فیض فرمایا۔

علامہ سخاوی رحمۃ اللہ علیہ نے الضوء اللامع میں ان کا تذکرہ فرمایا ہے اور تحریر فرمایا ہے کہ ۹۰۰ھ میں شیخ احمد نہروالا تشریف لائے؛ مگر دوبارہ مکہ مکرمہ لوٹ گئے اور احمد شاہ گجراتی کے بنا کردہ مدرسہ میں مدرس ہو گئے تھے، آخری عمر میں بنائی سے محروم ہو گئے تھے، ۹۴۹ھ میں مکہ مکرمہ میں وفات پائی۔ (علامہ قطب الدین نہروالی مختصر حالات وخدمات: ص: ۵،۶)

شیخ مبارک ناگوری

شیخ مبارک بن شیخ خضر ناگوری، آپ قریشی النسل تھے، آپ کے آباء واجداد میں شیخ موسی یمن کے رہنے والے تھے، ۸۰۰ھ میں یمن سے نکل کر سستان میں مقیم ہو گئے تھے، آپ کے والد شیخ خضر بزرگوں کی زیارت کے ارادہ سے دسویں صدی ہجری میں ہندوستان آئے، قصبہ ناگور میں چند بزرگوں کی موجودگی کے باعث اقامت اختیار کر لی، ۹۱۱ھ میں شیخ مبارک تولد ہوئے، چار سال کی عمر سے تعلیم شروع ہوئی، چودہ سال کی عمر میں علوم متداولہ سے فارغ ہو گئے۔

احمد آباد پہنچ کر خطیب ابوالفضل گاذرونی اور مولانا عماد طارمی سے بھی استفادہ کیا،

سلوک وتصوف میں بھی اعلی مقام حاصل کیا اور شیخ یوسف وشیخ عمر سے سلسلہ شطاریہ چشتیہ، سہروردیہ میں اجازت حاصل کی۔

۹۵۰ھ میں آگرہ پہنچے، اس وقت آپ کی عمر ۳۹ر سال تھی، میر رفیع الدین صفوی کی خانقاہ میں قیام کیا، شیخ چندن قریشی کی صاحبزادی سے نکاح ہوا، پھر درس وتدریس میں لگ گئے، آپ چاروں ائمہ کے احکام سے واقف تھے، آپ کے درس میں ہر مذہب وملت کا آدمی شامل ہوتا۔

ملا بدایونی نے لکھا ہے کہ شیخ مبارک اپنے زمانہ کے بڑے کامل شخص تھے، صلاح وتوکل، زہد وتقوی میں فائق اقران تھے، ہمیشہ علوم دینیہ کے درس میں مشغول رہے، علم تصوف کو کمال درجہ پر پہنچایا تھا، شاطبی آپ کو زبانی یاد تھی، قرآن شریف دس قراءت کے ساتھ یاد تھا۔

صاحب اخبار الاصفیاء لکھتے ہیں کہ ان کے کتب خانہ میں پانچ سو ضخیم کتابیں خود ان کے قلم سے لکھی ہوئی موجود تھیں، آپ کی ایک تصنیف ہے، جس کا نام بدایونی اور طبقات کے مطابق: مبلغ نفائس العلوم اور مآثر کے مطابق: منبع عیون المعانی ہے۔ (عربی ادبیات میں پاک وہند کا حصہ: ۲۶۵، مشائخ احمد آباد: ۲۷۴-۲۷۵)

شیخ محمد بن افلح مکی

شیخ محمد بن افلح بڑے علامہ تھے، خصوصاً فصاحت و بلاغت اور ادب میں آپ کا پایہ بہت بلند تھا، آپ کی مجلس میں ہر وقت لطیفے، حکایتیں اور علمی گفتگو رہتی، آپ کے فہم وفقہ کا دائرہ بڑا وسیع تھا، ان کے متعلق صاحب النور السافر کا گمان یہ ہے کہ وہ زبید سے تعلق رکھتے تھے، اور یمن کے مشہور سات بزرگوں میں سے ایک شیخ افلح ہیں، یہ ان کی اولاد میں سے ہیں،

انہوں نے عرصہ تک ہندوستان میں درس دیا، آپ کے شاگردوں میں فقیہ علی بن صبر الیافعی مشہور ہیں، فقیہ محمد بن سراج حضرمی بھی ایک دفعہ آپ کے درس میں حاضر ہوئے، شیخ محمد بن افلح نے متعدد قصائد کہے، غرض محمد بن افلح شافعی المذہب علم واصول میں بڑے محقق تھے۔

وفات: آپ کی وفات ۹۷۲ھ کے کچھ بعد ہوئی ہے، واقعہ یہ ہوا کہ شیخ ہندوستان سے مکہ مکرمہ کے لئے گجرات کے وزیر الغ خان کی کشتی میں سوار ہوکر جارہے تھے کہ حادثہ ہوا اور کشتی اور تمام کشتی والے ڈوب گئے، ان شہید ہونے والوں میں فقیہ محمد زبیدی بھی تھے۔

ظفر الوالہ میں تفصیلی واقعہ لکھا ہے کہ ۹۷۲ھ میں ناخدا حسن علوان کے ساتھ شیخ شہاب الدین احمد زبیدی اور فقیہ جمال الدین محمد بن افلح یمنی گجرات سے حج کے لئے تشریف لے گئے، مگر ان کی کشتی جدہ میں داخل نہ ہوسکی، سقطرہ میں داخل ہوئی، کئی مہینے وہاں ٹھہرے رہے اور یہ دوسری کشتی تھی کہ جسے سقطرہ میں لنگرانداز ہونا پڑا تھا، دوسری کشتی کے ناخدا عنبر عبدالنبی تھے، باہم اتفاق سے دوسری کشتی کا سامان بھی اس میں رکھ دیا گیا، مگر سقطرہ سے جس دن چلے اسی دن کشتی ڈوب گئی اور تمام کشتی والے شہید ہوگئے۔ (مشائخ احمد آباد:۱۳۱، نزہۃ الخواطر: ۴/ ۲۳۳)

شیخ حسین بغدادی

ولادت وتعلیم: سوانح نگاروں نے آپ کی سن ولادت تحریر نہیں فرمائی ہے، ہاں! سن وفات ۹۷۷ھ تحریر کرتے ہوئے لکھا ہے: ولہ ست وسبعون سنۃ، اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ آپ کی ولادت ۹۰۱ھ میں ہوئی ہوگی۔

آپ امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی اولاد میں سے تھے اور آپ کا شمار علماء کبار میں ہوتا ہے، آپ کی ولادت اور نشو نما بغداد ہی میں ہوئی۔

آپ نے علمائے شہر سے علم حاصل کیا اور علوم عقلیہ ونقلیہ میں اجتہاد اور ایجاد سخن کا رتبہ حاصل کیا، اس کے بعد مزید حصول علم کی غرض سے امیر غیاث الدین بن منصور شیرازی سے استفادہ کے لئے شیراز کا سفر کیا، ابھی تو شیراز پہنچے ہی تھے کہ وہاں کے امیر ابراہیم خان نے اہل علم کی ایک مجلس طلب کی، جس میں شرکت کے لئے شیخ کو بھی دعوت دی گئی، جب لوگ حاضر ہوگئے تو امیر نے حاضرین کے سامنے وہ تمام اعتراضات پیش کئے، جو غیاث الدین بن منصور نے شرح التجرید پر علت ومعلول کی بحث میں کئے ہیں، حاضرین مجلس میں سے کوئی بھی جواب نہ دے سکا تو شیخ نے امیر سے کہا: اگر دو روز کے لئے یہ کتاب مجھے دی جائے تو میں اس کا بغور مطالعہ کرنے کے بعد اس کا جواب دوں گا، امیر نے مذکور کتاب ان کے حوالہ کردی، انہوں نے مطالعہ اور غور وخوض کے بعد دوسری مجلس میں متعدد وجوہ سے اور اس خوب صورتی سے جوابات دیئے کہ تمام علماء نے آپ کی تحسین فرمائی، ہاں! غیاث الدین منصور نے خجالت وشرمندگی کی بناء پر آپ کو خارجی اور ناصبی سے متہم کیا اور امیر سے بھی مطالبہ کیا کہ ان کو شہر بدر کردیا جائے، لیکن امیر شہر نے نہ صرف انکار کیا بلکہ سفارشی انداز میں فرمایا: جو شخص اس شہر میں آپ سے استفادہ کی غرض سے حاضر ہو، اسے میں کیسے شہر بدر کرسکتا ہوں؟ بالآخر غیاث الدین ان سے راضی ہوگئے اور شیخ نے ایک مدت تک شیراز میں ان سے استفادہ کیا۔

گجرات تشریف آوری: اس کے بعد شیخ نے حرمین شریفین کا رخت سفر باندھا اور حج وزیارت سے مشرف ہوئے، اس کے بعد ہندوستان تشریف لائے اور کئی بڑے بڑے شہروں کی سیاحت کی، (ہوسکتا ہے کہ افادہ اور فیض رسانی کے لئے مناسب جگہ وآب وہوا کی تلاش ہو اور اس عرصہ میں بھی انہوں نے ان جگہوں پر فیض پہنچایا ہو، جہاں وہ پہنچے) آخر میں آپ

نے گجرات کے مشہور شہر احمد آباد کو اقامت وافادہ کے لئے پسند فرمایا اور سکونت اختیار کی اور یہیں آپ نے مسند درس وافادہ آراستہ فرمائی، آپ سے مولانا عبدالقادر بغدادی، حکیم عثمان بوبکانی اوران کے علاوہ بے شمار افراد نے علم حاصل کیا۔

وفات: ۹۷۷ھ میں آپ نے آخری دم توڑا اور رسول آباد میں آپ کی تدفین عمل میں آئی، بوقت وفات آپ کی عمر ۷۶ رسال تھی۔(مشائخ احمد آباد:ص:۱۳۸،۱۳۹،نزہۃ الخواطر:۴/ ۸۴)

سیدی علی چلپی

ترکی امیرالبحر سیدی علی نے اپنے سفرنامہ کے طور پر محیط اور مرأۃ الممالک کے نام سے دو کتابیں لکھی ہیں، محیط میں ان راستوں کا مفصل بیان ہے جو عرب جہاز رانوں نے قرون وسطی کے پچھلے دور میں اختیار کئے تھے، قبل اس کے کہ اہل پرتگال ان کو معلوم کرتے؛ محیط کے جن ابواب میں تفصیلی بیانات ہیں ان کا ترجمہ ڈاکٹر ایم بیٹر نے جرمن زبان میں کیا ہے۔

سیدی علی کی دوسری کتاب مرأۃ الممالک کا جرمن، فرانسیسی اور انگریزی ترجمہ ہو چکا ہے، آپ سلطان سلیمان اول کے زمانہ میں تھے اور ان کی خدمات کا بیشتر حصہ اسی کی ملازمت میں گذرا، اس کے باپ کا نام حسین تھا، اس کا بیان ہے کہ فتح قسطنطنیہ کے بعد سے ان کے باپ اور دادا شاہی اسلحہ خانہ غلطہ کے مہتمم تھے، انہوں نے خود بھی جہاز رانی کا عمیق مطالعہ کیا تھا، یہ فتح رہوڈس کے موقعہ پر موجود تھے اور ان تمام لڑائیوں میں شریک تھے، جو بحر روم میں واقع ہوئیں، نیز خیرالدین پاشا کی تمام فتوحات میں اس کے ہمرکاب تھے، انہوں نے ہیئت، فلسفہ اور فن جہاز رانی پر کتابیں لکھیں اور کاتب رومی کے نام سے مشہور

ہوئے، سلطان ترکی نے سیدی علی چلپی کو مصر کا امیرالبحر مقرر کر کے ترکی بحری بیڑے کو بصرہ سے واپس لے جانے پر مامور کیا۔

سیدی علی حلب سے موصل ہوتے ہوئے بغداد پہنچے اور وہاں سے کربلا کی زیارت کے لئے گئے، بغداد واپس آ کر قط الامارہ کو روانہ ہوئے اور واسط سے گزر کر زکیہ گئے، وہاں سے بصرہ پہنچے، یکم شعبان المعظم ۹۶۱ھ کو بصرہ سے مصر کی طرف جہاز سے روانہ ہوئے اور راستہ میں مسقط کے قریب پرتگالی جہازوں سے مقابلہ ہوا، جس میں پندرہ میں سے صرف نو ترکی جہاز محفوظ رہ سکے، اس کے بعد یہ مختصر ترکی بیڑا ایک زبردست طوفان میں گرفتار ہو کر ہندوستان کے مغربی ساحل کی طرف بہہ نکلا، اس طوفان میں ان جہازوں کو بہت نقصان پہنچا، خود سیدی علی کا جہاز بری طرح زخمی ہو گیا، آخر بمشکل تمام یہ مجروح بیڑا سورت پہنچا، جہاں عمادالملک وزیر سلطان احمد نے اسے مدعو کیا تھا۔

جس زمانہ میں سیدی علی گجرات پہنچے، وہ اس ملک کے لئے نہایت انتشار اور ابتری کا زمانہ تھا، چند ہی روز قبل محمود ثانی قتل کیا جا چکا تھا اور اس کی جگہ احمد خان احمد شاہ ثانی کے لقب سے تخت پر بٹھایا گیا تھا اور محض نام کا سلطان تھا، علی چلپی نے گجرات کے سیاسی حالات کو مختصر طور پر بیان کیا ہے اور اس سلسلہ میں سلطان محمود کے قتل اور ناصر الملک خداوند خان اور عادل خان کا ذکر کیا ہے، جنہوں نے اس وقت کی سیاسی فضا میں نمایاں حصہ لیا تھا، یہ دیکھ کر کہ بحری راستہ سے مصر پہنچنا ناممکن ہے، سیدی علی نے بری راستہ سے سندھ، پنجاب اور افغانستان ہوتے ہوئے قسطنطنیہ کا فیصلہ کیا، آخر نومبر یا ابتدائے دسمبر ۱۵۵۴ء میں وہ اس لمبے سفر کے لئے روانہ ہوئے اور بھروچ، بڑودہ، چانپانیر اور محمود آباد سے گذرتے ہوئے احمد آباد پہنچے، جو اس وقت بھی گجرات کا دارالسلطنت تھا، راستہ میں انہیں تاڑ کے درخت نظر آئے اور

انہوں نے تاڑی کو دیکھا، یہ ان کے ساتھیوں کے لئے عجیب چیز تھی اور وہ اس قدر وسیع تھے کہ ان کے نیچے ہزاروں آدمی کھڑے ہو سکتے تھے، بعض مقامات پر خیمہ کے ہر چہار طرف بے شمار بندر اور چھوٹے چھوٹے طوطے جمع ہو جاتے تھے، سورت سے روانہ ہونے کے تقریباً پچاس روز بعد غالباً جنوری ۱۵۵۵ء کے آخری حصہ میں سیدی علی احمد آباد پہنچے اور وہاں وزیر عماد الملک اور سلطان احمد ثانی سے ملاقات کی، سلطان بہت مہربانی سے پیش آئے اور ایک گھوڑا، کئی اونٹ اور سفر خرچ کے لئے روپیہ پیش کیا۔

سیدی علی کا بیان ہے کہ سلطان نے انہیں بھروچ کی گورنری بھی پیش کی تھی، لیکن انہوں نے قبول نہیں کیا، عماد الملک کے مکان پر اتفاق سے ایک پرتگالی سفیر سے ملاقات ہوگئی، دونوں میں گفتگو نہایت تیزی سے ہوئی اور سفیر نے سیدی علی کو دھمکی دی کہ تم کسی بندرگاہ سے نہ جا سکو گے، جس کا جواب سیدی علی نے یہ دیا کہ میں خشکی سے بھی سفر کر سکتا ہوں، احمد آباد کے قیام میں سیدی علی نے شیخ احمد مغربی کے مزار کی زیارت کی اور یہیں انہوں نے اپنی مشہور کتاب محیط کی تالیف بھی کی ہے۔ (مشائخ احمد آباد: ۲۳۵-۲۳۸)

سید بہاء الدین مکی

شاہ وجیہ الدین کے اجداد میں سے سب سے پہلے عرب سے آکر چانپانیر میں مقیم ہوئے، سلاطین گجرات آپ کا بڑا خیال رکھتے، اسی جگہ آپ نے شادی کی اور آپ کے بچے ہوئے اور اسی جگہ آپ کا انتقال ہوا، آپ کی اولاد میں سے سید عماد الدین کو سلطان نے قصبہ پاتری ضلع بیرم گام کا قاضی مقرر کیا۔ (تاریخ اولیاء گجرات: ۸۲)

علامہ محمد بن طاہر پٹنی

نام ونسب اور ولادت: نام محمد، مجد الدین لقب اور شیخ الاسلام خطاب ہے اور بعض

لوگوں نے مجد الدین کے بجائے جمال الدین لکھا ہے۔ النور السافر میں ہے: ''جمال الدین محمد طاہر ملک المحد ثین ہندی، پدر بزرگوار کا نام طاہر اور دادا کا نام علی بن الیاس خواجہ ہے''۔ نسب مندرجۂ ذیل ہے:

محمد بن طاہر بن علی بن الیاس بن ابو النصر داود بن ابو عیسی عبد الملک بن ابو الفتح یونس شامی مؤلف جامع القصص، ابن عمر شامی بن عبداللہ بن ابو العطا حسین مفتی بن ابو المحامد احمد غریب بن ابو قاسم محمد ابو الصلاح محمد بن ابو الفیض عبداللہ بن ابو الرضا عبدالرحمٰن بن ابو البقا قاسم بن محمد عباس بن ابو النصر محمد طیفور شامی بن ابو المجد خلف بن ابو المجد احمد بن ابو الوجود شعیب بن ابو طلحہ بن عبداللہ بن عبدالرحمٰن بن ابو بکر صدیق صاحب رسول صلی اللہ علیہ وسلم۔

آپ کی ولادت بمقام پٹن ۹۱۴ھ میں ہوئی، النور السافر کے مطابق سال ولادت ۹۱۳ھ ہے، صاحب نزہۃ الخواطر نے بھی ۹۱۳ھ ہی ذکر کیا ہے۔

تعلیم: ابتدائی تعلیم آپ نے گھر میں ہی حاصل کی، آپ ابھی بالغ بھی نہ ہوئے تھے کہ آپ نے تقریباً ۹۲۴ھ میں قرآن مجید بھی حفظ کرلیا، اس کے بعد آپ نے دوسرے علوم وفنون کی طرف توجہ فرمائی، آپ پندرہ سال میں معقول ومنقول، اصول وفروع یعنی اس عہد کے مروجہ علوم سے فارغ ہوگئے۔

چوں کہ آپ بہت فہمیدہ اور ذہین تھے، اس لئے مدرسہ میں جس طالب علم سے بحث ہوتی وہ ہارتا جاتا اور کسی مسئلہ میں آپ سے گفتگو کا حوصلہ نہ پڑتا، اس کے علاوہ آپ میں کچھ امارت کی شان بھی ہوگی، جس کے سبب آپ دوسروں سے ممتاز نظر آتے ہوں گے، اس لئے طالب علم آپ سے حسد رکھتے ہوں گے اور ہر طرح سے آپ کو تکلیف دیتے ہوں گے، اس لئے بعض مرتبہ مصیبت اور پریشانی اٹھانی پڑتی، اسی تجربہ سے آپ نے اسی زمانہ میں عہد کرلیا

کہ اگر مجھ کو خدا نے درس دینے کی توفیق دی تو طالب علموں کو بڑی عزت سے رکھوں گا اور ان کے ساتھ خاص مہربانی سے پیش آؤں گا۔

''النور السافر'' میں ہے کہ لوگ بیان کرتے ہیں کہ آپ نے تحصیل علوم کے زمانہ میں طالب علم وغیرہ سے سخت تکلیفیں اٹھائی تھی، اس لئے انہوں نے نذر مانی تھی کہ وہ جب صاحب علم ہوں گے تو صرف خوشنودئ خدا کے لئے علم پھیلائیں گے، چنانچہ جب وہ اس قابل ہو گئے تو نذر پوری کی، پھر تو ہر ایک طالب علم نے ان سے فائدہ اٹھایا؛ چنانچہ ایسا ہی ہوا، والد صاحب کے انتقال پر جو دولت ہاتھ آئی، اس کو طلبۂ علم پر صرف کرتے تھے اور کسی طالب علم کو علم سے محروم نہ رکھا، اسی لئے ان کے شاگردوں کا حلقہ بڑا وسیع نظر آتا تھا۔

ہندی اساتذہ: آپ کے ہندی اساتذہ میں مشہور نام مولانا شیخ ناگوری، شیخ برہان الدین سمہودی اور یداللہ سوہی کا ہے اور جس استاد کی خدمت میں اختتام تعلیم کی ان کا نام ملا متھ یا مٹھ ہے اور ممکن ہے کہ ''کہتہ'' ہو۔

غرض پندرہ سال کی عمر میں علوم نقلیہ وعقلیہ سے فارغ ہو کر صاحب درس ہو گئے، دنیا میں بہت کم؛ بلکہ مخصوص ہستیاں ایسی ہوئی ہیں، جو اس کم سنی کے باوجود صاحب درس ہو گئے ہوں، اسی سے ان کی قابلیت اور لیاقت کا پتہ چلتا ہے اور یہ کہ علوم وفنون میں ان کا مرتبہ کتنا بلند تھا، یہی سبب ہے کہ ان کے وسیع شاگردوں میں ایک معقول تعداد ایسے لوگوں کی ہیں، جو ملک کے آسمان پر ستارہ بن کر چمکے۔

وہ اپنے ہم عصروں سے اس طرح بڑھ گئے کہ فن حدیث میں گجرات کے علماء میں سے کوئی ان کا مقابل پیدا نہ ہو سکا، وہ صالح، متقی اور علم کے سمندر تھے، فن حدیث میں ان کی متعدد تالیفات ہیں، آپ پٹن میں پندرہ برس تک تعلیم دیتے رہے۔

زیارت حرمین شریفین وحج بیت اللہ: ۹۴۴ھ میں آپ کو حرمین شریفین کا اشتیاق دامن گیر ہوا، آپ پٹن سے کھنبایت تشریف لے گئے اور بہت ممکن ہے کہ بندر دیو سے مکہ مکرمہ تشریف لے گئے ہوں، کیوں کہ بندرگاہیں صرف دو ہی تھیں، جہاں سے مسافروں کا جہاز بکثرت باہر جاتا تھا، کھنبایت اور دیو؛ دیگر بندرگاہوں سے کم۔

آپ پہلے مکہ مکرمہ تشریف لے گئے اور حج سے فارغ ہوکر مدینہ منورہ پہنچے اور زیارت قبر رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے مشرف ہوئے، پھر آپ مکہ مکرمہ واپس تشریف لائے، یہ زمانہ سلطان محمود ثانی بن لطیف خان بن مظفر خان ثانی کا ہے۔

مکہ مکرمہ سے آپ کا علمی رابطہ: ۹۴۴ھ میں جب زیارت مدینہ سے فارغ ہوکر تشریف لائے تو اس وقت وہاں ایسے استادوں کا مجمع تھا کہ جن کی صحبت کو غنیمت جان کر کچھ عرصہ کے لئے وہاں مقیم ہوگئے تاکہ تکمیل تعلیم ہوجائے اور چوں کہ حدیث کی طرف آپ کی طبیعت زیادہ مائل تھی، اس لئے مخصوص طور پر اس علم کو حاصل کرنے کے لئے وہاں کے ماہرین فن استادوں کی طرف آپ نے توجہ کی اور ان سب سے فائدہ اٹھایا، چنانچہ مکی استادوں میں مندرجۂ ذیل استادوں سے مستفید ہوئے۔

ابوعبید اللہ زبیدی، سید عبداللہ عیدروس عدنی، شیخ عبید اللہ حضرمی، شیخ جار اللہ بن فہد مکی، شیخ خودار سندھی، شیخ ابوالحسن بکری مکی، شیخ علی بن عراق مدنی۔

شیخ ابن حجر ہیثمی مکی اور شیخ علی متقی دو مشہور محدث تھے، آخری تکمیل انہیں دونوں بزرگوں سے کی، ابن حجر مکی حدیث میں اور علی متقی تصوف میں بڑی شہرت رکھتے تھے، شیخ علی متقی کا پایۂ حدیث بھی کچھ کم نہ تھا، وہ عامل بالحدیث تھے، ان کی صحبت سے لوگ بہت متأثر ہوتے تھے اور اسی لئے علامہ محمد بن طاہر ان کی صحبت سے فیض یاب ہوئے۔

وطن واپسی اور تعلیمی وتدریسی مشغلہ: حضرت شیخ مکہ سے کب واپس تشریف لائے اس کا صحیح طور پر پتہ نہیں چلا، محض قیاس سے چار پانچ برس کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے، یعنی ۹۵۰ھ میں وطن میں تشریف لے آئے۔

وطن پہنچ کر انہوں نے تدریس وتعلیم کا کام شروع کیا، اپنے بزرگ والد صاحب سے ورثہ میں بہت کچھ پایا تھا؛ مگر سب طلبۂ علوم نبوت پر خرچ کر ڈالا۔

تصانیف: (۱) مجمع بحار الانوار:

جو منشی نول کشور مطبع لکھنؤ سے متعدد بار طبع ہوئی تھی؛ مگر ان نسخوں میں غلطیاں بکثرت تھیں، بعد میں محدث شہیر مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کے نسخوں کا مقابلہ کر کے تصحیح کے ساتھ طبع کروایا، اب عام طور پر یہی نسخہ متداول ہے۔

علامہ نے اس میں ہر غریب لفظ کی تشریح کی ہے؛ بلکہ یہ کتاب غریب الفاظ کی لغات میں صحاح ستہ کی شرح ہے، تمام اہل علم اس سے فائدہ اٹھاتے ہیں، یوں کہنا بے جا نہ ہوگا کہ اس تصنیفی عمل سے ان کا اہل علم پر بہت ہی بڑا احسان ہوا۔

(۲) کفایۃ المفرطین شرح شافیہ:

اس کا ایک نسخہ درگاہ حضرت پیر محمد شاہ احمد آباد کے کتب خانہ میں ہے، متوسط تقطیع، خط نسخ، زبان عربی، ہر صفحہ پر ۱۳؍سطریں اور کل صفحات ۱۵۷؍ہیں، ۹۶۱ھ کی تصنیف ہے، کتابت کا سن نہیں دیا گیا، شافیہ کا متن سرخی میں دیا گیا ہے اور اس کی شرح سیاہی سے لکھی گئی ہے، کہیں کہیں حاشیہ بھی ہے، جو کسی دوسرے صاحب کا ہے اور اسی سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس کی کتابت کے وقت دوسرے نسخے بھی موجود تھے۔

(۳) تذکرۃ الموضوعات، (۴) قانون الموضوعات۔

اول الذکر بھی حضرت علامہ کی مشہور کتابوں میں شمار کی جاتی ہے، یہ کتاب بیروت سے متعدد بار طبع ہو چکی ہے، کل صفحات کی تعداد ۲۲۹ رہے، ہر صفحہ ۲۴ر سطور پر مشتمل ہے۔

اس کی کتابت پر ابھارنے والا محرک وسبب ذکر کرتے ہوئے تذکرۃ الموضوعات کے مقدمہ میں خود تحریر فرماتے ہیں: مجھے اس کی طرف ابھارنے والا سبب یہ ہے کہ عام شہروں میں صغانی اور دیگر حضرات کی موضوعات پر لکھی ہوئی کتابیں مشہور ہو چکی ہیں اور میرے خیال میں ان تمام کا مواد ومقتدا ابن الجوزی کی کتاب ہے اور حقیقت یہ ہے کہ ابن الجوزی کسی بھی حدیث پر وضع کا حکم لگانے میں خوب افراط سے کام لیتے ہیں، اسی لئے بعض علماء افاضل نے ان کا تعاقب کیا۔

اور شروع میں ذکر کیا ہے کہ علماء ناقدین کے اقوال جمع کئے ہیں، جو وضع اور ضعیف حدیث کے بارے میں منقول ہے تاکہ یہ معلوم ہو جائے کہ یہ حدیث ضعیف یا موضوع ہے تو وہ متفق علیہ ہے یا کسی کے سہو وخطا کے نتیجہ میں حدیث پر یہ حکم لگایا گیا ہے۔

یہ اقوال جمع کئے اور یہ محنت اس لئے کی ہے تاکہ کسل مند لوگ کسی ایک ہی آدمی کے قول کو مدنظر رکھ کر وضع کا حکم نہ لگائیں اور کوئی غافل کسی ایک کے قول سے دھوکہ میں آکر کسی حدیث پر صحت کا حکم لگانے میں سرعت سے کام نہ لے، خلاصہ یہ ہے کہ لوگ افراط یا تفریط کے شکار ہیں۔ (اس لئے یہ اعتدال قائم کیا گیا۔)

اس کتاب کا سن طباعت بندہ کو نہ مل سکا، ہاں! مترجم مولانا ابوظفر ندوی صاحب نے سن طباعت ۹۵۸ھ ذکر کیا ہے، ہوسکتا ہے کسی دوسرے نسخہ میں یہ سن موجود ہو، جس سے مولانا ابوظفر ندوی صاحب نے استفادہ کیا ہو۔

اسی کتاب کے آخر میں ثانی الذکر کتاب مسمی بہ "قانون الموضوعات الضعفاء"

ملحق ہے، جو صفحہ نمبر ۲۳۰ سے ۳۱۰ یعنی ۸۰ صفحات پر مشتمل ہے، مقدمہ میں حضرت علامہ نے لکھا ہے کہ یہ کتاب تذکرۃ الموضوعات سے فراغت کے بعد بعض اعزہ اور دوستوں کے اصرار پر لکھی ہے۔

اس کتاب میں ان رواۃ کو جمع کیا ہے، جو صفت کذب اور وضع وافتراء سے متصف ہیں اور اس تالیف اور جمع کی غرض یہ ہے کہ اخبار موضوعہ کی معرفت اور ضعفاء ووضعین کا ضبط وتحقیق ہو جائے اور یہ ان کی معرفت میں قانون بن جائے۔

اس کتاب کے شروع میں رموز دیئے ہیں، بعدہ حروف تہجی کے اعتبار سے رواۃ کا ذکر کیا ہے اور آخر میں دو فصلیں کنیتوں اور نسب کے بیان میں ہے۔

(۵) مقاصد جامع الاصول مشتمل باحادیث ستہ۔

(۶) مقاصد الاصول، صحیح بخاری، صحیح مسلم، مشکوۃ المصابیح (ان چاروں) پر حاشیہ۔

(۷) عدۃ المتعبدین۔

(۸) منہاج السالکین:

یہ ابھی مخطوط شکل میں ''مدرسۂ اسلامیہ کنز مرغوب پٹن'' میں موجود ہے، ہر صفحہ پر ۲۱/ سطریں ہیں، البتہ ابتدائی کچھ صفحات ۲۱/ سے کم سطور پر مشتمل ہے، ص: ۲۳۹ پر ایک عبارت مذکور ہے، اس سے پتہ چلتا ہے کہ یہ کتاب ۹۸۰ھ میں لکھی گئی ہے، جب کہ مذکور مخطوطہ (جو پٹن میں موجود ہے) کی اصل سے نقل وکتابت ۱۰۹۲ھ میں بدست مصطفیٰ ابن ابراہیم زادہ ہوئی ہے، کل صفحات ۲۴۹ھ ہے۔

پہلا باب الاعتصام بالکتاب اور الاعتصام بالسنۃ قائم کیا ہے، پھر بدعت اور صحیح اعتقاد

پر فصل قائم کی ہے اور سالک کو اس راہ میں قرآن وسنت کے مطابق چلنے، صحیح اعتقاد اختیار کرتے ہوئے امور بدعت سے اجتناب کی طرف توجہ دلائی ہے، ساتھ ساتھ عبارات فقہیہ بھی ذکر کرتے ہیں۔

ہر ایک عنوان کو قرآن کریم کی آیات ذکر کر کے ثابت کرتے ہیں اور اس کی مدح یا مذمت بیان کرتے ہیں، بعدہ احادیث نبویہ صلی اللہ علیہ وسلم پیش کرتے ہیں، ضرورت کے وقت عبارات فقہ بھی پیش کرتے ہیں۔

چوں کہ اس راہ میں افراط وتفریط سے دور رہتے ہوئے راہ اعتدال پر چلنے کی کتنی ضرورت ہے، اس کو سمجھاتے ہوئے علم کی ضرورت وفضیلت بیان کی ہے اور اس کے بغیر آدمی راہ راست سے نکل جاتا ہے، اس کو سمجھاتے ہوئے فرق ضالہ کے اقوال واعتقادات ذکر کئے، پھر تقوی پر روشنی ڈالتے ہوئے اخلاق ذمیمہ ورذیلہ بیان کرتے ہیں، اس میں منہج یہ ہوتا ہے کہ اس کی مذمت آیات واحادیث سے بیان کرتے ہیں اور اس کی مذمت کی وضاحت کے بعد اس کا علاج ذکر کرتے ہیں۔

اس کتاب میں علامہ نے ضرورت کے مطابق ۶/مقامات پر اپنی ۶/الگ الگ تصنیفات کا ذکر کیا ہے، جن کا کسی سوانح نگار نے تذکرہ نہیں کیا ہے، ہوسکتا ہے کہ زمانۂ کتابت کے بعد قلیل مدت میں نایاب ہوگئی ہو۔ وہ کتب درج ذیل ہیں:

(۱) دریتیم۔ (تجوید میں)

(۲) انقاذ الہالکین وایقاظ النائمین۔

(۳) جلاء القلوب۔

(۴) السیف الصارم۔

(۵)معدّل الصلاۃ۔(تعدیل ارکان صلاۃ میں)

(٦)ذخر المتأهلين والنساء فى تعريف الاطهار والدماء.

اللہ تعالیٰ جزائے خیر دے استاد محترم ومربیٔ مشفق حضرت مولانا اقبال صاحب ٹنکاروی دامت برکاتہم کو کہ جنہوں نے یہ مخطوطہ حاصل کیا اور اس پر ان کی زیرنگرانی ورہنمائی تحقیقی کام جاری ہے، چوں کہ خود بھی کہنہ مشق مصنف اور علمی مشغلہ رکھتے ہیں،اس لئے امید ہے کہ ان کی نگرانی ورہنمائی مہمیز کا کام کرے گی اور راہ سلوک طے کرنے والوں کے لئے یہ کتاب ان شاء اللہ تعالیٰ مفید تر ثابت ہوگی،اللہ تعالیٰ ان کی عمر میں برکت دے اور ان کا سایۂ عاطفت ہم پر بصحت وعافیت تادیر قائم رکھے۔

نوٹ: علامہ کی کچھ کتابوں کے مخطوطات کن کتب خانوں میں ہے،اس کی تفصیل عربی ادبیات میں پاک وہند کا حصہ:۲۸۲ پر موجود ہے۔

وفات: سن ۹۸٦ھ میں علامہ نے فرقۂ مہدویہ کے ہاتھوں جام شہادت نوش کیا، یہ ان سے مسلسل مناظرہ کرکے ان کو گمراہی سے راہ حق پر لانا چاہتے تھے اور اپنی مجالس میں ان کا سختی سے رد کرتے اور ان کو دین سے خارج قرار دیتے،اس فرقہ کو ختم کرنے کے لئے انہوں نے حاکم وقت سے مدد چاہی،لیکن مہدوی لوگوں نے اس سے پہلے چال بازی سے شہید کردیا۔

یہ واقعہ شہادت اجین کے قریب ایک گاؤں میں ٦/شوال المکرّم ۹۸٦ھ میں پیش آیا، بعد میں آپ کی لاش کو پٹن میں لاکر دفن کیا گیا۔(نزہۃ الخواطر:۴/۲٦۵،النوالسافر:۲۹۴، گجرات کے علمائے حدیث وتفسیر:ص:۳۴،تذکرہ علامہ شیخ محمد بن طاہر پٹنی:۱۰/۲۸-۳۲،۸۹،عربی ادبیات میں پاک وہند کا حصہ:ص:۳،۷۲،۸۲،۱۸۳،۲۸۱،۳۹۸)

عبدالوہاب بھروچی

عالم صالح عبدالوہاب بن فتح اللہ بھروچی گجراتی ،آپ شیخ علی متقی کے فیض یافتگاں میں سے ایک ہے، مکہ مکرمہ کا سفر اختیار کیا اور طویل مدت تک شیخ علی متقی کی صحبت میں رہ کر ان سے حدیث پڑھی اور حج وزیارت سے مشرف ہوئے، نیز شیخ محمد بن افلح یمنی اور دیگر کئی علماء سے کسب فیض کیا، آپ کے تلامذہ میں شیخ عبدالحق بن سیف الدین دہلوی کا نام ملتا ہے، ان کے علاوہ اور بھی کئی حضرات نے استفادہ کیا۔ (نزہۃ الخواطر:۵/۲۷۴)

آپ کے مفصل حالات ، تاریخ ولادت ووفات اوراحوال وخدمات دستیاب نہ ہوسکے، ہاں! شیخ علی متقی سے فیض یافتہ لوگوں میں سے ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ دسویں صدی کے علماء میں سے ہیں۔

شیخ عبدالمعطی باکثیر مکی

نام ونسب اور ولادت: آپ کا نام ونسب اس طرح ہے: عبدالمعطی بن حسن بن عبد اللہ باکثیر مکی احمد آبادی، آپ کی ولادت رجب المرجب ۹۰۵ھ میں مکہ مکرمہ میں ہوئی۔

حصول علم واساتذہ: مکہ مکرمہ ہی میں علمائے کرام کی ایک جماعت سے منقولات ومعقولات کا علم حاصل کیا ،کئی ایک علوم میں مہارت حاصل کی، شعروادب میں بھی فنکاری پائی جاتی تھی۔

آپ نے قاہرہ میں اپنے والد کی معیت میں حدیث کا درس شیخ الاسلام زکریا انصاری سے لیا تھا، آپ کے والد حدیث کی قرأت کرتے اور آپ سماعت فرماتے اورانہی سے سماعی سند حاصل کی؛ چوں کہ شیخ زکریا حافظ ابن حجر عسقلانی سے روایت کرتے تھے، اس لئے صاحب تذکرہ اپنے معاصرین پر سند عالی کے ذریعہ فائق ہوگئے، لوگوں نے ان سے سند

لینے کے لئے بھی ہجوم کیا۔

صاحب ''النور السافر'' فرماتے ہیں: میں نے اپنی کم سنی میں ان سے بخاری شریف سنی ہے اور انہوں نے مجھ کو اس کی اجازت بھی دی تھی، چوں کہ یہ اجازت زبانی دی تھی تو والد صاحب نے ان سے خواہش کی کہ اس کا ارجوزہ لکھ دیں، تاکہ دیگر قصائد کے ساتھ رکھ لیا جا سکے، لیکن اللہ تعالیٰ نے اس کی مہلت نہ دی۔

تالیف: آپ نے ایک ضخیم کتاب ''اسماء رجال البخاری'' لکھی، جس میں امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کے شیخ سے حدیث کے راوی صحابی تک کا حال درج کیا ہے، لیکن یہ کتاب پایۂ تکمیل کو نہ پہنچ سکی اگر تکمیل پا جاتی تو دو جلدوں میں ہوتی۔

اوصاف وکمالات: علمائے حدیث میں آپ بلند مقام رکھتے تھے، اس کے ساتھ عربی کے کہنہ مشق شاعر بھی تھے، طبیعت میں ظرافت تھی اور مرتے دم تک زہد وتقوی آپ کا شعار رہا، آپ کے متعلق یہ بھی لکھا ہے کہ ایک ہی مجلس میں کتاب الشفاء کی قرأت کر لیتے تھے، یہ قرأت صبح کی نماز سے لے کر ظہر کی نماز تک ہوتی تھی۔

گجرات میں تشریف آوری: آپ رحمۃ اللہ علیہ ۹۶۳ھ سے قبل ہندوستان تشریف لائے اور سب سے پہلے سورت میں رجب خداوند خان نامی امیر کے ساتھ اور بعد میں احمد آباد میں مشہور عیدروسی خاندان سے منسلک ہوئے۔

وفات: احمد آباد میں ۲۷/ذوالحجۃ الحرام ۹۸۹ھ شب سہ شنبہ میں وفات پائی، احمد آباد کے علاقہ لال دروازہ میں واقع سیدی سعید کی جالی والی مشہور تاریخی مسجد کے بانی سیدی سعید سلطانی بھی شیخ عبدالمعطی کے ہم عصر اور دوستوں میں سے تھے، سیدی سعید کی وفات ۹۸۴ھ میں ہوئی تو انہیں خود اپنی بنائی ہوئی مسجد میں دفن کیا گیا اور پھر چند ہی سال کے بعد ۹۸۹ھ

میں شیخ عبدالمعطی کا انتقال ہوا تو انہیں بھی سیدی سعید کی مسجد میں اپنے مرحوم دوست کے پہلو میں دفن کیا گیا۔(نزہۃ الخواطر :۴/ ۱۸۸، گجرات کے علمائے حدیث وتفسیر :۳۰،۳۱،النور السافر : ۳۹۶،۳۹۷)

شیخ بن عبداللہ عیدروس

ولادت: جزیرۃ العرب کا مشرقی علاقہ حضرموت (یمن) جو ایک مردم خیز خطہ ہے، اسی میں واقع ایک آبادی ''تریم'' میں ۹۱۹ھ میں ولادت ہوئی۔

تَرِیم، حضرموت کے ایک حصہ کا نام ہے، اس کے دوشہروں میں سے یہ ایک شہر ہے، اصل میں یہ ایک قبیلہ کا نام تھا، اسی سے شہر کا نام ہوگیا۔(معجم البلدان :۲/ ۲۸، باب :ت ، ط: دارصادر)

نام ونسب: شیخ بن عبداللہ عیدروسی حسینی حضرمی ہے، حضرموت کا عیدروسی خاندان بھی علوم اسلامیہ کی تاریخ میں شہرت عام رکھتا ہے، ہندوستان میں عیدروسی خاندان کی مختلف شاخیں احمدآباد، سورت وغیرہ میں پروان چڑھیں، جو سادات عیدروسیہ کہلاتی ہیں۔

حصول علم اور اساتذہ: حفظ قرآن کے بعد حصول علم میں مشغول ہوئے، اپنے والد، امام شہاب الدین بن عبدالرحمٰن اور شیخ عبداللہ بن محمد باقشیر سے علم حاصل کیا، پھر یمن تشریف لے گئے اور عدن پہنچے، وہاں شیخ محمد بن عمر باقضام اور دیگر حضرات سے کسب فیض کیا، اس کے بعد اپنے والد کی معیت میں ۹۳۸ھ میں حجاز پہنچے اور حج سے فراغت کے بعد ابوالحسن بکری سے علم حاصل کیا اور مدینہ ہوتے ہوئے تریم واپس لوٹے، ۹۴۱ھ میں تنہا دوسرا حج کیا اور ۳/سال تک طلب علم وعبادت میں لگے رہے اور شیخ شہاب الدین احمد بن حجر ہیثمی، عبداللہ بن احمد فاکہی، عبدالرؤف بن یحیی، محمد بن الخطاب مالکی سے استفادہ کیا، حتی کہ تفسیر، حدیث،

فقہ، عربیت، تصوف اور فرائض وحساب میں ماہر ہوگئے، اس کے بعد زبید میں حافظ عبدالرحمٰن بن دیبغ سے اور شحر میں احمد بن عبداللہ بافضل الشہید سے کسب فیض کیا۔

آپ کو اکثر مشائخ نے اپنی کتب ومرویات میں اجازت عامہ دی اور بہت سوں سے آپ نے خرقہ بھی پہنا، اس کے بعد تریم میں آپ ۱۳؍سال تک مقیم رہے۔

گجرات میں تشریف آوری وخدمات: ۹۵۸ھ میں آپ یہاں تشریف لائے، احمد آباد میں وزیر عماد الملک کے یہاں آپ کو خوب مقبولیت وشہرت ملی؛ لیکن انہوں نے اپنے آپ کو نفع رسانی اور تدریسی خدمات میں ہی لگائے رکھا، یہاں مدت اقامت ۳۲؍سال ہے، اس لئے آپ سے کسب فیض کرنے والے بھی بے شمار ہوئے، ان لوگوں میں سے کچھ نام یہ ہیں: ان کے بیٹے عبدالقادر، پوتا محمد بن عبداللہ سورتی، سید بن علی، احمد بن علی بسکری، عبداللہ بن احمد فلاح، محمد بن احمد فاکہی، حمید بن عبداللہ سندی۔

تصانیف: آپ نے کئی ایک مفید کتابیں تحریر فرمائی، ان میں سے چند یہ ہیں: (۱) العقد النبوی والسیر المصطفوی (۲) الفوز والبشری (۳) قصیدۃ تحفۂ مرید کی دو شرحیں، ایک چھوٹی اور ایک بڑی، بڑی شرح کا نام حقائق التوحید اور چھوٹی شرح کا نام سراج التوحید ہے (۴) مولود شریف، یہ بھی ایک چھوٹی، ایک بڑی ہے (۷) الحزب النفیس (اوراد میں) (۸) نفحات الحکم علی لامیۃ العجم نامکمل (اصطلاحات تصوف میں)۔

وفات: ۱۰؍رمضان المبارک ۹۹۰ھ ہفتہ کی شب میں احمد آباد میں واصل بحق ہوئے، انتقال کے بعد آپ کو اپنے مکان کے صحن ہی میں دفن کیا گیا، جہاں پر آپ کے بیٹے شیخ محی الدین عبدالقادر نے ۹۹۹ھ میں گنبد تعمیر کروایا۔ (النور السافر: ص: ۲۹۹، گجرات کے علمائے حدیث و تفسیر: ص: ۳۱، نزہۃ الخواطر: ۴/ ۱۲۸، عربی ادبیات میں پاک وہند کا حصہ: ص: ۱۸۲)

علامہ قطب الدین نہروالی

گجرات کا علاقہ چوں کہ عرب کے قریب واقع ہوا ہے، بحر عرب اور خلیج عمان کے سوا اور کوئی علاقہ حائل نہیں ہے، اس لئے گجرات کے شہروں میں آمدورفت کثرت سے رہتی تھی ،خصوصا اشاعت اسلام اور اسلامی حکومت کے قیام اور علم پرور سلاطین کے سبب بہت سے عرب خاندان گجرات آ کر بس گئے۔

گجرات کے اس خطے میں نہروالا (جو آج کل پٹن کے نام سے مشہور ہے) بھی ہے، ہندوستانی تاریخ کی بعض کتابوں میں اسے انہل واڑہ لکھا گیا ہے، نہروالا کی سرزمین بہت مردم خیز واقع ہوئی، یہاں اکابر علماء مشائخ اور اصحاب طریقت مقیم رہے۔

قطبی خاندان گجرات میں

تقریبا ساتویں صدی ہجری میں عدن کے باشندوں میں سے ایک عالم گجرات آئے، جن کا اسم گرامی محمد بن اسماعیل بن ابراہیم بن عمر بن محمد تھا، انہوں نے نہروالا (موجودہ پٹن) کو اپنا وطن بنایا، پورے علاقہ میں ان کے تقوی اور پرہیز گاری کا شہرہ تھا۔

ان کے بعد ان کے خاندان کے دوسرے افراد بھی ہجرت کر کے گجرات آنے لگے، ان میں سے ایک شخص علاء الدین ابوالعباس احمد بن شمس الدین محمد بن قاضی خان بہاء الدین محمد بن یعقوب بن حسن بن علی بن محمد العدن رحمۃ اللہ علیہ بھی تھے، ان کی ولادت ۸۷۱ھ میں نہروالا میں ہی ہوئی۔

اسی طرح شیخ محمد بن شیخ احمد کی ولادت بھی ہندوستان میں ہوئی اور وہ بھی اپنے والد کی طرح نہروالی سے مشہور ہوئے، ان کی ولادت ۹۱۷ھ میں مقام لاہور میں ہوئی، جیسا کہ

انہوں نے خود تحریر فرمایا ہے۔

ہمیں یقینی طور پر یہ معلوم نہیں کہ یہ حجاز کب گئے ،البتہ علامہ سخاویؒ ودیگر مؤرخین کی کتابوں سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا خاندان نہروالا میں رہا،مگران کے خاندان کے بعض افراد مختلف زمانوں میں ہجرت کرتے رہے۔

ولادت ونام ونسب: علامہ قطب الدین رحمۃ اللہ علیہ کی ولادت ۹۱۷ھ میں ہوئی۔

علامہ عبدالحی حسنی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

الشيخ العالم محمد بن احمد بن محمد بن محمود الحنفی النهروالی المفتی قطب الدين المکی صاحب الاعلام باعلام بيت الله الحرام ، کان من العلماء المبر زين فی الحديث والفقه والأصلين والانشاء والشعر ولد بلاهور سنة سبع عشرة وتسع مائة واشتغل علی والده بالعلم الخ...

صاحب معجم المصنفین بھی ان کا تذکرہ فرماتے ہیں:

محمد بن احمد بن محمد بن محمود النهروالی الهندی المکی الحنفی قطب الدين مؤرخ فقيه مفسر عالم بالعربية ناظم من تصانيفه البرق اليمانی الاعلام باعلام بيت الله الحرام ، طبقات الحنفية ومناسك الحج. (معجم المؤلفین عمر رضا کحالۃ:۹/۱۷،۱۸)

علامہ خیرالدین زرکلی رحمۃ اللہ علیہ نے سن ولادت کا ذکر نہیں کیا اورسن وفات بھی ۹۸۸ھ لکھی ہے،مگر زیادہ تر تذکرہ نگار ۹۹۰ھ میں وفات لکھتے ہیں۔(الاعلام لخیرالدین الزرکلی

ج:۲،ص:۲۳۴)

بعض مصنفین نے ان کی نسبت النہروانی لکھی ہے، حالانکہ صحیح النہروالی ہے، (لام کے ساتھ) نہروان گجرات میں نہیں ہے۔ (معجم البلدان: ج:۵،ص:۳۲۴،۳۲۷) نہر والا جس کو انہل واڑہ کہا جاتا تھا، گجرات ہندوستان میں ہے، جو آج کل پٹن سے مشہور ہے۔

علامہ قطبی رحمۃ اللہ علیہ کی تعلیم: ان کے والد کا شمار بڑے حنفی علماء میں ہوتا تھا اور گجرات کی اسلامی حکومت میں سلطان محمود شاہ ۸۶۳ھ-۹۱۶ھ کے دور میں منصب قضاء پر فائز تھے، علامہ رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے والد مکرم سے علم حاصل کیا، نہر والا سفر کرنے سے پہلے انہوں نے فارسی زبان سیکھی اور اس میں اتنی قابلیت پیدا کی کہ فارسی اشعار کہنے لگے اور بعض کتابوں کے ترجمے بھی کئے۔

ان کے مکہ مکرمہ ہجرت کے ابتدائی زمانہ میں ترکی سلطان کا حجاز پر غلبہ ہو چکا تھا، سلطان امیر الحج کی حیثیت سے اپنے بعض نمائندوں کو مکہ مکرمہ بھیجتے تھے اور فوجی قائدین بھی مکہ آتے رہتے تھے، علامہ قطبی رحمۃ اللہ علیہ کے ان کے ساتھ روابط ہونے لگے، تو انہوں نے ترکی زبان بھی سیکھ لی اور اس میں اتنی مہارت پیدا کر لی کہ ترکی زبان میں شعر گوئی اور تصنیف و ترجمہ پر قادر ہو گئے اور ترکی کے دو مرتبہ سفر کرنے کے سبب اس میں مزید پختگی پیدا ہو گئی؛ بلکہ علامہ جب مصر میں بغرض تعلیم مقیم تھے تو وہاں بھی ترکی زبان میں علم کے حصول میں مدد ملی ہو گی، اس لئے کہ اس زمانہ میں مصر میں عثمانی حکومت ہی کا دور تھا۔

ان کی عربی تعلیم کا سلسلہ اس طرح ہے کہ انہوں نے فقہ حنفی اپنے والد مکرم سے حاصل کیا اور مکہ مکرمہ طالب علمی ہی کے زمانہ میں پہنچے؛ کیوں کہ ان کی عمر ابھی پندرہ سال سے بھی کم تھی کہ یہ سفر ہوا تھا، مکہ مکرمہ میں بعض مشاہر علماء سے شرف تلمذ حاصل ہوا، مثلاً شیخ محبّ

الدین محمد بن عبدالعزیز بن عمر بن محمد بن نہد الہاشمی المکی رحمۃ اللہ علیہ، جو مکہ کے مشہور مؤرخ تھے، نیز شیخ محبّ الدین احمد بن محمد النویری العقیلی رحمۃ اللہ علیہ جو مسجد حرام کے خطیب تھے، ان کے علاوہ دیگر علماء سے بھی استفادہ فرمایا، علاوہ ازیں مؤرخ یمن شیخ عبدالرحمٰن جو صاحب تصانیف عالم تھے؛ان کے اساتذہ میں ہے۔

پھر۹۱۶ھ میں جب کہ آپ کی عمر چھبیس سال کے قریب ہوئی تو طلب علم کے لئے مصر روانہ ہوئے، اس دور میں مصر علماء وفضلاء سے بھرا پڑا تھا اور وہاں بڑے بڑے مشائخ کے چشمۂ فیض جاری تھے، علامہ قطبی کے الفاظ میں کانت مصر مشحونة بالعلماء العظام مملوئة بالفضلاء الفخام میمونة بیمن برکات المشائخ الکرام کأنها عروس تتهادی بین اقمار و شموس، مصر بڑے بڑے علماء اور نامور فضلاء سے بھرا ہوا تھا اور بڑے بڑے مشائخ کی برکتوں سے معمور تھا، گویا کہ مصر ایک دلہن تھی، جو چاند اور سورج کے درمیان چل رہی تھی۔

مصر میں انہوں نے بڑے بڑے علماء سے استفادہ کیا، ان کے اساتذہ میں شیخ عبدالحق السنباطیؒ، شیخ محمد تونسی، شیخ ناصر الدین اللقانیؒ وغیرہ ہیں اور مشائخ میں شہاب الدین احمد بن موسی بن عبدالغفار المغربی ثم المصری نزیل حرمین شریفین، (ان کے والد سلطان غوری کے دیوان میں ارباب قلم میں تھے) شیخ احمد نے قہوہ کے بارے میں ایک کتاب بھی لکھی تھی، الجزیری حنبلی رحمۃ اللہ علیہ نے جس کا اختصار بھی کیا تھا۔

شیخ قطبی رحمۃ اللہ علیہ ۹۶۴ھ میں ترکی کے سفر کے درمیان ملک شام سے بھی گزرے ہیں اور وہاں کے مشاہر علماء سے ملاقات کر کے استفادہ کیا، ان میں شیخ الاسلام الغزی رحمۃ

اللہ علیہ بھی ہیں، ان سے پہلے مکہ میں کسب فیض کیا اور پھر شام میں بھی استفادہ کیا، ان کے علاوہ علاء الدین بن عماد الدین اور قاضی کمال الدین الحمزاوی رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ سے بھی فائدہ اٹھایا۔

اس طرح استنبول میں بہت سے ترکی علماء سے ملاقات کر کے استفادہ فرمایا، فارسی، ترکی اور عربی زبانوں میں مہارت اور مختلف ممالک کے مشاہر علماء سے استفادہ کے سبب علامہ قطبی رحمۃ اللہ علیہ کی علمیت میں کافی گہرائی اور ثقافت وسیع ہوگئی تھی اور وہ علم میں اس مقام پر پہنچ گئے کہ ان کی طرف نظریں اٹھنے لگیں، دینی علوم میں کمال کے سبب ان کو مکہ مکرمہ میں منصب افتاء سپرد ہوا اور بالآخر وہاں کے قاضی مقرر ہوئے، ان خدمات کے ساتھ ساتھ انہوں نے مکہ مکرمہ کی ایک ایسی تاریخ لکھی جو آج ایک اہم مرجع شمار ہوتی ہے، اس کے علاوہ اور بھی بہت سی کتابیں تالیف فرمائیں جو آپ کی وسعت علم اور گہری معرفت کی شہادت دے رہی ہیں، ترکی زبان کی واقفیت کے سبب اس عہد کے ترکی حکام کے ہاں بھی ان کو بلند مرتبہ حاصل تھا اور انہوں نے بعض ترکی کتابوں کا عربی ترجمہ بھی کیا، مثلاً ترکوں کے یمن فتح کرنے کی تاریخ عربی میں منتقل کی، یہ کتاب فاتح یمن سنان پاشا نے ان کی خدمت میں پیش کی تھی، آپ رحمۃ اللہ علیہ نے اس کا عربی ترجمہ کیا؛ بلکہ اس میں مفید معلومات کا اضافہ بھی فرمایا، اسی طرح ترکی وزیر لطفی پاشاؒ نے شرح الفقہ الاکبر کا ایک رسالہ مرحمت فرمایا، تو علامہ قطبی نے پہلے اس کا عربی ترجمہ کیا اور پھر وزیر موصوف کی خواہش پر اس کو فارسی زبان میں منتقل کیا، وزیر موصوف بہت خوش ہوئے اور شیخ کے ساتھ انعام واحسان کا معاملہ فرمایا۔

ان کے یہ تصنیفی اور تالیفی نقوش ان کے علمی مقام ومرتبہ کا پتہ دے رہے ہیں، نیز شیخ نے ان کتابوں کے ذریعہ اپنے دور کے طلبہ وعلماء اور حکام کی علمی پیاس بجھانے کی کوشش کی

ہے۔

بیرونی اسفار: مصر کے اسفار: علامہ قطب الدین نے مصر کے متعدد سفر فرمائے، سب سے پہلا سفر گجرات کے وزیر عمدۃ الملک کے ساتھ ۹۴۴ھ میں ہوا، پھر دوبارہ بغرض تعلیم مصر تشریف لاکر مقیم رہے، اس کے بعد ۹۵۴ھ میں سفر ہوا، پھر رمضان المبارک ۹۶۵ھ میں قسطنطنیہ سے واپسی میں چند روز تشریف لائے اور حاجیوں کے قافلے کے ساتھ ساحلی راستہ سے ۳/ذوالحجۃ الحرام کو مکہ مکرمہ واپسی ہوئی۔

شام کے اسفار: اسی طرح ملک شام کے بھی چند سفر ہوئے، ۹۶۵ھ میں قسطنطنیہ جاتے ہوئے ۱۶/محرم الحرام کو مدینہ منورہ سے عازم سفر ہوئے اور ۱۵/صفر المظفر کو دمشق پہنچے، ۱۲/ربیع الاول تک دمشق میں قیام رہا، اس مدت میں وہاں کے علماء اور مشاہر ادباء سے ملاقاتیں رہیں۔

۱۶/ربیع الاول کو حمص میں وارد ہوئے، دوروز قیام فرماکر علماء، مشائخ وادباء سے ملاقاتیں فرمائیں، پھر وہاں سے حلب کا رخ کیا، وہاں علماء وادباء سے ملے، وہاں ان کا بہت اعزاز واکرام ہوا۔

علامہ قطبی جس شہر میں بھی تشریف لے جاتے وہاں کے علماء وادباء سے ملاقات فرماتے، ان کے ساتھ علمی مذاکرہ ہوتا اور ادباء کے ساتھ شعری نشستیں ہوتیں۔

تالیفات: علامہ قطب الدین نے مذہب، ادب اور تاریخ وغیرہ مختلف موضوعات اور فنون کی کتابیں تالیف فرمائی تھیں، ان میں سے کچھ دستیاب ہیں اور بعض ناپید ہوچکی ہیں، بعض تالیفات اور رسائل تو ان کی زندگی میں ہی آگ میں جل کر خاکستر ہوگئے تھے۔

(۱) الاعلام بأعلام بيت الله الحرام .

یہ کتاب مکہ مکرمہ کی تاریخ ہے، اس کے اخیری صفحات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کتاب سلطان مراد بن سلیم کے زمانہ میں لکھی گئی ہے، (۹۸۲-۱۰۰۳ھ) اگرچہ کتاب مکہ مکرمہ کی تاریخ ہے، مگر اخیری قسم میں سلاطین عثمانیہ کی مفصل تاریخ ابتداء سے سلطان مراد تک لکھ دی گئی ہے۔

(۲)البرق الیمانی فی الفتح العثمانی:

(۳)تاریخ مرتب علی سنین.

(۴)تذکرۃ النهر والی.

اس کتاب کے بارے میں سید محمد بن عبداللہ حسنی معروف بکبریت نے اشارہ فرمایا ہے، ''وله تذكرة جامعة''۔

مقدمین کے نزدیک ''تذکرہ'' وہ کتاب ہوتی تھی، جس میں کوئی عالم اہم اور ضروری باتیں لکھ دیتے تھے، جس کو ضرورت کے وقت دیکھا جائے اور اس کی طرف رجوع ہو سکے۔

علامہ قطب الدین کا تذکرہ ان کے قلم سے لکھا ہوا موجود ہے، اس تذکرہ میں ان کے مدینہ منورہ کے متعدد سفر، استنبول کا سفر وغیرہ کا تذکرہ بھی ہے، اس کے علاوہ اس میں بہت سے تاریخی واقعات اور ان کے عربی فارسی قصائد، نیز دیگر شعراء کے اچھے قصائد جمع کر دیئے ہیں، معلوم ہوتا ہے کہ علامہ کے پاس ایک بڑا دفتر تھا، جس میں وقتاً فوقتاً نوادرات ومعلومات بغیر ترتیب کے لکھتے تھے۔

(۵)التمثيل والمحاضرة بالابيات المفردة النادرة:

یہ ادب کی کتاب ہے، خطیب اور مقرر کو جن ابیات کی ضرورت پیش آتی ہے اور علمی مجالس میں جن اشعار سے استشہاد کیا جاتا ہے، ایسے اشعار عرب شعراء کے دیوانوں سے

منتخب کر کے جمع کر دیئے ہیں، اس کتاب کا نام ''تمثال الامثال النادرة'' بھی ہے، اس کا ایک قلمی نسخہ جو ۱۰۶۳ھ کا لکھا ہوا ہے اور جس کے حاشیہ پر بعض تعلیقات ہیں، دار الکتاب المصریہ میں موجود ہے۔

(٦) الجامع لكتب السنة الستة فى الحديث .

علامہ شریف ابو محمد مصطفیٰ بن سنان بن احمد ہاشمی، جو جنابی سے مشہور ہیں؛ انہوں نے اپنی کتاب تاریخ الجنابی میں اس کا تذکرہ فرمایا ہے۔

(٧) زيادات على دستور الاعلام :

اصل کتاب ابن عزم کی ہے، جس میں علامہ قطب الدین نے کچھ اضافے کئے ہیں، اس کا ایک نسخہ حرم مکی کے مکتبہ میں اور دوسرا استنبول میں موجود ہے۔

(٨) طبقات الحنفية:

علامہ نے حنفی علماء کے حالات میں یہ کتاب لکھی تھی، یہ کتاب آگ میں جل گئی، جیسا کہ مصنف ''الکواکب السائرۃ'' نے لکھا ہے، تاریخ الجنابی میں لکھا ہے کہ یہ کتاب چار جلدوں میں تھی۔

(٩) الفتوحات العثمانية للأقطار اليمانية:

ترکی سلطنت نے یمن کی فتح کے لئے جو فوج کشی کی تھی اس کا تذکرہ علامہ نے اس کتاب میں کیا ہے، اس کو لکھ کر سلطان سلیم خان کی خدمت میں پیش کی تھی، پھر اس کا نام تبدیل کر کے البرق اليمانى في الفتح العثماني رکھ دیا، اس کتاب کا عمدہ نسخہ ۹۷۶ھ کا مصنف کی حیات میں لکھا ہوا ''ویانا'' کی پبلک لائبریری میں موجود ہے۔

(١٠) الفوائد السنية فى رحلة المدينة والرومية :

یہ کتاب علامہ کی اہم تالیفات میں شمار کی جاتی ہے، اس میں مختلف ومتنوع معلومات ہے اور علم ومعرفت کے مختلف گوشوں پر روشنی ڈالی گئی ہے، مختلف شہروں اور مقامات کا تذکرہ اور مؤلف کے مشاہدات درج ہیں، اسی طرح مختلف شہروں کے علماء، ادباء اوران کے آثار کا تذکرہ کیا گیا ہے، ۹۶۵ھ کے ترکی کے سفر کے دوران یہ کتاب لکھی گئی ہے، ایک صفحہ میں تقریبا ۳۵/سطریں باریک فارسی رسم الخط میں ہے اور نسخہ مصنف کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے۔

(۱۱) كنز الذكاء في فن العمى:

یہ بھی ادبی کتاب ہے، اس کتاب کے نسخے اسکوریال، برلن اور جامعۃ الحکمہ بغداد (عراق) کے کتب خانہ میں ہے۔

(۱۲) معيار المريدين :

اس کتاب کا ایک نسخہ مکتبہ الفاتح استنبول میں ہے، یہ کتاب ۴۵/صفحات میں ہے، ہر صفحہ ۱۵/سطروں پر مشتمل ہے اور بہترین خط نسخ میں موجود ہے۔

(۱۳) مناسك الحج :

علامہ نے مناسک حج کے موضوع پر یہ کتاب تالیف فرمائی ہے، ان کے علاوہ ان کی دیگر تالیفات عربی اور فارسی زبان میں ہے۔

وفات: عبدالملک عصامی، جو مکہ مکرمہ کے مؤرخ ہیں اور دیگر مؤرخین نے آپ کی تاریخ وفات بروز ہفتہ بوقت اذان فجر بتاریخ ۲۶/ربیع الثانی ۹۹۰ھ لکھی ہے، بعض مکی فضلاء نے قد مات قطب الدين اجل علماء مكه سے نکالی ہے، جس سے ایک سال زائد معلوم ہوتا ہے، اس لئے بعض لوگوں نے سن وفات ۹۹۱ھ شمار کیا ہے۔ (علامہ قطب الدین نہروالی، مختصر حالات وخدمات: ص:۵-۲۴، ط: مجلس معارف کاپودرا)

سید شیخ بن شیخ عبداللہ عیدروسی صادقی یمنی حضرموتی

آپ عالی نسب سادات میں سے ہیں، نسب حضرت امام جعفر صادق رحمۃ اللہ علیہ کو پہنچتا ہیں، حدیث، اسماء رجال، علم الانساب، سیر وتاریخ، اصطلاحات تصوف اور بیان عرفان میں کامل طور پر تبحر اور رسائی رکھتے تھے، داد ودہش اور عفو درگزر طبیعتِ ثانیہ تھی، اپنی مدۃ العمر میں کسی امیر و وزیر کے دروازہ پر نہیں گئے، اپنے عالی خاندان آباء واجداد کا سلسلہ صحیح ہوتے ہوئے قادریہ خانوادہ اور مغربیہ خاندان میں اپنی ارادت اور خلافت کی نسبت قائم رکھتے تھے۔ (مشائخ احمد آباد: ۱۷۷-۱۹۶)

محمد بن احمد الفاکہی

وسیع علم لے کر گجرات میں آنے والے شیخ فاکہی کی شخصیت بھی نمایاں ہے۔

نام ونسب اور ولادت: آپ کا اسم گرامی ونسب اس طرح ہے: محمد بن احمد بن علی حنبلی فاکہی مکی ابوالسعادات گجراتی، آپ کا سن ولادت ۹۲۳ھ ہے۔

حصول علم اور اساتذہ: آپ کو تمام علوم میں مہارت حاصل تھی اور چاروں مسالک کا علم رکھتے تھے، علامہ ابوالحسن بکری، شیخ الاسلام ابن حجر ہیثمی اور شیخ محمد الحطاب آپ کے شیوخ ہیں، ان کے علاوہ مکہ، حضرموت اور زبید کے علماء سے بھی حصول علم کیا، کہتے ہیں کہ آپ کو اجازت دینے والے اساتذہ کی تعداد ۹۰/ سے بھی اوپر ہیں۔

الاربعین للنووی، عقائد نسفی، فقہ حنبلی کی المقنع، اصول فقہ کی جمع الجوامع، الفیہ ابن مالک نحو میں، تلخیص المفتاح معانی وبیان میں، قرأت میں شاطبیہ، سیر میں ابن سید الناس کی نور العیون ازبر تھیں، قرآن مجید سبع قرأت سے حفظ کیا تھا، نظم ونثر دونوں میں آپ کو مہارت تھی۔

تصانیف: کئی ایک مفید رسالے آپ نے نظم ونثر میں لکھے، انہیں میں سے ایک رسالہ آیت الکرسی پر لکھا جو بہت ہی مفید ہے، اس کے علاوہ فقہ شافعی میں نور الابصار شرح مختصر الانوار، ایک رسالہ لغت میں اور ایک جلیل القدر کتاب جو سلاطین میں سے کسی سے منسوب ہے، اپنے زمانہ میں مذکورہ کتابوں کو بڑی پزیرائی حاصل ہوئی۔

اوصاف حمیدہ: طبیعت میں سخاوت اور فیاضی تھی، چنانچہ لوگ کہا کرتے تھے کہ ہم نے ان سے زیادہ سخی نہیں دیکھا، کسی کا قول ہے کہ میں سمجھتا ہوں کہ وارد ہندوستان ہونے والے اشراف عرب میں ہر ایک پر ان کا کچھ نہ کچھ احسان ہے، ان کی عادت تھی کہ روپیہ پیسہ اپنے پاس روکے نہ رکھتے تھے، اس لئے قرض لینے کی نوبت آتی تھی، مزاج میں گرمی تھی، اپنے اصحاب کے ساتھ اتنی تواضع سے پیش آتے تھے کہ خوشامد کی حد کو پہنچتی تھی، سادات آل باعلوی سے حد درجہ عقیدت رکھتے تھے، ان حضرات سے ملاقات کی غرض سے حضر موت کا سفر کیا اور ان کے اکابر سے ملاقات کر کے حصول برکت کیا، ان سے یہ کہتے ہوئے بھی سنا گیا کہ اللہ سے انس، نور کامل ہے اور لوگوں سے انس سم قاتل ہے۔

گجرات میں آپ کی آمد: آپ کی گجرات میں ۲ رمرتبہ تشریف آوری ہوئی، پہلی مرتبہ آپ کی آمد ہوئی تو ایک طویل مدت تک مقیم رہے، لیکن یہ تشریف آوری کب ہوئی، اس کا تذکرہ نہیں ملتا، البتہ ۹۵۷ھ سے پہلے آئے تھے اور پھر ۹۵۷ھ میں اپنے وطن مکہ مکرمہ لوٹ گئے۔

اسی سال آپ نے حج بیت اللہ کی سعادت حاصل کی، پھر مدینۃ المنورہ پہنچ کر زیارت سے مشرف ہوئے، پھر اس کے بعد والے سال دوسرا حج کیا۔

۹۶۰ھ میں یہاں تشریف لائے اور تاحین حیات گجرات ہی میں رہے اور احمد آباد ٹھہرے، پھر ۹۶۳ھ میں سورت چلے گئے اور محبوب حسین عباسی کے بقول وفات تک وہیں رہے۔

وفات: آپ کی وفات ۲۱/ جمادی الاولیٰ بروز جمعہ ۹۹۲ھ میں ہوئی، صاحب نزہۃ الخواطر کے بقول وفات احمد آباد میں ہوئی اور وہیں مدفون ہوئے۔ (نزہۃ الخواطر: ۴/ ۲۵۲-۲۵۴، النور السافر: ۳۰۹، ۳۱۰، گجرات کے علماء حدیث وتفسیر: ص: ۳۲، ہندوستانی مفسرین اور ان کی عربی تفسیریں: ۳۱۳)

عرب سے گجرات میں تشریف لاکر لوگوں کی علمی پیاس بجھانے اور نور اصلاح وہدایت کو جلا بخشنے والوں میں سے ایک شہاب الدین احمد مصری ہیں، یہ دسویں صدی کے علماء میں سے ہیں۔

شہاب الدین احمد بن بدرالدین مصری

نام ونسب اور ولادت: آپ کا نام: احمد بن بدرالدین عباسی مصری، لقب: شہاب الدین اور مسلکاً شافعی ہیں، ۹۰۳ھ میں مصر میں پیدا ہوئے۔

حصول علم اور اساتذہ: جب حصول علم کی عمر کو پہنچ گئے تو اپنے زمانہ کے علماء وشیوخ سے اخذ علم کیا، ان میں سے شیخ الاسلام زکریا انصاری، علامہ برہان الدین بن ابوشریف، شیخ نورالدین مکی، شیخ کمال الدین طویل، شیخ زین الدین غزی اور شیخ نورالدین ملتجی ہیں؛ نیز آپ نے ۹۶۳ھ میں شیخ ابوالعباس طبنداوی بکری سے زبید میں اخذ علم کیا۔

فقہ میں نووی کی منہاج، قرأت میں شاطبیہ، حدیث میں مقدسی کی العمدہ حفظ کی تھیں، اس کے علاوہ اربعین نووی، الاجرومیہ (فی النحو) اور مختصر ابوشجاع یاد تھیں۔

آپ صاحب تصانیف تھے، شاہان گجرات کے نام پر کئی کتابیں تصنیف کی تھیں، علم حرف وفلکیات اور میقات میں ید طولی حاصل تھا۔

اوصاف: نہایت ہی متقی و پرہیز گار تھے، لوگوں سے بہت کم اختلاط اور میل جول رکھتے تھے، کتاب وسنت کو مضبوطی سے تھامنے والے اور سلف صالحین کے طریقہ پر گامزن تھے۔

وفات: ۴ر صفر المظفر کی شب کو علامہ کا احمد آباد میں انتقال ہوا، بوقت وفات عمر قریب ۹۰ر سال تھی، اپنے شاگرد اور رفیق محمد بن عبدالرحیم عمودی کے مزار کے قریب تربت العرب میں دفن کئے گئے، استاذ شاگرد میں بیحد محبت تھی گویا ایک جان دو قالب تھے۔ (النور السافر: ص: ۳۰۸، نزھۃ الخواطر: ج: ۴، ص: ۱۶، ۱۷، یاد ایام: ۴۷)

شیخ احمد مصری کی وفات احمد آباد میں ہوئی، اس سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ انہوں نے آخری عمر گجرات میں ہی گزاری، ان کی گجرات آمد کب ہوئی؟ ان سے کن حضرات نے کسب فیض کیا، اس پر سوانح نگار حضرات نے روشنی نہیں ڈالی ہے، لیکن ۹ر ۱۰ر ویں صدی میں گجرات میں علم بام عروج پر تھا اور گجرات علم حدیث کا مرکز بن چکا تھا اور علوم وفنون وخدمات حدیث میں وہ شیراز ویمن کا مماثل بن چکا تھا، اس لئے یقین کیا جا سکتا ہے کہ حضرت سے متعدد حضرات نے کسب فیض اور اخذ علم کیا ہوگا۔

عبدالکریم گجراتی

عبدالکریم بن محبّ الدین بن علاء الدین خرقانی نہروالی گجراتی مکی، فضل وکمال میں یکتائے زمانہ تھے، آپ کی ولادت احمد آباد میں ۱۹ر شوال المکرّم ۹۶۱ھ، بروز پیر بوقت چاشت ہوئی، چوں کہ نہروالا میں آپ کا خاندان علم وطریقت کے رنگ میں رنگا ہوا تھا، اس

لئے آپ اسی فضا میں پروان چڑھے۔

سفر مکہ اور خدمات دینیہ: آپ نے اپنے والد کے ہمراہ مکہ مکرمہ کا سفر کیا، وہیں آپ کی نشو ونما ہوئی، وہاں اپنے عم محترم مفتی قطب الدین نہروالی کی صحبت کو لازم پکڑا؛ حتی کہ فقہ میں ماہر ہو گئے، شیخ عبداللہ سندی سے بھی علم حاصل کیا اور علامہ ابن حجر ہیثمی سے بھی کسب فیض کیا، آپ ان سے صحیح بخاری کی روایت کرتے ہیں۔

آپ کو مکہ میں ۹۸۲ھ میں منصب افتاء سپرد کیا گیا اور ۹۹۰ھ کے پس وپیش خطابت کی ذمہ داری آپ کے سر ڈالی گئی، مکہ مکرمہ میں واقع مدرسہ سلطانیہ مرادیہ کے والی بنائے گئے اور اس طرح عوام وخواص کی خدمات دینیہ کا موقع ملا۔

تصنیفات: آپ نے بہت ہی عمدہ کتابیں تصنیف کی ہیں، ان میں سے النہر الجاری علی البخاری کے نام سے صحیح بخاری کی نامکمل شرح ہے، نیز ایک کتاب اِعلام العلماء الأعلام ببناء المسجد الحرام کے نام سے تاریخ ہے، یہ ان کے عم محترم کی مختصر تاریخ ہے، جس میں انہوں نے ضرورت کے مطابق اہم معلومات کا اضافہ کیا ہے۔

اوصاف وکمالات: آپ کا حافظہ ومذاکرہ بہت ہی عمدہ وتیز تھا، فقہ کے ماہر، احکام وقواعد فقہیہ میں بھی فرد فرید تھے، اس کے نکات کو سمجھنے والے اور اسرار وغوامض کو کھول کر واضح کرتے تھے، اخبار ووقائع اور علماء کے احوال وسوانح کا استحضار تھا، بحث ومباحثہ میں انصاف پسند اور غیر جانب دار تھے۔

وفات: آپ کی وفات ۱۵/ذوالحجہ الحرام ۱۰۱۴ھ بروز بدھ غروب شمس سے پہلے ہوئی اور معلاۃ میں تدفین ہوئی۔ (نزہۃ الخواطر: ۲۵۱/۵)

صبغۃ اللہ بن روح اللہ بھروچی

گجرات میں بھروچ کے باشندے، ایک بلند درجہ کے عالم اور اہل طریقت کی حیثیت سے گجرات، جنوبی ہند اور حجاز میں بڑی شہرت رکھتے تھے۔

نام ونسب اور ولادت: آپ کا نام ونسب صبغۃ اللہ بن روح اللہ بن جمال اللہ حسینی کاظمی بھروچی، مہاجر مدینۃ المنورہ، آپ کے جد امجد اصبہانی ہیں، وہاں سے وہ ہندوستان (گجرات) آئے اور قدیم تاریخی شہر بھروچ میں سکونت اختیار کی، اسی قدیم شہر بھروچ میں عالم کبیر صبغۃ اللہ بن روح اللہ کی ولادت ہوئی، آپ کا سن ولادت کیا ہے؟ اس سلسلہ میں کتب سوانح خاموش ہیں۔

حصول علم اور اساتذہ: آپ کی نشو ونما علمی ماحول میں ہوئی، گجرات میں ہر طرح کی تعلیم حاصل کی اور مختلف علوم میں مہارت بہم پہنچائی، آپ کے اساتذہ میں شاہ وجیہ الدین علوی کا نام ملتا ہے، ان سے آپ نے علمی وروحانی دونوں طرح کی پیاس بجھائی؛ حتی کہ راہ سلوک کی تکمیل کے بعد اجازت وخلافت دی گئی اور اپنے شیخ کے حسب ایماء بھروچ ہی میں درس وتدریس اور وعظ وارشاد میں مشغول ہو گئے۔

آپ کا طریق شطاری تھا اور معارف الٰہیہ کے ساتھ ساتھ مختلف فنون میں یدطولی حاصل تھا، آپ نے علم غزیرا اور زہد وقناعت کی بناء پر خوب شہرت پائی اور آپ عطایا وتحائف شاذ ونادر ہی قبول فرماتے تھے، اس لئے امراء بھی آپ سے بہت متأثر ہوئے، آپ نے مدتوں بھروچ میں خدمت انجام دی۔

زیارت حرمین شریفین، گجرات واپسی وخدمات: اس کے بعد حجاز مقدس پہنچے اور حج

کر کے بھروچ واپسی ہوئی اور ۹۹۹ھ میں مالوہ تشریف لے گئے اور ایک مدت تک وہاں مقیم

رہ کر خدمت اور فیض پہنچاتے رہے، پھر آپ کو زیارت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا شوق دامن گیر

ہوااور اس کا عزم مصمم کرتے ہوئے احمد نگر پہنچے، جہاں برہان شاہ امیر کے پاس ایک سال

تک ٹھہرے رہے۔

دوسری مرتبہ زیارت حرمین شریفین اور اقامت مدینہ منورہ اور خدمات: احمد نگر سے آپ حرمین شریفین کے قصد سے نکل کر بیجا پور پہنچے اور وہاں پانچ سال تک ٹھہرے رہے، پھر حج کے لئے نکل پڑے، تو عادل شاہ نے آپ کے لئے اسباب سفر مہیا کئے اور اپنا ذاتی جہاز بھی دیا جو ان کی مملکت میں کسی جگہ لنگر انداز تھا، شیخ مع اصحاب اس میں سوار ہو کر مکہ مکرمہ پہنچے اور ۱۰۰۵ھ میں حج بیت اللہ سے سرفراز ہوئے، پھر مدینہ منورہ چلے گئے اور جبل احد کو جائے اقامت بنا کر درس وتدریس اور مریدین کی اصلاح وتربیت میں لگ گئے اور آپ سے بہت سوں نے اکتساب فیض کیا۔

آپ سے کسب فیض کرنے والوں میں سید امجد مرزا، سید اسعد بلخی، احمد بن علی بن عبد القدوس شناوی، ابو بکر بن احمد بن قعود نسفی مصری، عبداللہ بن ولی حضرمی، محمد بن عمر بن محمد حضرمی، ابراہیم ہندی، محی الدین مصری، شیخ بن الیاس کردی، ملا نظام الدین سندھی، عبدالعظیم محمد حنفی مکی، حبیب اللہ ہندی بیجا پوری وغیرہم ہیں۔

تصنیفات: مولانا نے تفسیر بیضاوی پر اپنا حاشیہ مدینہ منورہ میں تصنیف کیا تھا، اس حاشیہ کا واحد قلمی نسخہ کلکتہ کی ایشیاٹک سوسائٹی کے کتب خانہ میں محفوظ ہے، ڈاکٹر سالم قدوائی

اس کے بارے میں لکھتے ہیں کہ یہ حاشیہ صرف سورۂ فاتحہ تک کی تفسیر پر منحصر ہےاور بظاہر یہ نظر آتا ہے کہ مولانا اسے مکمل نہیں کر سکے تھے، البتہ اس کا مقدمہ بڑی اہمیت رکھتا ہے، جس میں علم تفسیر کے معنی ومفہوم اور اس کی شرائط بیان کی ہیں، اس حاشیہ میں ۱۹۵/اوراق ہیں، جس میں سورۂ فاتحہ کو چھوڑ کر دیگر تمام اوراق مقدمہ پر مشتمل ہے۔

حاشیۂ بیضاوی کے علاوہ آپ کی چند اور کتابوں کے نام بھی ملتے ہیں: (۱) ارادۃ الدقائق فی مرآۃ الحقائق (۲) کتاب الوحدۃ (۳) مالایسع للمرید ترکہ کل یوم من سنن القوم ، مذکورہ تین کتاب کے علاوہ شیخ محمد غوث گوالیاری کی فارسی میں لکھی گئی کتاب جواہر خمسہ کا مولانا نے جو عربی میں ترجمہ کیا تھا اور جس کا نام تعریب الجواہر الخمسہ لمحمد خطیر الدین المعروف بعوث گوالیاری ہے، اس کے قلمی نسخے ہندوستان میں رامپور اور کلکتہ کے علاوہ بیرون ہند، لنڈن، برلن اور قاہرہ میں بھی ملتے ہیں، ان میں سے کچھ کتابیں علماء عرب کی فرمائش سے لکھی گئیں ہیں۔

وفات: ۱۰۱۵ھ میں وفات پائی اور جنۃ البقیع میں مدفون ہوئے۔ (نزہۃ الخواطر: ۵/ ۱۷۵، یاد ایام: ۹۱، ۱۰۱، ہندوستانی مفسرین: ۳۴۲، سبحۃ المرجان: ۱۲۰، عربی میں پاک وہند کا حصہ: ۱۱۱، ۳۲۳)

محمد بن محمود سورتی

محمد بن محمود دہدار بخاری سورتی، صاحب نزہۃ الخواطر کے یہاں دہدار بخاری میں ایک قصبہ ہے، جو محمد بن محمود کی جائے ولادت ہے، یہی خیال صاحب حقیقت السورت کا ہے، لیکن پروفیسر زبیر قریشی کی تحقیق کے مطابق دہدار ان کا لقب ہے نہ کہ دہدار کے باشندے اور ان کی جائے ولادت شیراز ہونے کے شواہد پیش کئے ہیں۔

ان کے تحصیل علم واستفادہ پر کسی نے روشنی نہیں ڈالی نیز ان کے ابتدائی حالات

اور زندگی کا بھی پتہ نہیں چلتا۔

خواجہ محمد بن محمود نے سورت تشریف لا کر لوگوں کی رہنمائی کی تھی، کامرتج کا راجہ تان سین آپ کا معتقد ہوکر مشرف باسلام ہوا تھا اور اس کا نام بختیار رکھا گیا تھا۔

تصنیفات: آپ کی سترہ مصنفات کا ایک مجموعہ خدابخش لائبریری پٹنہ میں ہے، نیز ان کی کچھ مصنفات رضا لائبریری رامپور میں بھی ہے، آپ کی کچھ کتابیں کتب خانہ حضرت پیر محمد شاہ احمد آباد میں ہے۔

وفات: آپ کا وصال ۱۹/محرم الحرام ۱۰۱۶ھ کو ہوا، سورت میں مدفون ہوئے، ۶۹/سال عمر پائی۔ (حقیقت السورت:۱۵۴، گجرات کے مشاہیر علماء: ص:۲۸-۴۳، نزہۃ الخواطر:۵/۳۶۴، یاد ایام:۹۰)

شیخ احمد بن ابوبکر

شیخ احمد بن ابوبکر جو ابن الشلی یمنی کے نام سے معروف ہیں، تریم میں ۱۰۱۹ھ میں پیدا ہوئے اور قرآن کریم محمد باعیشہ سے حفظ کیا، تجوید ان سے پڑھی، جزری، عقیدۂ غزالیہ، اربعین نوویہ، اجرومیہ کو حفظ کیا، اسی طرح ارشاد، اوقات الاصول اور قطر الندی وغیرہ پڑھیں اور متعدد مشائخ سے آپ نے علم حاصل کیا، جن میں آپ کے والد محترم علامہ ہادی بن عبدالرحمٰن، قاضی احمد بن حسین، شیخ ابوبکر، ان کے بھائی شہاب الدین ابن عبدالرحمٰن، شیخ عبدالرحمٰن بن عبداللہ، شیخ زین العابدین عیدروس، شیخ عبدالرحمٰن السقاف وغیرہ ہیں۔

فقہ، حدیث اور علوم عربیہ میں مہارت حاصل کرنے کے بعد مشائخ سے طرق تصوف میں بھی آپ کو اجازت ملی، اور متعدد مشائخ کی طرف سے آپ کو خرقۂ خلافت بھی ملا، اس کے بعد آپ ہندوستان تشریف لائے اور یہاں ہندوستان میں شیخ، شیخ بن عبداللہ عیدروس

سے تصوف کی تعلیم حاصل کی، اسی طرح سید ابوبکر بن احمد عیدروس کی صحبت میں رہے، نیز شیخ جعفر عیدروس، سید عمر بن عبداللہ باشیبان سے بھی مستفید ہوئے، یہاں ہندوستان میں ملک عنبر سے بھی ملاقات رہی، انہوں نے آپ کو بہت اچھی طرح رکھا اوران کی وجہ سے ان علاقوں کے سلاطین اور ملوک کے یہاں بھی آپ کی شہرت ہوئی، اس کے بعد آپ یمن واپس تشریف لے آئے، لیکن وطن پہنچ کر بھی اس علم وفضل کے باوجود آپ علوم کی تحصیل میں برابر مشغول رہے، قاضی احمد بن حسین سے فتح الجواد اور احیاء العلوم پڑھی، اسی طرح شیخ عبدالرحمٰن السقاف سے لغتِ عربیہ اور حدیث پڑھی اور تصوف کی کتابیں بھی ان سے پڑھیں، پھر حرمین شریفین کا سفر کیا اور وہاں بھی علم کی تحصیل میں مشغول رہے، اس وقت حرمین شریفین میں مقیم جن مشائخ سے آپ نے استفادہ کیا ان کے نام حسب ذیل ہیں:

شیخ عارف محمد بن علوی، شیخ عبدالعزیز زمزمی، شیخ محمد بن علی بن علان، شیخ سعید باقشیر، شیخ محمد بن عبدالمنعم الطائفی، سید احمد بن ہادی، شیخ احمد بن محمد القشاشی۔

مشائخ میں سے اکثر نے آپ کو اپنی مرویات اور تالیفات کی روایت کی اجازت دی، اس کے بعد حرمین شریفین سے واپس لوٹ آئے۔

ماہر علماء سے طویل زمانے تک استفادہ کی بناء پر اللہ تعالیٰ نے آپ کو علم وفضل میں بڑا اونچا مرتبہ عطا فرمایا، آپ حساب اور فرائض کے ماہر اور لغت کے ماہرین میں بہت اونچے مرتبہ پر فائز ہوئے اور آپ سے بھی طلبہ کی ایک بڑی تعداد نے استفادہ کیا۔

وفات: آپ نے تریم میں ۱۰۵۷ھ/ ۱۶۴۷ء میں انتقال فرمایا اور آپ کی ولادت ۱۰۱۹ھ/۱۶۱۰ء میں ہوئی، زنبل کے مقبرہ میں آپ دفن کئے گئے، وہاں آپ کی قبر مشہور ومعروف ہے۔ (مشائخ احمد آباد: ۳۵۸-۳۵۹)

شیخ عباس مشہدی

شیخ عباس حسینی رضوی مشہدی متعدد کتابوں کے مصنف ہیں، ۱۰۰۸ھ میں گجرات پہنچے، یہاں سے حرمین شریفین کا سفر کیا، وہاں پانچ سال مقیم رہے، پھر ۱۰۲۶ھ میں واپس احمد آباد تشریف لے آئے اور یہاں سکونت پذیر ہوگئے۔

آپ صاحب وجد وحال تھے، آپ نے احمد آباد میں سات ربیع الاول ۱۰۶۳ھ / ۵رفروری ۱۶۵۳ء میں انتقال فرمایا اور احمد آباد میں دفن کئے گئے۔

خاتمہ مرأۃ احمدی میں ہے: آپ کی قبر منجھوری میں ہے، آپ صاحب تصنیف بزرگ تھے، سلوک وتصوف میں کامل اور مشہد کے رضوی سادات سے تعلق رکھتے تھے، ۱۰۲۰ھ میں گجرات تشریف لائے، یہاں سے مکہ مکرمہ تشریف لے گئے اور پانچ سال وہاں سکونت پذیر رہے، ۱۰۲۶ھ میں احمد آباد واپس لوٹے اور ۱۰۶۳ھ میں آپ نے وفات پائی۔

منجھوری میں پتھر سے تعمیر کردہ مسجد آپ کی بناء کردہ ہے۔ (مشائخ احمد آباد: ۳۶۳)

جعفر بن علی گجراتی

جعفر الصادق بن عبداللہ بن الشیخ المعروف جعفر الصادق ''النور السافر'' کے مؤلف کے خاندان میں مشہور ومعروف بزرگ گذرے ہیں۔

نام ونسب اور ولادت: جعفر بن علی بن عبداللہ بن شیخ بن عبداللہ بن شیخ بن عبداللہ عیدروس شافعی حضرمی گجراتی، جعفر صادق سے مشہور ہوئے، ان کی ولادت تریم میں ۹۹۷ھ ہوئی۔

حصول علم واساتذہ: ایک مدت تک اپنے والد کی صحبت میں رہے اور مختلف فنون پڑھے، قرآن کریم حفظ کیا، اپنے چچازاد بھائی عبدالرحمٰن سقاف بن محمد عیدروس، ابوبکر بن عبدالرحمٰن بن شہاب، زین بن حسین بافضل، ابوبکر شلی سے بھی علم حاصل کیا اور تفسیر، فقہ، حدیث، تصوف، عربیت، حساب، فلکیات اور فرائض میں مہارت حاصل کی۔

پھر آپ نے حج کیا اور حرمین شریفین میں متعدد علماء سے اخذ علم کیا، پھر اپنے وطن تریم واپسی ہوئی تو لوگوں نے ان کا اکرام واحترام کیا، تریم میں آپ نے ایک مدت تک اقامت کی۔

گجرات کے لئے سفر اور طلب علم: پھر علوم عقلیہ اور (تصوف) میں رتبۂ عالیہ کے حصول کے لئے گجرات کے مشہور شہر سورت پہنچے، وہاں اپنے چچا شریف محمد سے کسب فیض کیا۔

پھر آپ دکن چلے گئے، جہاں وزیر ملک عنبر سے ملاقات ہوئی تو وزیر نے ان کو اپنے ہم نشینوں میں داخل کرلیا، جب علماء آپ سے کسی موضوع پر بحث ومباحثہ کرتے تو آپ ان پر مقابلہ میں غالب آجاتے، پھر انہوں نے تدریس کی طرف توجہ کی اور اس میں مشغول ہوگئے، وہاں انہوں نے اپنے دادا کی کتاب ''العقد النبوی'' کا فارسی میں شاندار ترجمہ کیا اور ملک عنبر کی موت تک وہاں رہے۔

اس کے بعد اس کا بیٹا فتح خان تخت نشین ہوا تو اس نے بھی تعظیم وتکریم میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا، لیکن صاحب ترجمہ اس کے بعد سورت چلے آئے اور اپنے چچا محمد عیدروس کی جگہ سنبھالی، زمینیں بھی عطا کی گئیں، تو وہ اس میں سے واردین پر خرچ کرتے تھے اور آپ کو ولایت میں بھی وافر حصہ ملا تھا اور آپ کی کرامات ومکاشفات بھی ظاہر ہوتے

رہتے تھے، اس لئے بہت جلد مشہور ہو گئے۔ حدیقۃ الاحمدیہ میں ہے کہ شاہجہاں بن جہانگیر نے آپ کو بھروچ ضلع میں واقع کئی دیہات عطیہ میں دیئے تھے۔

تصنیفات: کئی کتابوں کے مصنف اور بلند پایہ صاحب دیوان شاعر تھے، دارشکوہ کی کتابت، سکینہ الاولیاء کا عربی ترجمہ، تحفۃ الاصفیاء کے نام سے کیا، جس کا قلمی نسخہ رامپور میں ہے۔

تحفۃ الاصفیاء کا اسلوب بیان فصیح و بلیغ اور صحیح عربی زبان میں ہے، آپ سید محمد بن عبداللہ کے بھتیجے تھے، گجرات تشریف لاکر کچھ دنوں احمد آباد میں قیام کیا، پھر بندر سورت میں اپنے چچا کے جانشین ہوئے، آپ اپنے اوصافِ حمیدہ کی وجہ سے جعفر صادق ثانی کے لقب سے مشہور تھے، شاہجہاں کو آپ سے بڑی عقیدت تھی، ۱۰۶۴ھ/۱۶۵۴ء میں وصال ہوا اور اپنے چچا کے پاس دفن ہوئے۔

علامہ سخاوی رحمۃ اللہ علیہ نے آپ کے تفوق فی العلوم کو سراہا ہے، جیسا کہ لکھا ہے کہ سید عالم جعفر صادق بن علی بن زین العابدین بن عبداللہ بن شیخ عیدروس حسینی یمنی، شافعی، تریم میں پیدا ہوئے، آپ نے اپنے چچا زاد بھائی سید عبدالرحمٰن سقاف، سید ابوبکر بن عبدالرحمٰن اور شیخ رزین بن حسین بافضل وغیرہ علماء کرام سے پڑھا اور تفسیر، فقہ، حدیث، عربی زبان، تصوف، حساب، فلک اور فرائض وغیرہ تمام علوم میں آپ فائق ہو گئے۔

آپ نہایت سمجھدار اور خوب صورت تھے، ادب و انشاء، نظم و نثر دونوں پر بڑی قدرت رکھنے والے تھے، آپ نے حج کیا اور تریم واپس لوٹے پھر ہندوستان کا سفر کیا اور اپنے عم مکرم شریف محمد سے پڑھا اور پھر مسند تدریس کو آراستہ کیا اور ۱۰۶۴ھ میں آپ نے انتقال فرمایا۔ (مشائخ احمد آباد: ۳۶۴، نزہۃ الخواطر: ۵/ ۱۰۸)

خواجہ حسن محمد

ان کے خاندان کے مورث اعلی شیخ خواجہ عبداللطیف بڑے پایہ کے عالم تھے، ۷۳۶ھ/۱۳۳۵ء میں بمقام بغداد صدارت کے عہدہ پر ممتاز تھے، بنی عبید کے قبیلہ سے تھے، جو مدینہ منورہ کے پاس آباد تھا، یہ بغداد سے گجرات آکر پہلے سرکھیج میں مقیم ہوئے، پھر پٹن نہروالہ چلے گئے، جب احمد آباد بسایا گیا تو شیخ کی وفات کے بعد خواجہ حسن محمد احمد آباد آئے اور تجارت کا پیشہ اختیار کیا، ان کی اولاد میں سے شیخ احمد اور شیخ عثمان سلطان احمد شاہ ثالث کے عہد میں دیوان ہوئے۔

پھر ان کی اولاد سے صفی الدین سیف خان بعہد جہانگیر احمد آباد میں صوبہ دار مقرر ہوئے، پھر شاہجہاں کے عہد میں ان کے لڑکے محمد امین سورت بندر کے متصدی ہوئے اوران کے پوتے شیخ حامد سورت آکر مقیم ہوگئے، ۱۰۵۳ھ/۱۶۴۳ء میں ان کو عمدۃ التجار کا خطاب ملا، چوں کہ یہ بہت بڑے عالم تھے اور دولت کے ساتھ علم کا ذوق تھا، ایک بڑا کتب خانہ بھی ان کے پاس تھا، جس میں بیس ہزار کتابیں تھیں، ایک سو سات برس کی عمر پا کر ۱۷۰۱ء میں انتقال کر گئے، ان کے صاحبزادے محمد فاضل اسم بامسمی تھے، دولت اور عمر دونوں میں اپنے باپ کے وارث تھے، عمدۃ التجار کے خطاب کے ساتھ بہت سے شاہی عنایات سے مستفیض ہوئے اوران کی مالداری کا حال یہ تھا کہ ساٹھ ہزار فقط زکوۃ ادا کرتے تھے، علمی ذوق اس قدر تھا کہ تیس لاکھ روپیہ خرچ کر کے چالیس ہزار کتابیں اپنے کتب خانہ میں جمع کیں۔ کتابوں کی خرید اوران کی نقل کے لئے ہر بڑے شہر میں آپ کے کارندے مقرر تھے۔

(مشائخ احمد آباد: ۴۰۵-۴۰۶)

مفسر کبیر شیخ یحییٰ بن محمود

شیخ یحیی بن محمود بن محمد چشتی، کبار مشائخ چشتیہ سے تھے،۲۰ر رمضان المبارک ۱۰۱۰ھ مطابق ۱۳ر مارچ ۱۶۰۲ء کو احمد آباد میں ولادت ہوئی، اپنے دادا کے پاس ۲۰ر سال رہ کر حفظ قرآن کریم، علوم دین اور معرفت کو حاصل کیا، پھر انہی کے جانشین ہوئے۔

عرس و میلاد میں سماع بغیر مزامیر کا ذوق تھا، اپنے والد کی حیات میں حج کیا تھا، پھر والد کی رحلت کے بعد دوسری مرتبہ حجاز مقدس پہنچے اور چودہ سال قیام کیا، اس دوران آپ ایک سال مکہ مکرمہ میں گذارتے اور ایک سال مدینہ منورہ میں گذارتے۔

آپ نے تفسیر حسینی کے نام سے بیالیس رسالوں میں ایک تفسیر لکھی، اتوار ۲۷ر صفر المظفر ۱۱۰۱ھ/ ۱۶۸۹ء کو وفات ہوئی، مدینہ منورہ کے قبرستان بقیع الغرقد میں دفن ہوئے۔ (مشائخ احمد آباد: ۳۹۶)

حضرت شیخ یحییٰ مدنی

آپ کا نام محی الدین، لقب یحییٰ مدنی اور کنیت ابو یوسف ہے، آپ کے والد گرامی کا نام شیخ محمود تھا، جس کا سلسلۂ نسب حضرت شیخ کمال الدین علامہ تک یوں پہنچتا ہے، حضرت محمود بن شیخ حسن محمد بن شیخ احمد میاں جیو بن شیخ نصیر الدین ثانی بن شیخ مجد الدین بن شیخ سراج الدین بن شیخ کمال الدین علامہ رحمۃ اللہ علیہ۔

ولادت: آپ کی ولادت بیس رمضان المبارک ۱۰۱۰ھ/۱۶۰۲ء بروز جمعرات ہوئی۔ آپ کی والدہ ماجدہ کا نام بی بی رابعہ ہے، جو شیخ تاج الدین محمد عرف ملک تاجو کی دختر

نیک اختر تھیں، ان کے آباء واجداد قاضی النسب تھے، جنہوں نے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم واشارہ سے احمد آباد سے منتقل ہوکر مدینہ منورہ میں جا کر سکونت اختیار کر لی تھی، اسی وجہ سے آپ کو مدنی کہتے ہیں۔

وصال: آپ کا وصال مدینہ منورہ میں ۲۸؍صفر المظفر ۱۱۲۲ھ/ ۲۸؍اپریل ۱۷۱۰ء کو رات کے تیسرے پہر کے آخری حصہ میں ہوا، فخر الاولیاء میں ۱۱۰۱ھ/ ۱۶۸۹ء لکھا ہے اور مرآت ضیائی میں ۲۷؍صفر المظفر بھی لکھا ہے مگر پہلی بات زیادہ صحیح ہے۔

آپ اپنی زندگی کے آخری چودہ سال مدینہ منورہ میں رہے، آپ کی قبر مبارک مدینہ منورہ میں جنت البقیع میں حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی قبر کے قریب ہے، آپ کے مفصل حالات معارج الولایت فی مدارج الہدایت میں درج ہیں، نیز محمد فاضل بن شیخ فیروز نے بھی جو آپ کے مریدوں میں سے ہیں، ایک کتاب مفتاح الکرامات آپ کے ملفوظات وحالات میں لکھی ہے، جس میں آپ کا مفصل ذکر ہے۔

خلفاء: آپ کے خلفاء بھی بہت تھے، مگر آپ کے مشہور ترین خلیفہ حضرت شیخ کلیم اللہ جہاں آبادی ہیں، جن سے سلسلہ چشتیہ آگے چلا ہے۔

خزینۃ الاصفیاء میں آپ کے حالات اس طرح مذکور ہیں کہ آپ شیخ اعظم چشتی قدس سرہ کے مرید اور خلیفہ تھے، ظاہری اور باطنی علوم حاصل کرنے کے بعد مدینہ منورہ میں حضرت شیخ اعظم قدس سرہ کے مرید ہوئے، وہاں ہی طالبان حق کو بیعت کر کے مقاصد اعلی تک پہنچا دیتے، آپ کے بے شمار مرید اہل کمال میں شمار ہوتے تھے۔ (مشائخ احمد آباد: ۴۳۷، ۴۳۸)

سید ابوبکر بن محسن باعبود سورتی

ابوبکر بن محسن باعبود علوی سورتی، یمن کے مشہور ادیب ہیں، گجرات آکر سورت میں سکونت اختیار کی، آپ کی ایک تصنیف المقامات الہندیہ ہے، جس میں ۵۰ر مقامات ہیں، اس کو ۱۱۲۸ھ میں تصنیف کیا ہے، یہ کتاب دہلی سے چھپی ہے، اس کو پڑھنے سے ان کی انشاء پردازی کا علم ہوتا ہے۔ (نزہۃ الخواطر: ۶/۴، یادایام: ۷۷)

پیر محمد شاہ

پیر محمد شاہ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی قدس سرہ کی اولاد سے تھے، آپ کے آباء واجداد بغداد میں رہتے تھے، ان میں سے بعض حضرات ترک سکونت کر کے ہندوستان آگئے اور بیجاپور میں مقیم ہوگئے۔

آپ کے والد ماجد کا نام امین الدین تھا، پیدائش سے پہلے ہی والد رحلت فرماگئے، ۱۱۰۰ھ میں بمقام بیجاپور پیدا ہوئے، ابھی چھوٹے ہی تھے کہ والدہ کی شفقت سے محروم ہوگئے، آپ کی پرورش کی ذمہ داری پھوپھی کے حصہ میں آئی۔

تعلیم: بنیادی تعلیم آپ کے عم مکرم سید عبدالرحمٰن کے زیر سایہ ہوئی، سات سال کی عمر میں قرآن مجید حفظ کرلیا، پھر حرمین شریفین کا عزم کیا اور وہاں پہنچ کر وہاں کے مشہور اساتذہ سے تحصیل علم کیا۔

سفر حرمین شریفین سے قبل اپنے چچا سید عبدالرحمٰن سے سلوک کی منازل طے کیں اور پھر ان کے مجاز ہوئے اور سلسلہ قادریہ میں لوگوں کو بیعت کرتے تھے۔

مکہ مکرمہ میں: آپ کے چچا اور پیرومرشد نے آپ کو مکہ مکرمہ بغرض علم سفر کرنے کا حکم

دیا تھا، چنانچہ آپ اس مقصد کے لئے بیجاپور سے براہ سورت مکہ مکرمہ پہنچے، مکہ میں اس وقت زبردست علماء اور مشائخ تھے جو تشنگان علم کی پیاس بجھاتے تھے، جن میں یہ حضرات بطور خاص نمایاں خدمات انجام دے رہے تھے: شیخ عبدالرحمٰن بن محمد ذہبی، شیخ مصطفیٰ بن فتح اللہ مکی، شیخ محمد شرنبلالی، شیخ تاج الدین احمد مکی، شیخ شہاب الدین احمد بن محمد دمیاطی، شیخ محمد بن سلیمان مغربی۔

آپ تقریباً چھ سال مکہ مکرمہ میں رہے اور شیخ عبدالرحمٰن، شیخ محمد بن احمد بن سعید، شیخ محمد بن عثمان، شیخ مصطفیٰ بن فتح اللہ مکی کے علاوہ دیگر اساتذہ سے علم حاصل کرتے رہے۔

مدینہ منورہ میں: مکہ مکرمہ میں چھ سال کے بعد آپ نے مدینہ منورہ کا سفر فرمایا اور یہاں بھی تقریباً چھ سال تک قیام فرمایا، اس مدت میں آپ ہمہ تن تحصیل علم میں مشغول رہے، اور وہاں کے مشہور علماء وفضلاء سے مستفیض و مستفید ہوتے رہے، جن میں سے حسب ذیل حضرات قابل ذکر ہیں: مولانا احمد یک دست، سید عبداللہ الحدادی، شیخ علی بن ابراہیم شیروانی شیخ یوسف بن خطیب مدنی۔

حرمین شریفین سے واپسی: حرمین شریفین میں طویل قیام اور تحصیل علوم کے بعد آپ واپس ہندوستان تشریف لائے اور احمد آباد میں قیام فرمایا۔

اوصاف: آپ مادر زاد ولی تھے، بزرگوں کی صحبت اور خدمت کو غنیمت سمجھتے تھے، توکل اور قناعت شعار تھا، دنیا سے بے رغبتی تھی، ہدایا قبول نہ فرماتے اور کسی کے اصرار پر فرماتے کہ فقیروں کے کس کام کی؟ جاؤ لے جاؤ، علوم ظاہری اور باطنی دونوں سے آراستہ تھے۔

وصال: ۲۶/ جمادی الاولیٰ ۱۱۶۳ھ میں آپ کا وصال ہوا اور احمد آباد میں آپ کا مزار مرجع خواص وعوام ہے اور احمد آباد مشہور لائبریری درگاہ شریف حضرت پیر محمد شاہ آپ ہی کی طرف منسوب ہے۔ (مشائخ احمد آباد: ۴۴۸، ۴۵۱)

خیر الدین سورتی

نام ونسب اور ولادت: خیر الدین بن محمد زاہد بن حسن محمد زبیری سورتی، اپنے وقت کے مشہور علماء میں سے ہے، یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے عم بزرگوار زبیر بن عبد المطلب ہاشمی قرشی کی نسل میں سے ہے، سورت ہی میں پیدائش اور نشو ونما ہوئی۔

حصول علم اور اساتذہ، مزید طلب عم میں عرب کا سفر: آپ نے مولانا عبد الغفور اور محمد بن عبد الرزاق حسینی اپچی سے پڑھا اور طریقۂ نقشبندیہ شیخ نور اللہ سے اور ان کے بعد شیخ نصر اللہ سے حاصل کیا، پھر حرمین شریفین کا قصد کیا اور حج وزیارت سے فراغت کے بعد مدینہ طیبہ میں عرصہ تک قیام کیا اور شیخ محمد حیات سندھی سے حدیث پڑھی، وہاں سے آکر اس فن شریف کی خدمت میں عمر صرف کر دی اور پورے پچاس برس تک تعلیم دیتے رہے۔

تصنیفات: آپ صاحب تصانیف بھی تھے، آپ کی کتابوں میں شواہد التجدید، ارشاد الطالبین کے نام ملتے ہیں اور تصوف میں بھی آپ کے رسائل ہیں۔

سید مرتضی زبیدی بلگرامی نے برنامہ میں ان کا ذکر کیا ہے کہ حجاز جاتے ہوئے کچھ دنوں وہ ان کے مدرسہ میں مقیم رہے تھے اور ان سے استفادہ کیا تھا۔

وفات: آپ کی وفات رجب المرجب ۱۲۰۶ھ میں ہوئی اور سورت ہی میں تدفین ہوئی۔ (نزہۃ الخواطر: ۷/ ۱۶۴، یاد ایام: ۱۰۵)

ولی اللہ بن غلام محمد سورتی

ولی اللہ بن غلام محمد سورتی گجراتی برہان پوری، آپ کی ولادت اور نشو ونما گجرات ہی میں ہوئی؛ لیکن ان کے والد برہان پور میں تدریسی خدمات سے منسلک ہوئے تو آپ کی معیت میں وہاں پہنچے اور والد محترم ہی سے سات سال میں کتب درسیہ پڑھی۔

زیارت وحج اور عرب میں طلب علم: حج وزیارت سے فراغت کے بعد عرصۂ دراز تک مقیم رہے اور شیخ ابوالحسن سندھی سے حدیث پڑھی اور جب ۱۱۴۹ھ میں والد کا انتقال ہوا تو گجرات کے مشہور شہر سورت میں آکر بودوباش اختیار کرلی اور سید پورہ دروازے سے باہر سید عنبر کی مسجد میں سکونت اختیار کی، آپ نے علوم دینیہ کی درس وتدریس کی طرف توجہ دی اور اپنے فیض عام سے عوام کو بھی خوب فائدہ پہنچایا اور پوری زندگی رشد وہدایت میں صرف کردی۔

آپ کی ایک کتاب کا نام ملتا ہے : التنبیهات النبویة فی سلوك الطریقة المصطفویة اس میں ابواب زہد وآداب اور اس کے متعلقات کو جمع کیا ہے، یہ دراصل خطیب کی مشکوۃ شریف اور قسطلانی کی المواہب اللدنیہ کا خلاصہ اور نچوڑ ہے، اس کا قلمی نسخہ بانکی پور کلکشن پٹنہ (نمبر ۴۰۶) میں موجود ہے۔

وفات: ۱۱/جمادی الاولی ۱۲۰۷ھ میں وفات ہوئی اور سید عنبر مسجد کے احاطہ میں مدفون ہوئے۔ (نزہۃ الخواطر: ۷/۵۴۳، یادایام: ۱۰۶، حقیقت السورت: ۱۷۸، گجرات کے علماء حدیث وتفسیر: ۵۵،۷۵)

مولانا وصی احمد محدث سورتی

آپ کا وطن راندیر ضلع سورت ہے اور بعضوں کے کہنے کے مطابق لاجپور ہے، آپ کے والد کا نام محمد طیب بن محمد طاہر ہے، آپ کی ولادت راندیر میں ہوئی، آپ کے جدامجد سولہویں صدی عیسوی میں مدینہ منورہ سے سورت بندر پہنچے اور اس راستہ سے گجرات میں داخل ہوئے، آپ کا سلسلہ نسب حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ تک پہنچتا ہے۔

آپ کے حالات سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کے خاندان کے کچھ افراد سلطان شاہ جہاں کی فوج میں ملازمت کررہے تھے اور عنایت اللہ خان کی معیت میں بنگال میں عیسائیوں کے مقابلہ میں شجاعت کے جلوے دکھائے تھے، ان کے والد نہایت متقی تھے اور کپڑوں کی تجارت میں خوب تجربہ تھا اور تجارت کے ساتھ ساتھ دینی خدمت میں بھی لگے رہتے تھے۔

آزادی کی ۱۸۵۷ کی جنگ کے وقت مولانا وصی احمد ۲۱ سال کے نوجوان تھے، اس سے پتہ چلتا ہے کہ آپ کی ولادت ۱۸۳۶ء میں ہوئی، دنیوی تعلیم حاصل کرنے کے بعد والد صاحب کے ساتھ تجارت میں لگ گئے تھے، اس جنگ کے وقت سورت اور اس کے اطراف وجوانب میں لوٹ مار اور ظلم وستم ہوا، دوکانیں لوٹ لی گئیں اور دو حقیقی بھائی گولیوں کے نشان بنا کر شہید کردیئے گئے۔

عرب کی طرف رحلت: مولانا طیب اپنے دولڑکے مولانا وصی احمد، مولانا عبداللطیف اور اہلیہ کو لے کر کسی طرح عراق چلے گئے اور وہاں سے حرمین شریفین گئے اور حج سے فراغت کے بعد کچھ مدت تک مدینہ میں مقیم رہے اور وہیں انتقال فرمایا۔

اس کے بعد مولانا وصی احمد اپنے بھائی اور والدہ کے ہمراہ گجرات آ گئے اور راندیر پہنچے جہاں آپ کی والدہ بھی جاں بحق ہوئیں، اس کے بعد مولانا وصی احمد صاحب طلب علم کے لئے اپنے چھوٹے بھائی کو ساتھ لے کر دہلی چلے گئے اور مدرسہ حسین بخش میں حصول علم کے بعد علی گڑھ میں مولانا لطف اللہ سے تفسیر اور فقہ حاصل کیا، بعدہ حدیث شریف پڑھنے کے لئے سہارن پور چلے آئے اور مولانا احمد علی محدث کے درس میں شامل ہو گئے، اس کے بعد فقہ میں مزید رسوخ ومہارت پیدا کرنے کے لئے مولانا محمد مظہر نانوتوی اور مولانا فیض الحسن صاحب کی خدمت میں ایک مدت تک رہے، اس طرح طویل مدت تک حصول تعلیم میں لگے رہے۔

انہی ایام میں وہ مولانا شاہ فضل الرحمٰن گنج مرادآبادی سے سلسلۂ نقشبندیہ میں بیعت ہو کر منسلک رہے اور خلافت سے نوازے گئے، اس کے بعد اپنے پیر ومرشد مولانا گنج مرادآبادی اور استاذ محترم مولانا احمد علی کے حکم پر روہیل کھنڈ، پیلی بھینت میں قیام کیا اور تاحین حیات وہیں رہے، نیز وہاں مولانا خلیل الرحمٰن سہارن پوری کے تعاون سے ''مدرسۃ الحدیث'' کی بنیاد ڈالی اور اسی درس گاہ میں ۴۰ رسال تک کتابیں پڑھاتے رہے۔

تعلیقات سنن نسائی ، التعلیق المجلی آپ کی علمی شاہ کار ہیں۔ (اکابرین گجرات، گجراتی: ۴/۱۸۲-۱۸۴)

مولانا برکت اللہ گجراتی مکی

سلسلۂ نسب: برکت اللہ محمد بن احمد عرف غلام رسول بن محمد حسین بن محمد عثمان بن علی بن وصی بن محمد بن طاہر بن جمال الدین بن احمد۔ آپ کا سلسلۂ نسب آخر میں قاسم بن محمد بن امیر المؤمنین حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے جا ملتا ہے۔

تعلیم: حدیث، تفسیر، فقہ میں آپ مولانا محمد سعید عظیم آبادی کے شاگردوں میں سے ہے، اور منطق، معانی وریاضی وغیرہ میں مولانا فضل الرحمٰن پدوی ہندوانی، مولانا واجد علی ہندوانی اور مفتی نعمت اللہ لکھنوی کے شاگرد ہیں۔

آپ نے مولانا محمد سعید کے ہاتھوں پر سلسلۂ قادریہ میں بیعت کی تھی، اس کے بعد سہارنپور میں مولانا احمد علی بن لطف اللہ سہارنپوری سے حدیث پڑھ کر بمبئی میں عربی کتابوں کی طباعت وتجارت میں مشہور ہوگئے۔

آپ نے کئی حج کئے اور آخر میں یہاں سے ہجرت کرکے مکہ مکرمہ چلے گئے، وہاں مفتی شیخ احمد دہلان کی شاگردی اختیار کرکے سند بھی حاصل کی۔

وفات: ۱۷/ذوالحجۃ الحرام ۱۳۲۴ھ مطابق ۱۹۰۸ء میں مکہ مکرمہ میں ہوئی اور جنت المعلی میں تدفین ہوئی۔ (اکابرینِ گجرات، گجراتی: ۴/۱۴۰، ۱۴۱)

شیخ عبدالقادر سورتی

عبدالقادر بن محمود بن عبدالقادر بن عبدالصمد باعلظہ شافعی سورتی، آپ کی ولادت ۱۷/رجب المرجب ۱۲۹۳ھ میں ہوئی، اس دور کے مشہور اساتذہ سے علم حاصل کیا، شیخ محمد بن عبدالعزیز مچھلی شہری سے سند حدیث وافتاء حاصل کی، شیخ بخشومیاں کے بقول یہ سند افتاء فقہ شافعیہ وحنفیہ دونوں میں اجازت پر مشتمل تھی۔

سفر حج اور حصول علم: ۱۳۰۸ھ میں آپ زیارت حرمین شریفین سے مشرف ہوئے اور ایک مدت تک وہاں مقیم رہ کر عباقرۂ زمانہ سے علم حاصل کیا، پھر ہندوستان لوٹ کر بمبئی میں اقامت کی۔

آپ کی تصنیفات میں تحفة الفقير الى من اجترء على المسلم بالتكفير ، تحفة المشتاق فی احکام النکاح و الانفاق اور حکم قدم بوسی ہے۔(نزہۃ الخواطر:۸/۲۸۱، حقیقت السورت:۱۲۷)

سید قطب الدین

آپ کا نسب سید عبدالوہاب بن سیدنا عبدالقادر تک پہنچتا ہے، آپ گجرات آ کر مقیم ہو گئے، آپ کے پوتے سید عبدالخالق اور آپ کی خانقاہ اور قبر (روضہ) اندرون شہر جمال پور میں ہے، موضع خانپور اور چوہار ضلع دھولکا آپ کے نام مقرر ہے۔(تاریخ اولیاء گجرات:۶۷)

سید امام الدین

آپ کے والد کا نام کبیر الدین تھا، عراق سے ہند تشریف لاکر ہدایت خلق میں مصروف رہے، صاحب کرامات تھے، اکثر ہندو آپ کے ہاتھ پر مشرف باسلام ہوئے، آپ کی قبر لاہور میں ہے۔

سید امام الدین کی اولاد اپنے نسب کے سلسلہ کو حضرت اسماعیل بن جعفر صادق تک پہنچاتی ہے، چنانچہ اس کا سلسلہ اس طرح ہے، امام الدین بن سید کبیر الدین حسن بن سید صدر الدین محمود بن سید شہاب الدین بن نصیر الدین بن سید شمس الدین بن سید صلاح الدین صالح بن سید اسلام الدین بن سید عبدالمؤمن بن سید خالد بن سید محبّ الدین بن سید محمود بن سید ہاشم بن سید احمد ہادی بن سید جمال مستنصر باللہ بن سید عبدالمجید بن سید غالب بن سید منصور بن سید اسماعیل بانی بن سید نور الدین بن سید اسماعیل بن حضرت جعفر صادق۔

لوگ بیان کرتے ہیں کہ بڑی جماعت سید امام الدین صاحب کے دست حق پرست پر مسلمان ہوئی اور یہ حال آج تک ان کے فرزندوں میں موجود ہے اور اس نومسلم قوم کو

اصطلاح میں مؤمنہ کہتے ہیں اور یہ لوگ اس قدر پختہ اعتقاد رکھتے ہیں کہ اپنی کمائی کا دسواں حصہ ان کی درگاہ میں ان کے فرزندوں کے پاس لاتے ہیں، غرض کہ مال کے علاوہ جان بھی ان کی خدمت میں دے دینا بہتر سمجھتے ہیں، جیسا کہ عہد عالمگیر کے واقعہ قوم مبیتہ سے جوان کے مرید ہیں معلوم ہوتا ہے، بلکہ اگر دس فرزند کسی کے ہوں تو ایک فرزند بھی خدمت کے لئے لے آتے ہیں اور خادموں میں شامل کر دیتے ہیں، آپ کے فرزند تمام گجرات اور دکن میں پھیلے ہوئے ہیں، چوں کہ بعض ہندوانہ رسم کو اس وقت تک ان کے فرزندوں نے اسلام کی طرف مائل کرنے کے لئے باقی رکھ چھوڑے ہیں، اس لئے اس ملک کے مشائخ اس طرف کم متوجہ ہیں اور ان کے عرسوں میں بھی کم جاتے ہیں، سید امام الدین کی قبر موضع کرمنہ میں واقع ہے جو احمد آباد سے پانچ کوس پر واقع ہے۔ (تاریخ اولیاء گجرات:۱۳۳)

شیخ حمید

آپ فضائل وکمال سے آراستہ وپیراستہ تھے، علوم عقلیہ ونقلیہ میں کامل مہارت رکھتے تھے اور حدیث وتفسیر میں بھی خصوصاً آپ کو ید طولی حاصل تھا۔

جس وقت مظفر بن سلطان محمود گجراتی اکبر کے امراء میں سے ایک امیر شہاب خان پر غالب آ گیا اور احمد آباد پر قبضہ کرلیا، خانخاناں امراء کی ایک جمعیت لے کر مقابلہ کے لئے پہنچے اور سلطان مظفر کو شکست دی اور متعدد علماء کو کام پر لگایا، جن میں سے تاریخ معصومی کے مصنف بھی تھے، مصنف تاریخ معصومی نے مشکوۃ اول سے اخیر تک اور دوسری کچھ کتابیں اس وقت گجرات میں رہ کر شیخ حمید سے پڑھیں اور حدیث کی اجازت حاصل کی، شیخ حمید خان اعظم کھوکہ کی رقابت میں حرمین شریفین کی زیارت کے لئے روانہ ہوئے اور مکہ مکرمہ پہنچ کر مقیم ہو گئے اور درس وتدریس میں مشغول ہو گئے اور علماء مکہ میں علماء حدیث میں سے بلکہ

ان کے مقتدا علماء میں سے بن گئے۔(مشائخ احمد آباد:۲۲۸،۲۲۹)

شیخ صدیق بڑودوی

شیخ صدیق بن ابوصدیق بڑودوی گجراتی فقہ اور صلاح وتقوی میں معروف تھے،آپ کی ولادت اورنشو ونما بڑودہ ہی میں ہوئی اور یہیں آپ نے حصول علم کیا،اس کے بعد آپ حرمین شریفین پہنچ کر حج وزیارت سے سرفراز ہوئے اور پھر مدینہ میں سکونت اختیار کر کے وہیں کے ہورہے۔(نزہۃ الخواطر:۷/۲۲۷)

آپ کے زیادہ حالات نہ مل سکے،لیکن امید ہے کہ آپ نے مدینہ میں تعلیم وتعلم اور دینی خدمات میں زندگی بسر کی ہوگی۔

مولانا غلام محمد برہان پوری

آپ کی ولادت احمد آباد میں ہوئی تھی،تحصیل علوم کے بعد پورب کی طرف تشریف لے گئے تھے اور ملک العلماء مولانا نظام الدین پوربی سے (مزید) تعلیم حاصل کی،آپ ہی کی بدولت سورت میں علم قرآت مشہور ہوا تھا،قادریہ سلسلہ میں خرقہ خلافت شیخ حبیب اللہ سے حاصل کیا تھا اور انہوں نے سید عبدالرزاق سے انہوں نے سید شرف الدین سے،انہوں نے احمد ثانی سے،انہوں نے سید علی سے،انہوں نے سید احمد سے،انہوں نے سید قاسم سے، انہوں نے سید شرف الدین سے،انہوں نے شیخ شمس الدین سے،انہوں نے سید عبدالرزاق سے اور انہوں نے غوث اعظم سے حاصل کیا تھا۔مولانا نظام الدین ایک سوبیس سال کی عمر میں پورب میں انتقال فرما گئے۔

جب کہ حضرت مولانا غلام محمد صاحب شاہجہاں آباد تشریف لے گئے،محمد انور خان جو

کہ آپ کا معتقد تھا، بادشاہ حضور کی طرف سے برہان پور کا صوبہ دار مقرر ہوا تو آپ کو اپنے ساتھ برہان پور لے گئے اور آپ کے لئے مدرسہ عالیہ اور خانقاہ تعمیر کردیئے، یہی نہیں بلکہ ۳۶/ہزار روپئے سالیانہ بھی مقرر کردیا، میاں جی سوداگر بھی آپ کے معتقد تھے اور خدمت بجالاتے تھے، مولانا غلام محمد نے اپنے بیٹے شیخ ولی اللہ کو احمد آباد سے بلایا اور ان کی تربیت کی طرف متوجہ ہوئے اور سات سال کی مدت میں تحصیل علم سے فارغ کیا، میر شاہ عبداللہ صاحب اور شاہ فاضل صاحب سورتی نے بھی آپ سے علوم ظاہری اور باطنی حاصل کئے تھے۔

جب نواب نظام الملک آصف جاہ فتح جنگ بہادر صوبہ برہان پور پر متصرف ہوئے تو مولانا غلام محمد صاحب ان سے ملاقات کے لئے نہیں گئے، اس وجہ سے مدرسے کا سالیانہ بند ہوگیا، انور خان نے عرض معروض کرکے دوبارہ بحال کروایا لیکن عاملوں نے آپ کی مہر والی قبض الوصول کی سند (رسید) طلب کی، شاہ فاضل جو آپ کے مدار المہام تھے، انہوں نے آپ کے نام کی مہر بنا کر پیش کی، لیکن آپ نے مہر توڑ کر کہا کہ میں تو گمنام فقیر ہوں، مہر کی مجھے ضرورت نہیں۔

عرب تشریف بری: اس واقعہ کے بعد مولوی ولی اللہ کو حرمین شریفین جانے کی اجازت دی، وہ سورت کی بندرگاہ سے جہاز میں سوار ہوکر بیت اللہ تشریف لے گئے، آپ نے مناسک حج ادا کئے اور حدیث وقرأت کی سند شیخ ابوالحسن محدث مدنی سے حاصل کرکے واپس ہوئے اور والد کی خدمت سے مستفید ہوئے، جب مولانا غلام محمد برہان پوری کی وفات کا وقت نزدیک آپہنچا تو میاں جی سوداگر کو فرمایا کہ میری وفات کے تین دن بعد مال واسباب کے ساتھ روانہ ہوجائیں، آپ کا ۱۱۴۹ھ میں برہان پور میں انتقال ہوا اور میاں جی

سوداگر آپ کے حکم کے مطابق وہاں سے نکل آئے، اس کے بعد مرہٹہ افواج نے برہان پور کو تاخت وتاراج کیا اور بہت سارے تاجروں کا مال تباہ وبرباد ہوا۔

مولوی ولی اللہ

مولانا غلام محمد برہان پوری کے صاحبزادے مولوی ولی اللہ صاحب، والد کی وفات کے چالیس دن بعد سورت تشریف لے آئے اور سید پورہ دروازے کے باہر سید عنبر کی مسجد میں سکونت اختیار کی، آپ نے علوم دینیہ کی درس وتدریس کی طرف توجہ دی اور اپنے فیض عام سے عوام کو نفع پہنچایا، باقی زندگی ہدایت کا راستہ دکھانے میں صرف کی، آپ کی رحلت ۱۱ر جمادی الاولیٰ ۱۲۰۷ھ کو ہوئی اور اسی مسجد میں دفن ہوئے۔ (حقیقت السورت: ۱۷۶-۱۷۸)

سید غیاث الدین

سید غیاث الدین بن سید عبدالجلیل بن سید عبدالوہاب عرف شاہ جی، ان کا روضہ خانپور میں میاں شاہی کے روضہ سے متصل واقع ہے اور آپ کا نسب سید عبدالجبار بن سیدنا عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ تک پہنچتا ہے، سید عبدالوہاب صاحب کے والد گجرات میں تشریف لاکر شہید ہوئے، ان کی قبر موضع سرسیونی ضلع احمد آباد میں ہے، کشف وکرامات آپ کے مشہور ہیں، سید غیاث الدین کا عرس ۱۳ر محرم الحرام اور آپ کے لڑکے سید عبدالجلیل کا عرس ۲۳ر صفر المظفر کو ہوتا ہے۔ (تاریخ اولیاء گجرات: ۷۶)

قبائل عرب کی گجرات آمد

شدہ شدہ عرب اور گجرات کے مابین تعلقات اس قدر گہرے ہوگئے کہ بعد میں عرب کے کچھ خاندان مستقل یہاں مقیم وآباد ہوگئے اور اس کے برعکس بھی ہوا۔ ان خاندانوں نے

یہاں اقامت پذیر ہوکر دینی خدمات جلیلہ انجام دیں اور علمی وعملی میدان میں سرگرم رہے۔

جناب حاجی اسعد البقیلی نے بڑی عرق ریزی سے ''قبائل عرب، حضرموت، یمن اور گجرات'' میں ایسے خاندانوں کی تفصیل جمع کی ہے، جو گجرات میں آباد ہوئے اوراس وقت وہ خاندان کہاں آباد ہے؟اس کو بھی ذکر کیا ہے، انہوں نے (۱۴۱) خاندانوں کا تذکرہ کیا ہے،اس کے علاوہ دوسری کتابوں سے تفصیل لی گئی تو اس کا بھی حوالہ ذکر کیا جائے گا۔

خاندان البقیلی

حضرموت سے مغرب کی طرف عرب ملک یمن کی ریاست کے صدر مقام صنعاء شہر کے قریب شعاب نامی قصبہ میں بقیلی خاندان مقیم تھا، اب یہ صنعاء کے نزدیک حضر میں مقیم ہے۔

یمن میں مشہور شخصیت بقیل بن جسم بن حاسد بن خوان بن نوف بن حمدان ہوئے، جن کی اولاد بقیلی سے پورے یمن میں مشہور ہوئی اور اعلی شخصیتوں کی وجہ سے البقیلی، الہاشدی، الحمدانی خاندان سے بھی پہچانے جاتے ہیں۔

ہجری سن ۱۲۰۰ سے ۱۲۶۰ (۱۸۳۰ء سے ۱۸۴۰ء) کے عرصہ میں یمن سے صالح بن احمد بن مصلح بن اجّان بن مہدی بن حسن بن ارہب بقیلی اپنے خاندانی مسائل کی وجہ سے وطن سے نکلے،انہیں ایدن میں ،سورت شہر (ہندوستان) کے حضرت احمد عیدروس سے ملاقات ہوئی، ان کے ساتھ سورت آبسے، یہاں آنے کے بعد انہیں پتہ چلا کہ ان کے ماموں جان ہادی بن حسین بقیلی بھاؤنگر ریاست میں عرب جمادار ہیں،اس لئے صالح بن احمد بقیلی بھاؤنگر گئے، ماموں جان نے اپنی لڑکی حلیمہ بی بی کے ساتھ ان کی شادی کردی،جس سے انہیں دو اولاد سالم اور مہدی ہوئے ،اب صالح بقیلی سورت میں رہ کر حضرموت اور یمنی عرب کے سپاہی ،عرب بیڑوں میں اپنے آدمی لاکر سورت کے قریب واقع سچین نوابی

ریاست دھرمپور اور وانسدا کے مہاراجاؤں کی ریاستوں میں اپنا عربوں کا بیڑا رکھ کر اسٹیٹ کی حفاظت کا کاروبار چلاتے رہے۔ (قبائل عرب: ۲۳)

خاندان الحمدانی

امام علامہ ابواسحاق ابراہیم بن قیس بن سلیمان الحمدانی الحضرمی العبادی کی صحیح تاریخ پیدائش معلوم نہ ہوسکی، لیکن البیرونی لکھتے ہیں کہ ۵/ہجری کی ابتدائی نصف صدی میں ان کی زندگی کے متعلق معلومات فراہم ہوسکی ہے۔

ابواسحاق الحمدانی فرقۂ عبادیہ (شیعہ فرقہ) سے تھے، ان کے والد قیس بن سلیمان حضرموت میں عالم، زاہد، پرہیزگار تھے، ابواسحاق نے بچپن میں اپنے والد سے تعلیم حاصل کی اور علم ادب وفنون کی تعلیم میں کمال حاصل کیا، ابواسحاق بڑے شاعر ہوئے جن کا ''دیوان حمدانی'' حضرموت میں مشہور رہے۔

ابواسحاق فرقۂ عبادیہ کی اشاعت میں امام عمان مسقط کی مدد کیا کرتے تھے اور حضر موت میں اس کے لئے بڑی جنگیں کی اور حضرموت کے بڑے حصہ میں فرقۂ عبادیہ کا اثر غالب ہوا۔

اسی حمدانی خاندان کے دوسرے فرد ابوالحسن بن محمد الصلیحی الحاسدی الحمدانی مذہب امامیہ کے بڑے عالم تھے، ۴۲۹ھ میں یمن کے علاقے میں اپنی حکومت کا اعلان کیا اور مصر کے خلیفہ العبیدی سے مدد طلب کی، ۴۵۳ھ میں جنگ کر کے فتح حاصل کی، صنعاء شہر کو یمن کا صدر مقام بنایا، ابوالحسن کو الآہول بن نجاح نے قتل کیا۔

البقیلی، الکثیری، القصیری الحمدانی خاندان کی شاخ میں سے ہیں۔

گجرات میں راجکوٹ، ویراول، بھاؤنگر، مہوا، بگسرا، جوناگڈھ اور پوربندر میں

حمدانی خاندان بسے ہوئے ہیں۔

خاندان العمودی: احمد آباد، بھاؤنگر، بوٹاد، جونا گڈھ، وانکانیر، لوناواڑا اور دیوگڈھ باریا میں بسے ہوئے ہیں۔

خاندان بافضل

یمن کے جنوبی علاقہ جبل یافعی، حضرموت سے آکر بسنے والے قبیلہ الیافعی یا بنی حمیری یا بنومسلک بھی کہتے ہیں، اس کا ذیلی قبائلی خاندان بافضل ہے۔

اس خاندان کے ایک فرد الامام العباس سالم بن فضل بن عبدالکریم بافضل شہر تریم میں رہتے تھے، صاحب تصانیف تھے، تعلیم کی غرض سے چالیس سال حضرموت سے باہر سفر کرتے رہے، واپس آکر شہر تریم میں تدریسی اور دینی خدمت کرتے رہے، اس زمانہ میں حضرموت میں فرقۂ عبادیہ اور فرقۂ معتزلہ کا زور تھا، اس کے خلاف انہوں نے جنگ کی۔

خاندان تمیمی

حضرموت کے مشہور قبیلوں میں سے التمیمی مشہور قبیلہ ہے، شہر شبام اور لوئے شبام میں یہ قبیلہ اور اس کے خاندان بسے ہوئے ہیں۔

اس تمیمی خاندان سے حضرت خباب بن ارت تمیمی رضی اللہ عنہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دارارقم میں تشریف فرما ہونے سے پہلے مشرف باسلام ہوئے، تمیمی خاندان ہی کے دوسرے فرد حضرت یعلی بن یحییٰ تمیمی نے فتح مکہ کے دن اسلام قبول کیا۔

حضرموت سے سفر کر کے آنے والے تمیمی خاندان سے ریاست وانسدا میں سعید بن عود تشریف لائے تھے، گجرات میں بروڈہ، بھاؤنگر، مہوا، امریلی، جونا گڈھ، پوربندر، ویراول راجکوٹ، گوندل اور گدو میں دوسرے تمیمی خاندان بھی بسے ہوئے ہیں۔

خاندان ریحان

گجرات میں بھروچ شہر میں بابا ریحان ۴۳۰ھ میں رشد وہدایت کے سلسلہ میں آئے، آپ کا وطن اصلی بغداد ہے، آپ کی وفات ۴ رشعبان المعظم ۴۴۰ھ میں ہوئی، آپ کا مزار بھروچ ہی میں وتجل پور ریلوے اسٹیشن کے سامنے ہے، گجرات میں یہ خاندان ریحان بھاؤنگر اور جونا گڈھ میں مقیم ہے۔

خاندان غنم

حضرموت سے سفر کر کے آنے والے قبائل عرب میں سے خاندان غنم، بڑودہ، راج پپلہ اور کری میں مقیم ہے۔

خاندان الکثیر ی

الکثیر یا الکثیری: یہ حضرموت میں حمدان (شاخ) کا بڑا قبیلہ ہے، جس میں دوسرے کئی قبیلے شامل ہیں۔

حضرموت سے آنے والے یہ خاندان جسدن، احمد آباد، بھاؤنگر، دھسا، امریلی، جونا گڈھ، پوربندر، راجکوٹ، دھوراجی، تروری (راجکوٹ) ویراول، اونا، جامنگر میں آباد ہیں۔ (قبائل عرب حضرموت، یمن اور گجرات: ۴۷)

خاندان حضرمی

یہ خاندان گجرات میں بھاؤنگر، جونا گڈھ، پوربندر، مانگرول، اُمراوی، امراڑا اور پٹن (ویروال) میں آباد ہے۔ (قبائل عرب حضرموت، یمن اور گجرات: ۵۱)

خاندان عیدید

سید عبدالرحمٰن عیدید جو سادات آل باعلوی کی اولاد میں سے تھے، حضرموت سے

ہندوستان تشریف لائے تھے، آپ کے صاحبزادے سید زین عیدید ۱۱۵۴ھ میں رحلت فرما کر اورنگ آباد میں مدفون ہوئے تھے۔

سید عبداللہ عیدید سورت ہی میں رہے، ان کا ۲۵ / جمادی الثانیہ ۱۲۲۰ھ میں انتقال ہوا اور مسجد علی باعبود میں دفن ہوئے، سید عبداللہ عیدید کے صاحبزادے سید احمد عیدید باپ کے بعد قائم مقام ہوئے تھے، آپ اس شہر کے اکابر سادات میں سے تھے، ۳ / رجب المرجب ۱۲۳۸ھ کو انتقال ہوا، آپ کے بھائی سید حسن عیدید ایک مدت تک جاوہ میں رہے تھے اور ۱۲۵۶ھ میں انتقال ہوا تھا۔

ہندوستان کے بادشاہوں کی طرف سے عیدید بزرگوں کے مصارف کے لئے سورت کا موضع بہاٹہ مقرر رہوا تھا۔ (حقیقت السورت: ۱۲۱)

خاندان حداد

سید عبداللہ حداد بھی باعلوی خاندان کی اولاد میں سے ہیں، آپ نے آہن (لوہے) کو موم کر دیا تھا، اس کرامت کی وجہ سے حداد کے نام سے ملقب ہوئے تھے۔

سید عبداللہ بن سید محمد بن سید عبداللہ ہندوستان تشریف لائے اور چوراسی سال کی عمر میں ۱۲ / شوال المکرّم میں رحلت فرما گئے، آپ کے چار بیٹے تھے: سید محمد، سید علوی اور سید زین وغیرہ، سید زین صاحب الحال تھے۔ (حقیقت السورت: ۱۲۲)

خاندان باعلظہ

اس خاندان کے پہلے فرد شیخ محمد باعلظہ ہیں، جو حضرموت سے سورت تشریف لائے، ان کے بعد اس خاندان کے افراد نے خوب دینی خدمات انجام دیں، ان میں سے ایک

مولوی عبدالاحمد ہیں۔

قبیلۂ باعلظہ سے تعلق رکھنے والے میر شاہ عبداللہ صاحب مرحوم کے شاگرد اور عالم وعارف تھے، (عبدالاحمد نام میں شرعی اعتراض ہوسکتا ہے، عرف عام میں عرب قبائل میں بھی کسی کا یہ نام دیکھنے میں نہیں آیا، اس لئے یہ قیاس ہوسکتا ہے کہ آپ کا یہ نام احمد ہوگا اور عرف عوام میں ادب کی وجہ سے آپ کو عبدالاحمد کہتے ہوں گے، آپ کی تحریرات میں بھی احمد ملتا ہے، آپ بھروچ کے قاضی تھے) آپ کی رحلت ۱۷؍جمادی الثانیہ ۱۲۲۵ھ کو ہوئی تھی، آپ کے چار بیٹے تھے، جن میں سے ہر ایک علم اور تقوی میں معروف تھا۔

مولوی عبدالاحمد کے بڑے بیٹے شیخ عبدالقادر اپنے وقت کے بڑے فاضل تھے، آپ کے صاحبزادے شیخ محمود سلمہ تعالیٰ زبدۂ ارباب دین اور خلاصۂ اصحاب یقین ہیں، آپ اعلی خصائل اور بڑے فضائل کے مالک تھے، شیخ محمود نے تحصیل علم اپنے چچا مولوی ابراہیم صاحب سے کی تھی، آپ بے نظیر عالم، صاحب فتوی اور پرہیز گار انسان تھے، تجارت کا کام بھی کرتے تھے، ۲۹؍ربیع الاول ۱۲۶۸ھ کو رحلت ہوئی اور محمد بن عبداللہ العیدروس کے مقبرہ میں دفن ہوئے۔

محمود معلم شیخ محمود: آپ کے تین لڑکیاں اور دو لڑکے تھے، بڑے بیٹے شیخ احمد باعلظہ خوبیوں کے مالک تھے، ان کا ایک لڑکا شیخ محمود ہے۔

شیخ محمود بن شیخ عبدالقادر کے دوسرے بیٹے مولوی عبدالقادر صاحب باعلظہ ہیں، جو علوم معقول ومنقول کے جاننے والے اور علمائے شافعیہ میں ممتاز ہیں، علم فرائض اور دیگر علوم میں سورت والوں کو آپ پر ناز تھا، آپ کی ولادت ۱۷؍رجب المرجب ۱۲۱۳ھ کو ہوئی تھی، آپ نے ۱۳۰۸ھ میں حج کا فریضہ ادا کیا تھا، آپ نے عمدۃ المحدثین مولانا شیخ محمد صاحب

ساکن مچھلی شہر ضلع جونپور سے مذہب شافعیہ اور حنفیہ میں مفتی گری کی سند حاصل کی تھی، حکم قدم بوسی کے موضوع پر آپ کے دو رسالے ہیں، آپ تجارت بھی کرتے تھے۔

مولوی عبدالاحمد کے دوسرے بیٹے مولوی عبدالرحمٰن المعروف میٹھامیاں صاحب عالم وفاضل اور قاری تھے، آپ کبھی سورت اور کبھی حیدرآباد میں رہتے تھے، آپ کے دو بیٹے مولوی حسن صاحب باعلظہ اور مولوی محمد طٰہٰ صاحب باعلظہ تھے، دونوں والد کے منصب پر ممتاز رہنے کے بعد مدت ہوئی کہ رحلت کر چکے۔

مولوی عبدالاحمد کے تیسرے بیٹے شیخ ابومیاں خوش الحان تھے اور علم کی طلب رکھنے والے بھی، ۸/ذوالقعدۃ الحرام ۱۲۴۲ھ کو رحلت کر گئے۔

مولوی عبدالاحمد کے چوتھے بیٹے مولوی محمد ابراہیم صاحبِ عظمت، ناصح ارباب دین وملت اور علوم عرفانی میں کامل تھے، آپ ارباب درس وتعلیم کے بھی سربراہ اور اصحاب تلقین کے سر حلقہ، آپ اس ضلع کے علماء شافعیہ میں سے تھے۔

معلم شیخ ابراہیم صاحب باعلظہ حاجی حرمین شریفین تھے، صاحب باطن وحال اور ورع وتقوی تھے، اگرچہ آپ کا مسلک شافعی تھا؛ لیکن چاروں سنی مسلکوں کی کافی معلومات اور ان کا علم رکھتے تھے، چاروں مسلکوں کے پیچیدہ مسائل آپ کی فکر اور آپ کے علم کے ذریعہ حل ہوجاتے تھے، اوقات کے پابند تھے، آپ سے بہت سارے خرق عادات ظہور میں آئے تھے، آپ بمبئی میں رہتے تھے اور بمبئی کی جامع مسجد کے مدرسۂ محمدیہ کے طلباء کو درس دیتے تھے، چنانچہ آپ کے شاگردوں میں سے جید عالم، مولوی اور صاحب علم حضرات اب تک بمبئی میں موجود ہیں۔

شیخ ابراہیم صاحب باعلظہ کی تصانیف میں: (۱) فقہ شافعی میں تحفۃ الاخوان بہت معتبر

سمجھی جاتی ہے،(۲)نعم الانتباہ بھی آپ کی تصنیف ہے اور حضرت مرحوم نے جامع مسجد بمبئی کے خطیب کی حیثیت سے بھی نام کمایا تھا، بڑے وقار کے ساتھ زندگی گذارنے کے بعد ۲۷/رجب المرجب ۱۲۸۲ھ کو رحلت کر گئے اور محمد بن عبداللہ العیدروس کے مقبرہ میں دفن ہوئے۔

معلم شیخ ابراہیم کے دوسرے بیٹے مولوی عبدالحمید صاحب مرحوم تھے،اپنے والد کی حیات میں جامع مسجد بمبئی کے مدرسہ میں تدریس اور مسجد کے خطیب دونوں عہدوں کو زینت بخشی تھی،علم فرائض اور حساب دانی میں بمبئی اور سورت ہی میں نہیں ؛ بلکہ پورے احاطۂ (صوبۂ) بمبئی میں اپنی نظیر نہ رکھتے تھے، ۱۰/رمضان المبارک ۱۳۰۸ھ کو بمبئی میں انتقال ہوا اور سوناپور کے مقبرہ میں دفن ہوئے۔(حقیقت السورت:۱۲۶-۱۳۰)

عیدروس خاندان

سید ابوبکر سکران بن عبدالرحمٰن السقاف بن محمد بن علی بن فقیہ المقدم محمد رضوان امام جعفر صادق کی اولاد سے تھے، آپ کا وطن حضرموت تریم تھا، ملفوظات ومناقب عیدروسیہ میں مرقوم ہے کہ جب آپ کے گھر میں فرزند سید عبداللہ پیدا ہوئے تو موصوف نے فرمایا ''الیوم عیدروس'' عیدروس کے معنی صوفیٔ کبیر ہے، اس وقت سے یہ خاندان عیدروس کے نام سے یاد کیا جانے لگا، سید عبداللہ عیدروس کا انتقال ۱۴۶۱ء/ ۸۶۵ھ میں ہوا۔

آپ کا مزار عدن میں ہے، سید ابوبکر کے فرزند سید احمد ہندوستان تشریف لائے، آپ کا مزار احمد نگر میں ہے، سید شیخ نے تریم میں ۱۵۱۳ء/ ۹۱۹ھ میں وفات پائی اور سید حسن نے بھی بمقام تریم ۱۵۱۱ء/ ۹۱۷ھ میں وفات پائی، سید شیخ کے بیٹے سید عبداللہ نے بھی بمقام تریم ۱۵۳۷ء/ ۹۴۴ھ میں انتقال کیا، سید عبداللہ کے بیٹے اور سید شیخ کے پوتے سید شیخ بمقام

تریم ۱۵۱۳ء/ ۹۱۹ھ میں پیدا ہوئے، آپ والد بزرگوار کے ہمراہ حج بیت اللہ کے لئے گئے تھے، آپ نے پندرہ سال کی عمر میں کئی تصانیف تصنیف کر لی تھیں، آپ نے ۱۵۳۴ء/ ۹۴۱ھ میں مکہ معظّمہ میں شہاب الدین احمد بن محمد سے حدیث میں سند حاصل کی، موصوف اپنے والد کے انتقال کے بعد ۱۵۳۷ء/ ۹۴۴ھ ہندوستان تشریف لائے اور یہاں سے ۱۵۴۹ء/ ۹۵۶ھ میں ملک حبش گئے، وہاں سے واپسی پر بندر مبارک سورت میں رونق افروز ہوئے اور سورت سے ۱۵۵۱ء/ ۹۵۸ھ میں احمد آباد تشریف لے گئے، احمد آباد میں گجرات کا سلطان محمود بن لطیف خان آپ کا معتقد تھا، ۱۵۵۳ء/ ۹۶۰ھ میں آپ دوبارہ سورت اور بھروچ تشریف لے گئے اور واپس احمد آباد لوٹ گئے، اس سال آپ کے فرزند سید عبداللہ تشریف لائے اور خرقۂ خلافت حاصل کر کے تریم لوٹ گئے، سید شیخ کے دوسرے فرزند سید احمد ۱۵۱۶ء/ ۹۶۸ھ میں تریم سے سورت تشریف لائے اور لوٹ گئے اور دوبارہ ۱۵۶۳ء/ ۹۷۱ھ میں سورت تشریف لائے، اسی سال سید شیخ نے سورت میں مسجد اس جگہ تعمیر کرائی جہاں رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے خواب میں نشاندہی فرمائی تھی۔

۱۵۸۱ء/ ۹۸۹ھ میں سید محمد بن عبداللہ اپنے دادا صاحب کے ایماء سے ہندوستان تشریف لائے، سید شیخ نے اپنے پوتے کی آمد پر عربی میں قصیدہ فرمایا تھا، حضرت شیخ نے ۷۱؍سال کی عمر میں بمقام احمد آباد ۱۵۸۲ء/ ۹۹۰ھ میں انتقال فرمایا۔ (سخنوران گجرات: ۲۵۸، ۲۵۹، گجرات کی تمدنی تاریخ: ص: ۲۰۵، ۴۴۴)

رفاعی خاندان (سورت)

جید صوفی ابوالحسن سید احمد کبیر الرفاعی کے خاندان کے ایک بزرگ سید عبدالرحیم محبوب اللہ رفاعی مدینہ منورہ سے سورت تشریف لائے اور یہاں مستقل سکونت اختیار کر لی اور مدت دراز تک خلق اللہ کی رہنمائی کرنے کے بعد ۱۷۱۹ء/ ۱۱۳۲ھ میں انتقال کیا، موصوف

کا مزار سورت میں بمقام بریاوی بازار واقع ہے، اس زمانہ سے سورت رفاعی سلسلہ کا اہم مرکز قرار پایا اور اسی کو رفاعی خانقاہ کلاں کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ (سخنوران گجرات:۲۶۲)

قادری خاندان

اٹھارویں صدی عیسوی کے اواخر میں قادری خاندان کے ایک بزرگ رشد وہدایت کے سلسلہ میں عرب سے ہندوستان آئے تھے اور بمقام جنجیرہ (قریب بمبئی) مستقل اقامت اختیار کر کے دینی خدمات انجام دیتے رہے اور وہیں انتقال کیا، ان کے دو بیٹے حافظ سید احمد اور سید صالح جنجیرہ سے سورت آئے اور یہاں اقامت اختیار کر لی، حافظ سید احمد نے سورت میں ۱۸۳۶ء/۱۲۵۲ھ میں انتقال کیا، شیخ حسن جی کے قبرستان میں شیخ حسن کے پائنتی میں دفن کئے گئے ہے۔ (سخنوران گجرات:۲۶۵)

مدنی خاندان

اس خاندان کے ایک بزرگ مولانا عیسیٰ مدنی احمد آباد گجرات تشریف لائے، ان کا نسب نامہ یہ ہے: عیسی مدنی بن شیخ حسین محمد بن شیخ عبدالرحیم بن مولانا حماد الدین بن شیخ محمد بن مولانا شیخ احمد شرف جہاں بن شیخ موسی بن شیخ حسن محمد بن شیخ عبدالغفار بن شیخ عثمان بن شیخ شہاب الدین سہروردی قدس سرہ، مولانا عیسی مدنی علامہ شاہ وجیہ الدین قدس سرہ کے خلیفہ تھے، مولانا نے ۱۶۷۹ء/۱۰۹۰ھ میں بتاریخ ۱۵ر رمضان المبارک انتقال کیا، مزار احمد آباد میں علامہ شاہ وجیہ الدین کی خانقاہ میں ہے، مولانا عیسی کے دو بیٹے شیخ احمد اور شیخ ابوالحسن تھے، فرزند اکبر شیخ احمد مدنی عالم وصوفی تھے، موصوف نے رشد وہدایت کے سلسلہ میں سورت مستقل اقامت اختیار کر لی تھی، سن وفات ۱۶۸۵ء/۱۰۹۶ھ ہے، آپ کا مزار بمقام

برہان پور بھاگل دروازہ سورت مرجع خلائق ہے۔ (سخنوران گجرات:۲۶۷،۲۶۸)

شیرازی خاندان

اس خاندان کے بزرگ سید ابراہیم مدنی ۶۱۱ھ میں مدینہ منورہ سے شیرازی چلے گئے تھے، ان کی اولاد سے ایک بزرگ سید محمود شیراز سے سندھ آئے اور سید محمود کی اولاد میں سے احمد شیرازی نے احمد آباد گجرات میں مستقل سکونت اختیار کی، سید احمد گجرات کے جید صوفی وعالم گذرے ہیں، ان کا سلسلۂ نسب چند واسطوں سے امام نقی تک پہنچتا ہے، ان کا مزار بمقام آسٹوریا دروازہ احمد آباد واقع ہے، اس خاندان کے ایک بزرگ سید احمد حسین عرف سید ومیاں دہلی میں شہزادوں کے اتالیق مقرر کئے گئے تھے، ان کی علمی لیاقت کی بنا پر شاہ عالم ثانی نے ۱۱۷۷ھ میں ان کو بھروچ میں عہدۂ قضاء پر فائز کیا تھا، بھروچ میں نواب نیک نام خان رفیع الدولہ والی بھروچ کی صاحبزادی سے ان کی شادی ہوئی تھی۔ (سخنوران گجرات:۳۱۸)

علامہ شاہ وجیہ الدین علوی گجراتی کا خاندان

علامہ کے ایک بزرگ سلطان محمود ثانی گجراتی کے دور حکومت میں عرب سے ہندوستان تشریف لائے اور چاپانیر عرف محمد آباد میں سکونت اختیار کی، شاہ وجیہ الدین قدس سرہ ماہ محرم الحرام ۹۱۰ھ مطابق ۱۵۱۴ء میں بمقام چاپانیر پیدا ہوئے، لفظ ''شیخ'' سے سال ولادت برآمد ہوتا ہے، پانچ سال کی عمر سے تینتیس سال کی عمر تک شاہ صاحب نے کسب علوم ظاہری وباطنی کیا اور اس کے بعد سے آخر عمر تک درس وتدریس اور رشد وہدایت کی خدمت انجام دیتے رہے، کئی تصانیف، شرحیں اور حواشی آپ کی یادگار ہیں، علامہ نے بعمر ۸۸؍سال

۹۹۸ھ مطابق ۱۵۹۵ء بمقام احمد آباد انتقال کیا، مزار محلّہ خانپور میں ہے، اسی جگہ علامہ کے ایک معتقد صادق خان نے مقبرہ، اقامت گاہ اور مدرسہ تعمیر کرایا تھا، علامہ کے بعد ان کے صاحبزادہ نے ایک مدت تک درس وتدریس کی خدمت انجام دی۔

علامہ کی اولاد گجرات، خاندیس، برہان پور، دکن وغیرہ میں پھیلی ہوئی ہے، علامہ کے حقیقی بھائی شاہ برہان الدین نے برہان پور میں سکونت اختیار کرلی تھی، حضرت برہان الدین کے فرزند ہاشم نے بیجاپور میں مستقل اقامت اختیار کرلی تھی۔ (سخنوران گجرات:۳۲۶)

اس کے برعکس یعنی ہندوستان اور اس کی ایک ریاست گجرات سے بھی لوگ عرب میں آباد ہوئے، اس پر روشنی ڈالتے ہوئے ڈاکٹر محمد عبدالوحید لکھتے ہیں:

> قدیم تاریخ میں عرب اقوام کے ہندوستان میں قیام کا کوئی نام ونشان نہیں ملتا اور نہ ان کے زیادہ وقت تک ٹھہرنے کا ثبوت ملتا ہے، اس کے برعکس ہندوستان کے باشندوں کے عرب میں کثرت سے آباد ہونے کا ثبوت ملتا ہے، جو وہاں مستقل طور پر آباد ہوگئے تھے۔
>
> ہندوستانیوں کے ساتھ عربوں کا حسن سلوک، رواداری اور مہمان نوازی بدستور قائم تھی، اس کی وجہ یہ بھی تھی کہ عربوں کو گھر بیٹھے ضروریات کی چیزیں ہندوستانیوں کے ذریعہ مل جایا کرتی تھیں، کئی عرب قبائل نے ہندوستانیوں کو اپنی ''ولاء'' میں لے رکھا تھا، اس کے علاوہ ہندوستان کے لوگ بت پرستی میں جاہل عربوں کے ہم مشرب تھے، اس لئے دونوں ملکوں میں تعلقات اور بھی مضبوط

ہوئے، مذہبی یک رنگی ،عادات وخصائل اور رسم ورواج یکساں
تھے،اس لئے ہندوستانی باشندے عرب میں اپنے قدم جمانے میں
کامیاب ہوگئے۔

میدیعنی بحری ڈاکوسندھ سے گجرات بلکہ اس سے بھی آگے ساحلی مقامات تک پھیلے ہوئے تھےاور خشکی کی کمائی کے ساتھ بحری کمائی بھی کرتے تھے، یہ بدھ مذہب کے پیرو تھے۔
(اردوزبان وادب پرعربی کے اثرات:۱۷-۱۹)

صرف عرب ہی نہیں بلکہ لسان عرب سے بھی مسلمانوں کا گہرا روحانی اور جذباتی تعلق ہمیشہ قائم رہا،عربی زبان سے مسلمانوں کے دینی ،علمی اور ثقافتی رشتے اور دلی تعلق کی وجہ سے برعظیم پاک وہنداوراسی کے ایک صوبہ گجرات میں عربی زبان اور عربی علوم کو ہمیشہ ایک امتیازی مرتبہ حاصل رہااور مختلف موضوعات پرعربی میں بہت سی کتابیں لکھی گئیں۔

کسی ملک کی شہرت اور نیک نامی کا تمام تر دارومدار علوم وفنون کی ترقی پر ہے،اسی وجہ سے جس بادشاہ کا دربار اہل علم سے بھرار ہتا تھااس کا بڑانام ہوتا تھا، چنانچہ آپ کو ہر بیدار مغز فرمان رواکے دربار میں اہل علم نظر آئیں گےاور سچ پوچھئے تو یہی لوگ کسی سلطنت یابادشاہ کو بقائے دوام کی مجلس میں جگہ دلاتے ہیں اور دنیا میں ان کا نام روشن رکھتے ہیں، اگر بکرماجیت کے نورتن نہ ہوتے تو بکرماجیت کوکون جانتا ، اسی طرح ابوالفضل اور فیضی کی بدولت اکبر کو شہرت حاصل ہے۔

گوجر بادشاہوں کا دربار بھی علماء وفضلاء سے بھرار ہتا تھااور بڑی اہم کتابیں ان کے دور میں تصنیف وتالیف ہوئیں،مظفرشاہی،احمدشاہی،محمودشاہی، بہادرشاہی،ظفرالوالہ وغیرہ تاریخ کی کتابیں اسی عہد کی یادگار ہیں،شفائے قاضی عیاض کااسی عہد میں ابن فراش نے فارسی زبان میں ترجمہ کیا،اسی طرح ابن خلکان کا ترجمہ یوسف بن احمد بن عثمان نے کیا،

واگ بھٹ کی کتاب اسٹانگ ردی کا ترجمہ فارسی میں علی محمد بن اسماعیل اساولی کے ذریعہ ہوا، مشکوۃ شریف کو مولانا عبدالمؤمن بن شیخ عبدالوہاب نے فارسی جامہ پہنایا، حصن حصین کو بھروچی نے فارسی میں تبدیل کیا، تصوف میں لوائح اور جام جہاں نماں کی شرح شاہ وجیہ الدین نے، لغت کی مشہور کتاب قاموس کے خطبہ کی شرح قاضی علاء الدین عیسی بن عبد الرحیم نے لکھی، تفسیر مہائمی شیخ علاءالدین علی بن احمد کی ہے، جن کے متعلق اہل علم کا خیال ہے کہ پورے ہندوستان میں فن تفسیر میں ان کا کوئی مقابلہ نہیں کرسکتا، حدیث میں موضوعات کے علاوہ محمد بن طاہر پٹنی نے مجمع بحار الانوار وہ لاجواب کتاب لکھی ہے، جس کی تمام دنیائے اسلام آج تک ممنون احسان ہے، یہ چند کتابوں کے نام محض نمونہ کے طور پر لکھ دیئے ہیں، ورنہ ان کی فہرست بڑی طویل ہے جو آپ آئندہ سطور میں ملاحظہ فرمائیں گے۔ (گجرات کی تمدنی تاریخ:۱۲۲)

ہندوستان اورعربی زبان

ہندوستان میں اسلام کی آمد اور مسلمانوں کی سکونت اور استحکام کے بعد سے عربی زبان وادب کے پڑھنے پڑھانے کا سلسلہ جاری ہے، اسلام اور عربی زبان کا ایسا لازوال رشتہ ہے کہ وہ کسی عہد اور کسی ملک میں بھی منقطع نہیں ہوسکتا، عربی زبان میں قرآن مجید کے نزول نے اس کی ہدایت اور جہانگیری پر آخری مہر لگادی اور اب اس میں کوئی تبدیلی ممکن نہیں، ہندوستانی مسلمانوں نے نہ صرف یہ کہ عربی زبان کی اہمیت محسوس کی، اس کو ہر دور میں سینے سے لگائے رکھا بلکہ اس کی خدمت واشاعت اور توسیع وترقی میں اپنا مخصوص کردار بھی ادا کیا، انہوں نے تصنیف وتالیف کے میدان میں نہ صرف یہ کہ اہل زبان کی رفاقت کی بلکہ کبھی کبھی ان کی رہنمائی اور رہبری کا فرض بھی انجام دیا اور نہ صرف یہ کہ اہل زبان کی ہم زبانی اور ہم سری کی جرأت کی، جو ایک عجمی قوم کے لئے سرمایہ فخر ومباہات ہے، بلکہ کبھی کبھی جدت و اجتہاد سے بھی کام لیا، شاہ راہ عام سے ہٹ کر نئی روشیں پیدا کیں اور قصر ادب میں بعض نئے

نئے دریچے اور باب کھولے۔

عربی لغات ومعاجم کے میدان میں اس خدمت کے ماسوا ہندوستانی علماء نے اور دیگر میدانوں میں بھی اپنی ذہانت اور قوت ایجاد واختراع سے کام لیا۔(اردو زبان وادب پر عربی کے اثرات:۴۰)

عرب وہند کا باہمی علمی استفادہ

ہندوستان میں عربوں کی حکومت کا زمانہ پورے عالم اسلام اور مسلمانوں کے عروج کا عہد زریں تھا اور دیگر اسلامی ممالک کی طرح ہندوستان میں بھی اسلامی علوم وفنون اور اسلامی تہذیب وثقافت کی خیر وبرکت جاری تھی، قرآن ،حدیث، فقہ،شعروادب، فلسفہ، نجوم،طب ،علم کلام اور دوسرے علوم وفنون میں دل چسپی عام تھی ،علماء وفضلاء علمی اور ادبی تحقیق میں مصروف تھے، ہندوستان کے ارباب علم وفن اور باہر کے اہل علم کے درمیان باہمی استفادہ کا عمل جاری تھا، سیاحوں نے اس سرزمین کی سیروسیاحت کی ،جغرافیہ نویسوں نے یہاں کے مقامات کے احوال لکھے،مؤرخوں نے یہاں کے غزوات اور فتوحات محفوظ کر لئے اور تاجروں نے اس ملک کو مشرق سے مغرب تک اپنی تجارت کی منڈی بنایا۔

بزرگ بن شہریار نے عجائب الہند، لکھ کر یہاں کے اخلاقی ، معاشرتی ، اقتصادی ، معاشی اور دینی حالات پر سیاحوں، عالموں،تاجروں اور جہاز رانوں کے واقعات تحریر کئے۔

البیرونی نے 'الہند' لکھ کر یہاں کے عقلی علوم وفنون اور نجوم وریاضی سے عالم اسلام کو واقف کرایا۔

ان کے علاوہ ان سیاحوں اور جغرافیہ نویسوں کا حصہ بھی علمی استفادہ میں اہم مقام رکھتا ہے، جنہوں نے ہندوستان اورسندھ کے شہروں، دیہاتوں ،دریاؤں، صحراؤں اور راستوں کے نام، حالات، مسافات وحدود کو تفصیل سے بیان کیا۔(اردو زبان وادب پر عربی کے

اثرات:۵۰)

ڈاکٹر زبید احمد لکھتے ہیں: ہند میں عربی زبان میں تصنیف وتالیف کا آغاز اس زمانہ سے کچھ ہی قبل ہوا، جب عربی علوم ان تمام ممالک میں زوال پذیر ہونے لگے تھے جہاں گذشتہ زمانوں میں علم وادب کے حیرت انگیز شاہکار پیش کئے جا چکے تھے، ان حالات میں ہند سے عربی تصنیفات میں کوئی تخلیقی حصہ لینے کی توقع نہیں کی جاسکتی؛ تاہم ہند کا جو کچھ حصہ ہے وہ اگرچہ معمولی نظر آتا ہے، لیکن اہمیت میں اس کو کم سمجھنا قرین انصاف نہ ہوگا۔

پھر ہند میں جو شروح وحواشی لکھے گئے ہیں، ان کے متعلق یہ بات قابل ذکر ہے کہ یہ بیرون ہند لکھی جانے والی کتب سے زیادہ مفید اور جامع ہیں، چنانچہ حاجی خلیفہ نے جہاں کہیں بھی عبدالکریم سیالکوٹی کی شرحوں کا ذکر کیا ہے، ان کی بہت تعریف کی ہے۔

برعظیم پاک وہند میں عربی کی حیثیت ہمیشہ ایک غیر ملکی زبان کی رہی ہے، اس لئے قدرتی طور پر یہاں کے مسلمانوں نے عربی ادبیات کی لغتی تشریحات پر ان ممالک کے لوگوں سے زیادہ توجہ اور محنت کی جہاں عربی بولی جاتی ہے، اور یہاں لکھی ہوئی کتب طلبہ کے لئے زیادہ مفید ثابت ہوئی، یہ ویسا ہی ہے جیسے کہ انگریزوں کے لکھے ہوئے نوٹ اور حاشیے ہندی طلبہ کے نقطۂ نظر سے اتنے مفید نہیں ہوتے جتنے ہندیوں کے لکھے ہوئے ہوتے ہیں۔
(عربی ادبیات میں پاک وہند کا حصہ:۱،۲،۶)

برعظیم میں مختلف مسلمان حکومتوں کے عہد میں عربی علوم اور علماء کی مختلف کیفیات رہی، ان میں ایک سلطنت گجرات ہے، اس کا آٹھویں صدی کا دور زرین اور شاندار رہا، اسی پر روشنی ڈالتے ہوئے ڈاکٹر زبید احمد رقم طراز ہیں: احمد شاہ اول نے شہر احمد آباد کی بنا ڈالی تھی جو دارالسلطنت بنا اور ایک بڑے علمی مرکز کی حیثیت سے مشہور ہوا، جہاں بادشاہوں کی فیاضی

وسرپرستی کی بدولت علماء وفقہاء بڑی تعداد میں جمع ہوگئے تھے، اس سلطنت کے قیام سے پہلے زائرین حج بالعموم برّی راستے کو بحری راستہ پر ترجیح دیتے تھے؛ مگر جب سلاطین گجرات کافی طاقتور ہوگئے اور ان کا اقتدار ساحلی علاقوں تک پھیل گیا تو انہوں نے بحری سفر کو منظّم ومحفوظ کردیا، جس سے ایک تو حاجیوں کے لئے بڑی سہولت ہوگئی اور دوسرے بہت سے علماء عرب سے آکر احمد آباد اور دکن کی ریاستوں میں سکونت اختیار کرنے لگے، ان علماء کی آمد سے احمد آباد رفتہ رفتہ اسلامی علوم کا اہم مرکز بن گیا۔

احمد شاہ اول کے عہد میں گجرات آنے والے ایک بڑے عالم وجیہ الدین بن محمد مالکی تھے، جن کو بادشاہ نے ملک المحدثین کا خطاب دیا تھا، جنہوں نے گجرات میں علم حدیث کی تعلیم کو بہت فروغ دیا، ایک اور بیرونی عالم ابن الدمامینی بھی قابل ذکر ہیں، یہ مصر سے ہند آئے تھے اور احمد شاہ اول کے لئے کئی کتابیں لکھی تھی۔

عرب اور گجرات کے درمیان آمد ورفت کی سہولت ہوجانے کی وجہ سے اس عہد میں گجرات میں عربی کے کئی مشہور مصنف ہوئے، مثلاً قاضی چکن (متوفی: ۹۲۰ھ) جنہوں نے فقہ کا ایک مجموعہ مرتب کیا اور محمد بن طاہر پٹنی (۹۸۶ھ) جو ایک مشہور معجم حدیث اور کئی کتابوں کے مصنف ہیں، اور ایک مصنف جو شاہی دربار سے منسلک تھے، خاص طور پر قابل ذکر ہیں، ان کا نام عبداللہ محمد بن سراج الدین عمر نہروالی الغ خانی ہے اور یہ حاجی دبیر کے نام سے مشہور ہے، حاجی دبیر نے گجرات کی ایک تاریخ لکھی تھی، جسے سر ڈینی سن راس نے تین جلدوں میں مرتب کرکے اس پر بہت عمدہ مقدمہ لکھا ہے۔

سلطنت گجرات پر مغلوں کا قبضہ ہوجانے کے بعد بھی بہت عرصہ تک یہاں عربی میں

تصنیف وتالیف کا سلسلہ جاری رہا، اس زمانے کے مصنفین میں شیخ وجیہ الدین، سید صبغۃ اللہ بھروچی، عبدالقادر العیدروس اور نورالدین گجراتی خاص قابل ذکر ہیں، اور ان سب نے کئی تصانیف چھوڑی ہیں۔ (عربی ادبیات میں پاک وہند کا حصہ: ۲۳،۲۲)

گجراتی علماء نے میدان تصنیف وتالیف میں جو قلمی جولانیاں دکھائی ہیں، ان کے وہ علمی شاہ کار آج مطبوع اور مخطوط شکل میں مکتبات کی زینت بنے ہوئے ہیں، انہوں نے مختلف فنون میں طبع آزمائی کی ہے اور ان کی کئی ایک کتابوں سے آج بھی لوگ مستفیض ہورہے ہیں۔ میں ذیل میں ان اسلاف کی تالیفات کا ذکر کرتا ہوں:

چوں کہ قرآن پاک کی تفسیروں کو اسلامی علوم میں اولین اور اہم ترین مرتبہ حاصل ہے اور مسلمان علماء کی بڑی تعداد نے اپنے مقدس مذہبی صحیفے کی تفسیر لکھنا ہمیشہ ایک متبرک فرض تصور کیا، میں بھی اس فن کی تالیفات سے ابتداء کرتا ہوں۔

التفسیر المحمدی: یہ شیخ محمد بن احمد میاں جی بن ناصر گجراتی کی تالیف ہے، جو صوفی بھی تھے اور عالم بھی، بیان کیا جاتا ہے کہ انہوں نے تفسیر بیضاوی کی شرحیں بھی لکھی تھی، ان کا انتقال ۹۸۲ھ میں ہوا۔

اس تفسیر کے لکھنے سے ان کا مقصد آیات قرآنی میں باہمی ربط کو واضح کرنا تھا، یہ تفسیر اتنی جامع اور گراں قدر نہیں جتنی تفسیر رحمانی ہے، جس سے شیخ محمد بن احمد کو اپنی تفسیر لکھنے میں بہت مدد ملی ہے۔

اس کے علاوہ شیخ نورالدین محمد صالح گجراتی نے تفسیر سورۂ بقرہ، حاشیۂ بیضاوی، شیخ وجیہ الدین علوی گجراتی نے حاشیہ بیضاوی؛ نیز صبغۃ اللہ بن روح اللہ حسینی گجراتی مہاجر مکی نے بھی بیضاوی پر حاشیہ لکھا، جو ترکی میں بہت مشہور اور متداول ہے۔

ان کے علاوہ شیخ حسن محمد گجراتی اور جمال الدین بن رکن الدین گجراتی نے بھی بیضاوی پر حاشیہ لکھا، نیز شیخ جلال الدین نے حاشیۂ تفسیر مدارک، حاشیۂ تفسیر محمدی اور حاشیۂ تفسیر حسینی تحریر فرمایا۔

خطیب ابوالفضل گاذرونی گجراتی (۹۵۹ھ) نے بھی حاشیہ علی تفسیر البیضاوی تحریر کیا، جو اسلامیہ کالج پشاور کی لائبریری کے اورینٹل سیکشن کی فہرست لباب معارف الاسلامیہ فی مکتبہ دار العلوم الاسلامیہ میں درج ہے، اسی طرح رضا لائبریری رامپور میں بھی موجود ہے۔

اسی طرح ابوصالح محمد بن احمد میاں جی بن نصیر الدین، جو احمد آباد کے ایک ممتاز عالم تھے، جن کی کتاب التفسیر المحمدی کا ذکر ابھی گذرا، یہ مخطوطہ فہرست عربی مخطوطات کتب خانہ انڈیا آفس لوتھ میں (نمبر:۱۰۳)، ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال کی فہرست مخطوطات میں (نمبر:اے۲۰) اور پیر محمد شاہ لائبریری احمد آباد میں موجود ہے۔

شیخ وجیہ الدین علوی کا حاشیہ علی تفسیر البیضاوی فہرست کتب خانہ آصفیہ حیدر آباد دکن میں (۲۱۰/۴) درج ہے۔

شیخ مبارک بن خضر (۱۰۰۱ھ) دو مشہور بھائی ابوالفضل اور فیضی کے والد، ۹۱۱ھ میں ناگپور میں پیدا ہوئے، احمد آباد سکونت کے زمانہ میں خطیب گاذرونی اور عماد الدین طارمی سے تعلیم حاصل کی۔

انہوں نے منتخب التواریخ اور طبقات شاہ جہانی کے مطابق منبع نفائس العلوم، اور مآثر الکرام کے مطابق منبع عیون المعانی تحریر فرمائی۔

ابوبکر محی الدین عبدالقادر عیدروسی احمد آبادی نے الفتح القدسی فی تفسیر آیۃ

الکرسی (آیت نمبر:۲۵۶ کی تفسیر) تحریر فرمائی، اس کا مخطوطہ فہرست کتب خانہ بوہار میں درج ہے۔

شیخ عبداللطیف بن شاہ جمال نہروالی نے النورالازہر اور الجامع العلمی تصنیف فرمائی، ثانی الذکر فہرست عربی مخطوطات بانکی پور (۱۲۶۲) میں درج ہے۔

سید محمد عبدالمجد محبوب عالم بن سید جعفر احمد آبادی، جو احمد آباد کے ایک ممتاز عالم اور ولی تھے، (ولادت: ۱۰۴۷، وفات: ۱۱۱۱) ان کی تصنیف تفسیر القرآن ہے۔

شیخ نورالدین احمد آبادی کی تالیف التفسیر النور فی السبع المثانی ہے، جو کتب خانہ پیر محمد شاہ لائبریری میں موجود ہے اور دوسری تالیف التفسیر الربانی ہے، اس کا تذکرہ غلام علی آزاد بلگرامی نے مآثر الکرام میں کیا ہے۔

علم حدیث میں علماء گجرات کی عربی تالیفات

بدرالدین دمامینی جن کا وطن مصر ہے، انہوں نے گجرات تشریف لانے کے بعد مصابیح الجامع فی شرح صحیح البخاری تصنیف فرمائی، اس کا تذکرہ نواب صدیق حسن خان نے اتحاف النبلاء بحیاۃ المآثر الفقہاء المحدثین میں کیا ہے۔

شیخ محمد بن طاہر پٹنی کی تالیفات کے مخطوطات مختلف کتب خانوں میں پائے جاتے ہیں، ان میں سے ایک مجمع بحار الانوار ہے، اس کا مخطوطہ بانکی پور (۲/۱۰۰۱، ۹/۶۱۸۸) فہرست مخطوطات انڈیا آفس لوتھ (۱۰۲۳) فہارس مطبوعات ومخطوطات کتب خانہ ندوۃ العلماء لکھنؤ (۱۳۵) کتب خانہ کلکتہ مدرسہ (۸۰) میں موجود ہے، دوسری تصنیف تذکرۃ الموضوعات ہے، جو مخطوط شکل میں ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال کی فہرست میں

(اے ، بی ۱۸) آصفیہ (۱/۶۱۶) بوہار (۴۷) فہرست عربی مخطوطات دہلی انڈیا آفس لندن (۱۶۱) اور بانکی پور (۳۱۵) میں درج ہے، تیسری علمی شاہکار المغنی فی ضبط اسماء الرجال ہے، جو مخطوط شکل میں بانکی پور (۱۳۷) آصفیہ (۱/ ۷۸۸، ۳/ ۳۵۰) اور فہرست بوہار (۲۴۲) نمبر پر درج ہے، اس کے علاوہ رسالة فی لغات المشکوة فہرست مخطوطات بنگال (سی ۷) میں درج ہے۔

شیخ وجیہ الدین علوی گجراتی کی ایک علمی یادگار شرح شرح نخبة الفکر فہرست مخطوطات رضا لائبریری رامپور (۱۲۷) میں درج ہے۔

عبدالصمد بن عبدالرحیم: یہ گیارہویں صدی کے علماء میں سے ہے اور شاہ وجیہ الدین علوی گجراتی کے شاگرد تھے، ان کی ایک کتاب کتاب الفوائد الشمیة فی الاحادیث النبویة آصفیہ (۴/ ۲۵۴) حیدرآباد دکن میں موجود ہے۔

سید محمد عبدالمجد محبوب عالم جعفر احمد آبادی کی تصنیف زینة النکاة فی شرح المشکوة ہے، اس کا ذکر رحمٰن علی لکھنوی نے تذکرۂ علماء ہند میں کیا ہے۔

مولانا نورالدین احمد آبادی نے شرح صحیح البخاری لکھی، اس کا تذکرہ نواب صدیق حسن خان نے اتحاف النبلاء بحیاة المآثر الفقهاء والمحدثین میں کیا ہے، اس کتاب کا پورا نام نورالقاری شرح صحیح البخاری ہے۔

شیخ عبدالعزیز بن شیخ ولی گجراتی کی کاوش ذریعة القبول الی حضرة الرسول ہے جو حیدرآباد دکن کی فہرست کتب خانہ آصفیہ (۴/ ۲۴۴) میں مندرج ہے۔

مولانا ولی اللہ بن غلام محمد سورتی کی کاوش "التنبیهات" ہے اور عمر بن عارف نہروالی

نے الفیض النبوی فی اصول الحدیث و فهارس البخاری لکھی، اس کا ذکر کتب خانہ انڈیا آفس کی فہرست عربی مخطوطات لوتھ (۱۳۱۷) نے کیا ہے، اول الذکر مولانا ولی اللہ نے اپنی کتاب میں ابواب زہد، ابواب آداب اور اس کے متعلقات کو جمع کیا ہے، اور شیخ عمر بن محمد عارف کی کتاب ایک مقدمہ اور ۴۰ ابواب پر مشتمل ہے، مقدمہ میں مصنف نے علم حدیث کی خصوصیات اور باریکیوں کی وضاحت کی ہے اور پھر ۴۰ ابواب میں احادیث کی مختلف اقسام، راویوں کے متعلق جرح وتعدیل کے اصول اور حدیث کی سماع وروایت پر بحث کی ہے اور آخر میں امام بخاری اور ان کی تصنیف پر ایک تنقیدی نوٹ بھی لکھا ہے اور حروف تہجی کے اعتبار سے رواۃ کی ایک فہرست بھی درج کی ہے۔

ان کے علاوہ اور بھی کئی ایک علماء ہیں، جنہوں نے اس مبارک فن میں طبع آزمائی کی اور جوہر دکھائے جیسے شیخ عبدالرحمٰن صدیقی شطاری گجراتی نے مرآۃ الآخرۃ ، انتخاب ، البدور السافرۃ ، شیخ جعفر بخاری گجراتی نے الفیض الطاری شرح البخاری ، شیخ فاضل گجراتی نے معین الفضائل شرح شمائل الترمذی اور شیخ عبدالنبی شطاری گجراتی نے شرح نخبۃ الفکر لکھی۔

فقہ وفتاوی

ابوالفتح رکن الدین بن حسام الدین مفتی ناگوری جونا گپور کے مفتی تھے، انہوں نے بمقام نہروالہ اپنے قیام کے دوران گجرات کے قاضی القضاۃ قاضی حمادالدین احمد بن قاضی اکرم کی فرمائش پر اپنے بیٹے داود کی مدد سے الفتاوی الحمادیہ لکھی، اس کتاب میں جن تصانیف کا حوالہ دیا گیا ہے یا جن تصانیف میں اس کتاب کا حوالہ ہے ان سے یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ یہ کتاب آٹھویں صدی کے اواخر میں یا نویں صدی کے اوائل میں لکھی گئی

ہے، مصنف نے ان کتابوں کی طویل فہرست درج کی ہے جن سے انہوں نے اپنی کتاب مرتب کرنے میں استفادہ کیا ہے، یہ ایک معتبر تصنیف ہے اور فتاوی عالم گیری میں بھی اس کے حوالے دیئے گئے ہیں۔

یہ کتاب مخطوط شکل میں بانکی پور (۱۹-۱:۱۷۲۳) فہرست عربی مخطوطات دہلی، انڈیا آفس لنڈن (۸۱۵) خدیدی کتب خانہ قاہرہ (۳/۸۸) رامپور (۲۲۲) بنگال (۱۴) کتب خانہ کلکتہ مدرسہ (۴۱) کتب خانہ انڈیا آفس (۱۶۸۹-۱۶۹۱) میں موجود ہے۔

اور گجرات ہی کے ایک ممتاز عالم قاضی چکن گجراتی کی ترتیب دی ہوئی کتاب خزانة الروایات ہے جو فقہ حنفی کے احکام کی تفصیلات پر مشتمل ہے، یہ کتاب چھٹی، ساتویں اور آٹھویں صدی ہجری میں لکھی جانے والی کتابوں سے اقتباسات کا مجموعہ ہے، شروع میں کتاب العلم کے عنوان سے ایک مقدمہ بھی تحریر کیا گیا ہے، اس میں انہوں نے علم اور علماء کی فضیلت بیان کی ہے، وہ خود حنفی تھے، اس لئے امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے اوصاف وفضائل پر بھی ایک مقالہ قلم بند کیا ہے، انہوں نے فتاوی اور مفتی سے متعلق فنی نکات کی بھی تشریح کی ہے، یہ کتاب مخطوط شکل میں دہلی (۱۴۳۷) فہرست دینی کتب خانہ استنبول (۶۰۵) فہرست کتب خانہ نوری عثمانیہ استنبول (۱۵۲۰) فہرست کتب خانہ عشیر آفندی استنبول (۳۲۶) بوہار (۲/۱۵۶) بانکی پور (۱۹-۱:۳۹) رامپور (۱۷۲) آصفیہ (۲/۱۰۸۴) میں موجود ہے۔

شہاب الدین احمد بن محمد جیلانی: یہ بھی ایک جید عالم تھے، گجرات میں پرورش پائی، اس میں اختلاف ہے کہ ان کا تعلق نویں صدی سے تھا یا دسویں صدی سے، اردو کے مشہور ماہنامہ ''المعارف'' اعظم گڑھ بابت مئی ۱۹۳۰ء صفحہ ۳۴۷ پر شائع شدہ ایک مضمون کے مطابق انہوں نے ایک کتاب فتاوی ابراہیم شاہ شرقی کے لئے لکھی تھی، محمد عبدالاول جونپوری نے بھی

اسی خیال کا اظہار کیا ہے اور لکھا ہے کہ یہ شہاب الدین دولت آبادی کے ہم عصر تھے اور ان کی قبر جونپور میں موجود ہے۔ دوسری رائے یہ ہے کہ فتاوی ابراہیم عادل شاہ کے نام معنون کی گئی ہے۔

مذکور کتاب فتاوی ابراہیم شاہیہ بوہار عربی مخطوطات فہرست (۱۵۹/۲) بانکی پور (۵۲-۱۷۴۹) آصفیہ (۱۰۵۲:۲-۴۴۲:۳) رامپور (۲۲۱) انڈیا آفس (۴-۱۷) میں موجود ہے، نیز اس پر حافظ نذیر احمد جریدہ کا مختصر نوٹ ایشیا ٹک سوسائٹی آف بنگال (۴۶) میں موجود ہے۔

شاہ وجیہ الدین گجراتی نے حاشیة علی شرح الوقایہ ، بوہار (۱۶۴) رامپور (۱۸۶) حاشیة علی التلویح ندوۃ العلماء لکھنؤ (۲۱۷) حاشیة علی اصول البزدوی تذکرہ علماء ہند (۲۵۰) اور حاشیة علی الشرح العضدی علی المختصر لابن حاجب تحریر فرمائی۔

شیخ عبد اللطیف بن جمال بن حامد نہروالی نے ابراہیم بن موسیٰ طرابلسی کی کتاب مواهب الرحمن کی شرح لکھی، جو بشکل مخطوط بانکی پور (۱۷۴۳) میں موجود ہے۔

قاضی محمد عیسیٰ بن شیخ عبد الماجد صدیقی جونا گڑھی ، یہ جونا گڑھ کے قاضی تھے اور اسلامی علوم پر بہت عبور رکھتے تھے، انہوں نے فتح القادر شرح الہدایہ لکھی ، اس کا صرف ایک حصہ قاضی احمد میاں اختر جونا گڑھی کے پاس تھا، جو ان کی اولاد میں سے ہے۔

شیخ نور الدین بن شیخ محمد احمد آبادی نے حاشیة علی التلویح ، حاشیة علی شرح الوقایه اور حاشیة علی شرح المطالع تصنیف فرمائی، ان کتابوں کا تذکرہ رحمٰن علی لکھنوی

نے تذکرۂ علماء ہند میں کیا ہے۔

نعمت اللہ بن طاہر نہروالی نے صلوۃ التراویح تالیف فرمائی جو اسلامیہ کالج پشاور کی لائبریری کے اورینٹل سیکشن کی فہرست (۶۵۴) میں درج ہے۔

اس کے علاوہ اور بھی کچھ کتابیں اس فن میں لکھی گئی جیسے فیض الحسن بن نورالحسن سورتی گجراتی نے فرح شاهی شرح خلاصة الکیدانی ،فتاوی نقشبندیہ، قاضی عیسیٰ بن عبدالرحیم گجراتی نے مسئلۂ سماع پر سب سے زیادہ مفصل اور نافع کتاب عربی زبان میں لکھی، اسی طرح بندوق کی گولی سے مرے ہوئے جانور کے حکم کے متعلق ایک کتاب شیخ محمد بن یوسف سورتی کی ہے، شیخ عبدالقادر بن عبدالاحد باعلظہ شافعی سورتی نے تحفة المشتاق فی احکام النکاح و الانفاق اور شیخ ابراہیم بن عبداللہ باعلظہ شافعی سورتی نے تحفة الاخوان لکھی۔

اصول فقہ میں شیخ احمد بن سلیمان گجراتی نے حاشیہ بر حاشیہ ملا عبدالحکیم، شیخ عبدالنبی بن عبداللہ شطاری گجراتی نے المواهب الالهی شرح اصول ابراهیم شاهی، علم الفرائض میں شیخ محمد ہاشم سامرودی سورتی نے جوهر النظم تحریر فرمائی اور ایک جامع کتاب اردو زبان میں بھی تحریر فرمائی۔

تجوید وقراءت

خطۂ گجرات میں فن حدیث شریف کی خدمت جلیلہ کو جو اولیت حاصل ہوئی ہے، علم تجوید وقراءت میں وہ حاصل نہ ہوسکی، علم قراءت میں پنجاب، دہلی اور دکن کے بعد گجرات کا نمبر ہے، کتب تاریخ میں قراء اور مجودین اور ان کے مدارس کا ذکر بہت مجمل طور پر ملتا

ہے، جب کہ سلطنت کے دور میں ۲۹ مدارس اور ۳۷ر کتب خانوں کا ذکر ملتا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ فن مدارس و مکاتب اور مساجد میں حفظ و ناظرہ کے ساتھ پڑھایا جاتا تھا اور مسلمان اس کی تعلیم کو اولین فریضہ تصور کرتے تھے، لہذا اس کی تشہیر کو بھی کم اہمیت دیتے تھے، یہی وجہ ہے کہ اس زمانہ کے نصاب تعلیم میں بھی اس کا ذکر مختصراً موجود ہے، البتہ اس کا پتہ ضرور ملتا ہے کہ مکاتب و مدارس اور انفرادی مراکز میں قرآن مجید پڑھانے والے اساتذہ کے لئے ''مقری'' اور'' قرآن خواں'' کی اصطلاح مستعمل تھی، ان ہی میں سے کچھ قراء اور ان کے مدارس قرآنیہ کو تاریخ نے ضبط کیا ہے، جن میں سے بعض کا تذکرہ پیش خدمت ہے۔

(۱) شیخ مخدوم جہانیاں جہاں گشت: آپ کا نام سید جلال الدین حسین بن مخدوم جہانیاں جہاں گشت تھا، حضرت سید احمد کبیر کے بڑے بیٹے اور حضرت سید جلال سرخ کے پوتے تھے، شعبان المعظم کی ۱۴ر تاریخ کو ۷۰۷ھ میں ''اوچ'' میں پیدا ہوئے، ابتدائی تعلیم والد و چچا سے حاصل کی، فقہ و اصول فقہ شیخ بہاء الدین اوچی سے پڑھی، حصول علم کے لئے ملتان بھی جانا ہوا جہاں ایک سال قیام فرمایا، ''درمنظوم'' میں ہے کہ آپ قراءت سبعہ کے قاری تھے، حصول علم کا مزید شوق آپ کو حجاز مقدس لے گیا، جہاں تصوف و حدیث کا درس لیا، ایک مرتبہ مسجد نبوی علی صاحبہ الف صلاۃ وسلام میں امامت کا شرف بھی حاصل ہوا، ۱۳۰ر سے زیادہ شیوخ سے استفادہ کیا اور خرقۂ خلافت و اجازت حاصل کی، سلطان محمد تغلق نے ۴۰ر خانقاہیں آپ کے ذمہ کی تھیں، ''ثمرات القدس'' کی روایت کے مطابق مریدین کی تعداد پونے دولاکھ کے قریب تھی، آپ کی وفات حسرت آیات ۱۰ر ذوالحجۃ الحرام ۷۸۵ھ میں ہوئی، آپ کی خانقاہ اوچ بخاری کے شمال مغربی گوشے میں واقع ہے۔ (مشائخ احمد آباد، ص: ۱۰۰-۱۰۸)

(۲) شیخ عبداللطیف: آپ احمد آباد کے باشندے تھے، ظاہری و باطنی علوم میں کمال حاصل تھا، زہد وقناعت کے دل دادہ تھے، آپ قراءت وتجوید کے بہت اچھے استاذ تھے، سید جعفر شیرازی نے آپ سے سبعہ قراءت سیکھ کر درس وتدریس کا سلسلہ شروع کیا، آپ کا مزار پٹن میں ہے، ماہ رمضان المبارک کی چار تاریخ کو ۸۸۵ھ میں ''بٹوہ'' احمد آباد میں آپ کی وفات ہوئی۔ (مشائخ احمد آباد،ص:۲۵۴،نزہۃ الخواطر:۳/۷۱)

(۳) شیخ سید زاہد بن قطب عالم بخاری: ماہ رجب المرجب کی نو تاریخ کو ۸۴۸ھ میں شہر احمد آباد میں آپ کی ولادت ہوئی، بچپن ہی میں حفظ قرآن پاک کی سعادت حاصل کی اور ۲۰؍سال کی عمر میں تجوید، فقہ وحدیث اور جملہ علوم وفنون کی تحصیل سے فارغ ہوئے، آپ نہایت خوش الحان قاری بھی تھے، شعبان المعظم کی چھ تاریخ کو ۸۹۲ھ میں ''بٹوہ'' احمد آباد میں آپ کی وفات ہوئی۔ (مشائخ احمد آباد،ص:۲۵۸-۲۶۰)

(۴) قاضی علم الدین شاطبی: آپ کا نام قاضی علم الدین بن عین الدین بن نجم الدین صدیقی شاطبی گجراتی ہے، تجوید وقراءت اور فقہ وعربیت کے نامور علماء میں سے ایک ہیں، آپ کی وفات ۲۰؍رمضان المبارک ۸۶۰ھ کو پیر کے روز ہوئی، وقت وفات آپ کی عمر ۸۸؍سال کی تھی۔ (نزہۃ:۳/۸۲ برقم:۱۴۵)

(۵) شیخ ابراہیم برہان پوری: آپ اصلاً احمد آباد کے رہنے والے تھے، قراءت وتجوید کے ماہر تھے، احمد آباد میں بھی اور پھر وہاں سے برہان پور جانے کے بعد اپنے درس کو جاری رکھا، ۹۰۱ھ میں وفات پائی۔ (تاریخ احمد آباد،ص:۳۴ بحوالہ تذکرۂ قاریان ہند)

(۶) شیخ محمود بن محمد گجراتی: صاحب نزہۃ نے آپ کے قاری ہونے کی وضاحت کی ہے، چنانچہ آپ کے ترجمہ میں لکھتے ہیں: ''الشیخ الفاضل محمود بن محمد المقرئ

الحنفی الگجراتی ، أحد العلماء المشهورین فی عصرہ....“

آپ مشہور عالم دین راجح بن داود کے استاذ ہیں، علامہ سخاوی نے بھی راجح بن داود کے حالات میں آپ کا تذکرہ کیا ہے، تاریخ وفات تو پتہ نہ چل سکی، البتہ راجح بن داود کی وفات ۹۰۴ھ میں ہوئی جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپ کی وفات بھی اسی زمانہ میں ہوئی ہوگی، واللہ اعلم بالصواب۔ (نزہۃ:۳/ ۱۲۷برقم:۲۱۹)

(۷) شیخ مودود گجراتی: آپ قاضی علم الدین کے فرزند ہیں اور اپنے والد ہی کی طرح علم قراءت وتجوید میں مہارت ولیاقت تامہ رکھتے تھے، علماء کرام کی ایک بڑی جماعت آپ سے استفادہ کرتی تھی، ۸۵؍سال کی عمر میں ۹۱۳ھ میں ”پٹن“ میں آپ کا انتقال ہوا اور وہیں مدفون ہوئے۔ (نزہۃ:۴/ ۳۲۸، ۳۲۹ برقم:۵۳۸)

(۸) شیخ احمد بن جعفر الگجراتی: صاحب نزہۃ الخواطر لکھتے ہیں: ”الشیخ العالم المجود أحمد بن جعفر بن محمود الحسینی السندی الگجراتی، أحدالعلماء البارزین فی القراءۃ والتجوید وسائر العلوم“ کہ آپ دیگر علوم اسلامیہ کے علاوہ علم قراءت وتجوید میں بھی مشہور تھے، ۸۷۰ھ میں گجرات میں پیدا ہوئے، اور وہیں نشو ونما پائی، ماہ صفر المظفر کی ۱۶؍تاریخ کو پیر کے دن ۹۴۴ھ میں آپ کی وفات ہوئی۔ (نزہۃ:۴/ ۱۷-۱۸ برقم:۳۷، مشائخ احمد آباد، ص:۹۳-۹۷)

(۹) شاہ فضل اللہ کاشانی: تاریخ احمد آباد میں آپ کا تذکرہ ان الفاظ میں موجود ہے: قرآن کریم سے آپ کو خصوصی شغف تھا، تجوید کی تعلیم پر خصوصی اہتمام فرماتے تھے۔ پندرہ جمادی الاولی ۹۴۶ھ میں آپ کی پرفتوح قفس عنصری سے علیین کی طرف کوچ فرما ہوئی اور سابرمتی کے کنارے آپ کی قبر بنائی گئی“۔ (مشائخ احمد آباد، ص:۹۷، بحوالہ اکابرین گجرات، ص:

(۹۵۴

(۱۰) شیخ ابراہیم قاری شطاری سندھی: آپ کا آبائی وطن تو سندھ ہے، لیکن ایک مدت دراز تک آپ شہر احمد آباد میں اپنے فیوض پھیلاتے رہے، تجوید پر آپ کو کافی عبور تھا، دل گداز آواز سے قرآن مجید پڑھتے تھے، حضرت مسیح الاولیاء اور آپ کے پیر شیخ لشکر علم قراءت میں آپ کے شاگرد تھے، برہان پور کے بادشاہ میران محمد شاہ فاروقی نے آپ سے درخواست کی کہ میری مستورات قراءت وتعلیم قرآن کی خواہش مند ہیں، لیکن آپ نے معذرت فرمادی، آپ کی وفات ۹۹۱ھ میں ہوئی اور شیخ ابراہیم بن عمر رحمۃ اللہ علیہ کے مقبرہ کے متصل عادل پور، برہان پور میں مدفون ہوئے۔ (مشائخ احمد آباد، ص: ۱۸۹، ۱۹۰)

(۱۱) علامہ محدث حضرت مولانا محمد طاہر پٹنی: آپ کا ایک مخطوطہ رسالہ ''منہاج السالکین'' ہمارے پاس ہے، اس کی تعلیق وتخریجِ احادیث کا کام الحمدللہ جاری ہے، اس مخطوطہ کے مطالعہ سے علامہ محمد بن طاہر پٹنی رحمۃ اللہ علیہ کے فن تجوید میں لکھے گئے ایک رسالہ ''دریتیم'' کا پتہ چلتا ہے۔

(۱۲) شیخ محمد بن احمد الفاکہی: آپ کا پورا نام محمد بن احمد بن علی الحنبلی الفاکہی المکی ابوالسعادات الگجراتی تھا، ۹۲۳ھ میں پیدا ہوئے اور تمام علوم اسلامیہ میں مہارت پیدا کی، شاطبیہ زبانی یاد تھی، کلام پاک کے بھی حافظ تھے اور تجوید کے ساتھ قرآن کریم قراءت سبعہ میں پڑھا کرتے تھے، شہر احمد آباد میں جمعہ کے روز ماہ جمادی الاولیٰ ۹۹۲ھ میں آپ کی وفات ہوئی اور وہیں پیوند خاک ہوئے۔ (نزہۃ: ۲۵۲/۴-۲۵۴، مشائخ احمد آباد، ص: ۲۱۱-۲۱۴)

(۱۳) شیخ محمد بن فضل برہان پوری: شاہ محمد بن خواجہ فضل اللہ بن خواجہ صدرالدین بن

خواجہ حسین جونپوری ثم برہان پوری، آپ کا نسب نامہ اوپر جا کر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے ملتا ہے، آپ کے آباء واجداد جونپور سے ہجرت کر کے گجرات چلے آئے تھے، شیخ محمد بن فضل اللہ ۹۵۱ھ کے آس پاس شہر احمد آباد میں پیدا ہوئے، بچپن ہی میں یتیم ہو گئے تھے، عنفوان شباب میں شیخ صفی الدین گجراتی سے منسلک ہو کر خرقۂ اجازت حاصل کی اور مکہ مکرمہ تشریف لے گئے، وہاں سے لوٹ کر احمد آباد میں قیام کیا، بارہ سال شیخ وجیہ الدین کی خدمت میں رہ کر اکتساب فیض کیا، اور دیگر شیوخ سے بھی فیوض حاصل کرنے کے بعد برہان پور لوٹ گئے، آپ کا محیر العقول کارنامہ یہ تھا کہ آپ نے ''شیخو پورہ'' نام سے ایک محلّہ آباد کیا، جس میں حفاظ کرام کے تین سو گھر تھے، آپ کے عہد میں شیخو پورہ سے بعد نماز فجر تلاوت قرآن کریم کے سوا کوئی آواز سنائی نہیں دیتی تھی، ۸۶/سال کی عمر پائی، صاحب سفینۃ الاولیاء کے مطابق آپ کی وفات ۲/رمضان المبارک بروز پیر ۱۰۲۵ھ کو ہوئی جب کہ ''رود کوثر'' کے مؤلف نے آپ کا سال وفات ۱۰۲۹ھ لکھا ہے، صاحب نزہۃ نے تاریخ وفات ۲/رمضان ۱۰۲۹ھ نقل کیا ہے۔ (مشائخ احمد آباد، ص:۳۰۶، ۳۱۳، نزہۃ: ۳۶۳/۵)

(۱۴) شیخ احمد بن بدرالدین المصری: شہاب الدین احمد بن بدرالدین العباسی الشافعی المصری ثم الہندی الگجراتی، عبدالقادر حضرمی نے النور السافر میں لکھا ہے کہ ۹۰۳ھ میں مصر میں آپ کی ولادت ہوئی، اپنے زمانہ کے کبار علماء سے علوم حاصل کیے، دسیوں کتابیں زبانی یاد تھیں جن میں ایک شاطبیہ بھی ہے، جمعہ کی رات میں ۹۹۲ھ کو احمد آباد میں آپ کا وصال ہوا اور وہیں مدفون ہوئے، صاحب نزہۃ کے قول کے مطابق آپ کی وفات ماہ رمضان المبارک میں ہوئی، جب کہ عبدالقادر حضرمی نے النور السافر میں ماہ صفر المظفر ذکر کیا ہے۔ (نزہۃ: ۱۶/۴، ۱۷ابرقم: ۳۶، مشائخ احمد آباد، ص: ۲۱۵-۲۱۹)

(۱۵) شیخ مبارک نا گوری: شیخ مبارک بن شیخ خضر نا گوری نام تھا، قریشی النسل تھے، دسویں صدی ہجری میں آپ کے والد ہندوستان آئے اور نا گور میں اقامت اختیار کی، جہاں ۹۱۱ھ میں شیخ مبارک کی ولادت ہوئی، چودہ سال کی عمر تک آپ تمام علوم متداولہ سے فارغ ہو چکے تھے، اپنی عمر کا ایک معتد بہ حصہ آپ نے احمد آباد میں گذارا اور پھر ۹۵۰ھ میں آگرہ پہنچے، ملا بدایوں آپ کے متعلق لکھتے ہیں کہ شاطبیہ آپ کو زبانی یاد تھی، نیز قرآن شریف دس قراءت کے ساتھ یاد تھا، آپ کا وصال ۱۷/ ذوالقعدۃ الحرام ۱۰۰۹ھ کو ہوا اور آگرہ ہی میں مدفون ہوئے۔ (مشائخ احمد آباد، ص: ۲۷۴، ۲۷۵)

(۱۶) شیخ محمد بن الحسن المندوی: محمد بن الحسن بن موسی الگجراتی ثم المندوی، ۱۱/ رجب المرجب ۹۶۲ھ کو ''مندو'' میں آپ کی ولادت ہوئی، فارسی کے ابتدائی رسائل اور قرآن پاک کی قواعد تجوید کی رعایت کے ساتھ مکمل تعلیم شیخ کمال الدین القرشی سے حاصل کی، گیارہ سال کی عمر میں والد محترم کا سایہ سر سے اٹھ گیا، سترہ سال کی عمر میں والدہ نے نکاح کروایا، بعد نکاح بھی حصول علم میں مشغول رہے، آگرہ کا سفر کر کے وہاں بھی علم حاصل کیا، پھر ۹۹۰ھ میں گجرات لوٹے اور مدرسۂ شیخ وجیہ الدین علوی میں کتب درسیہ پڑھی، اور پھر ۹۹۴ھ میں واپس مندو لوٹ گئے، ۱۰۲۲ھ تک آپ حیات رہے، تاریخ وفات معلوم نہ ہو سکی۔ (نزہۃ: ۵/ ۳۴۹، ۳۵۰، برقم: ۵۶۴)

(۱۷) شیخ سید جعفر مجید عالم: فقہ وتصوف کے مشہور عالم سید جلال حمید عالم کے فرزند ہیں، آپ کی ولادت احمد آباد میں ماہ ربیع الثانی ۱۰۸۱ھ میں ہوئی، عمر کے نویں سال ہی میں مکمل قرآن مجید تجوید کے ساتھ حاصل کر چکے تھے، اپنے والد ماجد سے علوم حاصل کئے اور درس وتدریس سے وابستہ ہو گئے، آپ کی وفات ماہ محرم الحرام ۱۱۰۹ھ میں ہوئی اور احمد آباد میں سپرد خاک کیے گئے۔ (مشائخ احمد آباد، ص: ۱۸۳)

(۱۸) شیخ احمد بن ابو بکر : شیخ احمد بن ابی بکر المعروف بابن الشلی الیمنی ، آپ کی ولادت ''تریم'' میں ۱۰۱۹ھ میں ہوئی، آپ نے وہیں شیخ محمد باعیشہ کی زیرنگرانی قرآن پاک حفظ کیا اور تجوید بھی ان ہی سے پڑھی، المقدمۃ الجزریہ بھی زبانی یاد تھی، علم کے شوق نے آپ کو ہندوستان پہنچایا تھا، جہاں آپ نے شیخ ابن عبداللہ عیدروس اور سید عمر بن عبداللہ باشیبان وغیرہ سے استفادہ کیا، پھر واپس اپنے وطن لوٹے، آپ کا انتقال اپنے وطن ہی میں ۱۰۵۷ھ میں ہوا اور زنبل کے مقبرہ میں دفن کئے گئے۔ (مشائخ احمد آباد، ص: ۳۵۸-۳۶۰)

(۱۹) قاضی عبدالرسول الگجراتی: آپ کا پورا نام یوں ہے: عبدالرسول بن ابی محمد بن عبدالوارث بن ابی محمد بن عبدالملک بن اسماعیل بن شہاب الدین بن حسام الدین العثمانی الکپرپنجی الگجراتی، شہر احمد آباد کی مغربی سمت میں کچھ فاصلہ سے واقع ''کپر پنج'' نامی علاقہ میں آپ کی ولادت ہوئی، جہاں ابتدائی علوم کے ساتھ آپ نے علم قراءت وتجوید شیخ فرید الدین سے حاصل کیا، پھر آپ دہلی تشریف لے گئے، جہاں سے آپ کو ''دھولقہ'' کا قاضی بنا کر بھیجا گیا، پانچ سال آپ نے اپنی ذمہ داری بحسن وخوبی انجام دی اور پھر اس سے سبک دوشی اختیار کر لی، ۱۹ر شوال المکرّم ۱۱۳۰ھ کو پیر کی شب آپ راہی ملک عدم ہوئے۔ (نزہۃ: ۶/ ۱۴۸، ۱۴۹ برقم: ۲۷۲، مشائخ احمد آباد، ص: ۴۳۰)

(۲۰) مولانا غلام برہان پوری: علامہ غلام محمد الحنفی الگجراتی ثم البرہان پوری، آپ فرقۂ بوہرہ سے تعلق رکھتے تھے، شہر آحمد آباد میں ولادت ہوئی، اور ابتدائی علوم وہیں حاصل کئے، وہاں سے حصول علم کے لئے لکھنؤ اور لکھنؤ سے دہلی کا سفر کیا، جہاں شیخ انور گوپاموی آپ کو اپنے ساتھ برہان پور لے گئے اور آپ کے لئے مدرسہ بنوایا، ایک عرصہ تک آپ اسی مدرسہ میں علوم وفیوض کے ذریعہ فائدہ پہونچاتے رہے، حاجی رفیع الدین مرادآبادی اپنی

کتاب ''اخبار الحرمین الشریفین'' میں آپ سے متعلق لکھتے ہیں: ''انه کان عالما مفرداً فی التجوید والقراءة، متبحرا فی العلوم والفنون'' کہ دیگر علوم وفنون کے ساتھ آپ علم تجوید وقراءت میں یکتائے روزگار تھے، آپ کی وفات ۱۱۴۹ھ میں ہوئی۔ (نزہۃ: ۶/ ۲۰۹ برقم: ۳۹۴، مشائخ احمد آباد، ص: ۴۴۱-۴۴۲)

(۲۱) مولانا محمد صالح الگجراتی: محمد صالح بن نور الدین الأحمد آبادی الگجراتی، احمد آباد میں پیدا ہوئے، اور وہیں نشو ونما پائی، قرآن پاک قراءت سبعہ متواترہ کے ساتھ یاد فرمایا، اور دیگر علوم اپنے والد ہی سے حاصل کیے، اپنے والد کی زندگی ہی میں آپ کی وفات ہوئی، چنانچہ ۱۶/ جمادی الاولیٰ ۱۱۴۷ھ کو دہلی میں آپ کا وصال ہوا، وہاں سے آپ کا جسد خاکی احمد آباد منتقل کیا گیا اور آپ کے دادا ملا محمود کے باڑے میں دفن کیے گئے۔ (نزہۃ: ۶/ ۳۲۸ برقم: ۶۰۶، مشائخ احمد آباد، ص: ۴۴۱)

(۲۲) شیخ احمد بن عبد الجلیل سورتی: احمد بن عبد الجلیل الحسینی البخاری السورتی، سورت میں ولادت ہوئی اور وہیں پلے بڑھے، آپ نے تجوید وقراءت کی رعایت کے ساتھ مکمل قرآن پاک کو حفظ فرمایا تھا، ماہ صفر المظفر کی ۲/ تاریخ کو ۱۲۴۷ھ میں سورت ہی میں آپ کا انتقال ہوا۔ (نزہۃ: ۷/ ۳۱، ۳۲ برقم: ۴۶)

(۲۳) شیخ اسماعیل السورتی: اسماعیل بن ابی اسماعیل سورتی گجراتی، گجرات میں پیدا ہوئے اور وہیں ابتدائی علوم حاصل کیے، حافظ عبد الرحمٰن القاری السورتی سے مکمل قرآن مع تجوید پڑھا، ۲۵/ شوال المکرّم ۱۲۸۷ھ کو سورت میں آپ کا وصال ہوا اور وہیں مدفون ہوئے۔ (نزہۃ: ۷/ ۷۹، ۸۰ برقم: ۱۰۲)

(۲۴) شیخ رحمۃ اللہ لاجپوری سورتی: فقہ وعربیت اور اصول کے ماہر علماء میں سے

ایک تھے، قرآن پاک کی قراءت سبعہ متواترہ میں تلاوت فرماتے تھے اوراس دور میں قراءت میں آپ کا کوئی ثانی نہیں تھا،حرمین شریفین کی زیارت بابرکت سے لوٹ کرسورت میں ایک لمبی مدت تک درس وتدریس سے وابستہ رہے، پھر دوبارہ سفرحجاز پر نکلے اور دوسری مرتبہ حرمین شریفین کی زیارت کالطف اٹھایا، ہندوستان کے لئے واپسی کے سفر کے دوران آپ کی کشتی غرقاب ہوگئی، یہ واقعہ ۱۲۶۴ھ میں پیش آیا تھا۔(نزہتہ:۷/۲۱۱برقم:۳۰۷)

(۲۵) شیخ اسماعیل راندیری: اسماعیل بن حافظ محمد بن حافظ صالح الحنفی الراندیری، راندیر میں پیدا ہوئے اور بنیادی علوم وہیں حاصل کئے، پھر بھوپال کا سفر کیا اور تمام درسی کتب مولوی بدیع الزماں لکھنوی اور دیگر علماء کے پاس پڑھی، صحاح وسنن شیخ حسین بن محسن السبعی الانصاری سے پڑھی اور طویل مدت تک آپ ہی کی خدمت میں رہے، پھر حجاز مقدس کا سفر کیا اور حرمین شریفین کی زیارت کے بعد شیخ محمد الدمیاطی سے قراءت وتجوید کا علم حاصل کیا، وہاں سے راندیر لوٹے اور جامع مسجد کی خطابت کے منصب پر فائز کیے گئے، آپ کی وفات ۱۷/ربیع الاول ۱۳۳۰ھ کوراندیر ہی میں ہوئی۔(نزہتہ:۷/۵۴،۵۵برقم:۵۲)

(۲۶) مولانا سید تجمل حسین مشہدی بھروچی رحمۃ اللہ علیہ: آپ کے مفصل حالات تو نہ مل سکے البتہ آپ کی ایک کتاب ہے''تجوید مشہدی''جس میں فن تجوید کوسوال وجواب کے انداز میں پیش کیا گیا ہے،اس کی ابتداء میں مختصر حالات اوران کے اقوال درج ہے، یہ کتاب مولانا حکیم سید عبدالحی کفلیتویؒ کے ادارہ سے چھپی تھی،اسی سے یہ نقل پیش خدمت ہے۔

وہ تحریر فرماتے ہیں کہ جن لوگوں میں جذبۂ علم وعمل ہے ان حضرات کی خدمت میں پیش کرنے کے لئے میرے پیرومرشد مولانا شاہ عبدالکریم مرادآبادی اور قطب وقت مولانا شاہ فضل الرحمٰن گنج صدیقی مرادآبادی کے ایماء واجازت سے یہ کتاب لکھنے کا ارادہ کیا، اس

کے بعد میرے کچھ مربیوں کے کہنے پر افریقہ جانے کا خیال ہوا، اور ۱۳۲۴ھ میں گھر سے اس سفر کے لئے نکلا، اس وقت سے ۱۳۴۶ھ کے درمیانی عرصہ میں مختلف فنون میں ۵/رسائل تصنیف کئے، اس کے بعد چھٹا رسالہ فن تجوید میں لکھا۔

مزید وضاحت: ربیع الاول وربیع الثانی ۱۳۳۴ھ میں بحری سفر کر کے ایک چھوٹے سے جزیرے پیری زن آئلینڈ (Perijan Iseland) پہنچے، اور وہاں ''تعلیم المتعلمین'' کی اردو شرح مع اضافات مفیدہ وترجمہ شروع کیا۔ (لیکن رسالۂ تجوید کی طباعت کے وقت مذکور شرح نامکمل تھی اور اس کے بعد علم بھی نہ ہو سکا کہ یہ کتاب اتمام پذیر ہوئی یا نامکمل ہے۔)

اس کے بعد مجھے بر بنائے مجبوری ۳ ماہ ''دَالْ گُبّا'' (Dal Gubba) میں رہنا پڑا جہاں بیماری میں مبتلا ہوا تو اس سے صحت یابی کے لئے اور مستقبل میں خدمات دینیہ جلیلہ کی توفیق ملے اس غرض سے ''قصیدۂ نعمان'' لکھا، جو فارسی زبان میں اشعار پر مشتمل ہے، اس کا تاریخی نام ''شربتِ رُمّان مطلوب جان'' رکھا۔

بعدہ بقضاء وقدرت الٰہی بندہ دربن (ناٹال) پہنچا جہاں طفلانِ مکتب کو تعلیم دینا شروع کیا، اسی وقت دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ ان چھوٹے بچوں کی سہولت کے خاطر ایک رسالہ لکھوں جس میں روزانہ پیش آنے والے ضروری مسائل سوال وجواب کے انداز میں جمع ہو جائے تا کہ بچوں کو یاد کرنے میں آسانی رہے لہذا ''سوال وجواب مشہدی برائے مطالعۂ اولاد مبتدی'' تحریر کیا۔

پھر ۱۳۳۵ھ کے اواخر یا ۱۳۳۶ھ کے اوائل میں ایک مشقی کاپی تیار کی جس میں الفاظ صاف اور صحیح لکھے جا سکیں، اس کا نام ''مشق ابجدی ازنسق مشہدی'' رکھ دیا۔

اس کے بعد چھوٹے بچوں کو ''طہارت وصلوۃ'' کے مسائل یاد کروانے کے لئے ایک رسالہ لکھا کہ اچانک خیال ہوا کہ چھوٹی چھوٹی مسنون دعائیں بھی یاد کروائی جائے اسکو مدنظر رکھتے ہوئے روزانہ پڑھی جانے والی ضروری دعائیں جمع کر کے ایک رسالہ لکھ دیا جس کا نام ''تہذیب احمدی از ترتیب مشہدی'' رکھا گیا، اور تاریخی نام ''التجاء فیض'' ہے جس کے اعداد سے سن ہجری کا علم ہوتا ہے۔

مولانا خود شاعر بھی تھے، فارسی، اردو اور عربی زبان میں اشعار آپ کی کتاب ''تجوید مشہدی'' میں شامل ہے، اسی طرح کسی آدمی کی وفات پر بھی تاریخی اشعار اور نظمیں لکھتے تھے، اس سے یہ معلوم ہوسکتا ہے کہ آپ کس قدر بلند پایہ کے عالم تھے۔ (اکابرین گجرات، گجراتی، ۴/ ۲۰۷، ۲۰۸)

ان حضرات کے علاوہ بہت سے حضرات وہ ہیں، جن کا مختصر تذکرہ سابقہ مقالہ میں کیا جا چکا ہے، ان کے نام یہ ہیں:

(۱) سید ناصر الدین محمود (م: ۸۰۰ھ) یہ شیخ جلال الدین مخدوم جہانیاں جہانگشت کے فرزند تھے۔

(۲) سید برہان الدین قطب عالم، آپ سید ناصر الدین کے فرزند تھے۔

(۳) شیخ جیو اور (۴) شیخ شاہ عالم (م: ۸۸۰ھ) یہ دونوں قطب عالم کے فرزند تھے۔

(۵) مظفر شاہ خلیل خان، یہ سلطان محمود بیگڑہ کا فرزند تھا۔

(۶) سید شاہ بخاری (م: ۸۹۳ھ) یہ شاہ عالم کے خلیفہ تھے۔

(۷) شیخ ابن عبداللہ العیدروس حضرمی (م: ۹۹۰ھ)

(۸) شیخ عبدالقادر حضرمی (م:۱۰۳۸ھ)

(۹) سید جعفر بن علی العیدروسی (م:۱۰۶۴ھ)

(۱۰) قاری نورالدین محمد بن علی الحضرمی (۱۰۶۸ھ)

(۱۱) حاجی شیخ کرمانی بھروچی

(۱۲) قاری شیخ معزالدین سلیمان بن شیخ علاءالدین گنج رواں (م:۱۴ے۸ھ)

(۱۳) المقری عزیزاللہ چشتی

(۱۴) شیخ راجح بن داود گجراتی

(۱۵) قاری صدر جہاں احمد آبادی

(۱۶) قاری مخدوم کمال الدین قزوینی (م:۸۸۹ھ)

(۱۷) قاری شیخ کبیر منتھنا پوری

(۱۸) قاری شیخ رحمۃ اللہ چشتی، آپ شیخ عزیز اللہ چشتی کے فرزند ہیں، سلطان محمود آپ کا بڑا معتقد تھا۔

(۱۹) شیخ سعداللہ چشتی، آپ بھی شیخ عزیزاللہ کے فرزند تھے۔

(۲۰) شیخ رفیع اللہ، آپ بھی شیخ سعداللہ کے فرزند تھے۔

(۲۱) حافظ وقاری شیخ حسن بن موسی احمد آبادی (م:۹۶۲ھ)

(۲۲) قاری ابومحمد المعروف بہ ابوجیواسیر گڑھی (م:۹۹۳ھ)

(۲۳) حافظ وقاری شیخ احمد چاپانیری: آپ شیخ محمود (ساکن مانڈو) کے بڑے بھائی تھے، ۹۸۸ھ میں وفات ہوئی۔

(۲۴) شیخ عبدالمعطی مکی ثم احمد آبادی: آپ شیخ الاسلام زکریا الانصاری جیسے مشہور

قاری ومقری کے شاگرد تھے،۹۸۹ھ میں وفات پائی۔

(۲۵) قاری رفیع الدین بن جلال الدین شیرازی (م:۹۸۹ھ)

(۲۶) علامہ وجیہ الدین علوی: آپ نے احمد آباد میں ایک مدرسہ قائم فرمایا، جس میں ۶۵ر سال تک تدریس سے منسلک رہے۔

(۲۷) قاری حیدر علوی: آپ علامہ وجیہ الدین کے فرزند تھے۔

(۲۸) حافظ وقاری حاجی ضیاء اللہ شطاری اکبرآبادی: آپ شیخ وجیہ الدین کے شاگرد رشید تھے۔

(۲۹) حافظ وقاری مفتی کمال محمد العباسی: بادشاہ جہانگیر کے عہد میں آپ احمد آباد میں قیام پذیر تھے۔

(۳۰) قاری صبغۃ اللہ بھروچی: آپ سید کمال الدین قزوینی کے نواسے تھے، ۱۰۱۵ھ میں مدینۃ المنورہ میں وفات پائی۔

(۳۱) حافظ وقاری شاہ محمد فضل اللہ نائب رسول

(۳۲) قاری عبد الحلیم شاہ داثار بھنڈاری

(۳۳) قاری علی متقی (دوم)

(۳۴) شیخ مقری محمد اعظم چشتی نظامی: آپ شیخ حسن محمد چشتی کے فرزند تھے، ۴۲ر کتابیں تصنیف فرمائی۔

(۳۵) سید شاہ محمود قادری بالاپوری: آپ شاہ عبد الحلیم بھنڈاری کے فرزند ہیں۔

(۳۶) قاری مولانا اسحاق بھروچی: مغل بادشاہ شاہجہاں کے عہد میں بھروچ میں موجود تھے، ۱۰۷۲ھ میں وفات پائی۔

(۳۷) قاری مولانا محمد بن اسحاق بھروچی: آپ قاری اسحاق کے فرزند اور شاگرد تھے۔

(۳۸) مولانا قاری شاہ سلیمان کردی: آپ محدث دہلوی شاہ عبدالحق رحمۃ اللہ علیہ کے شاگرد ہیں، دہلی سے احمد آباد آئے تھے۔

(۳۹) قاری سید جلال الدین حمید عالم: آپ ابوالمجد محبوب عالم کے فرزند ہیں، ۱۱۱۴ھ میں وفات پائی۔

(۴۰) بہادرشاہ: محمد معظم شاہ عالم ، بہادرشاہ کے لقب سے تخت نشین ہوا تھا، حافظ وقاری تھے۔

(۴۱) حافظ وقاری مولانا احمد بن سلیمان احمد آبادی: آپ شاہ سلیمان کردی کے فرزند تھے۔

(۴۲) مخدوم العالم مولانا شیخ نورالدین احمد آبادی: ۱۰۶۳ھ میں احمد آباد میں پیدا ہوئے تھے۔

(۴۳) قاری وقاضی حافظ محمد نظام الدین: آپ شیخ نورالدین کے فرزند ہیں، ۱۱۶۵ھ میں انتقال ہوا۔

(۴۴) حافظ وقاری عبدالرحمٰن سورتی: ۱۱۸۰ھ میں ولادت اور ۱۲۴۵ھ میں وفات ہوئی۔

(۴۵) قاری شیخ رکن الدین احمد ثانی گجراتی: ۱۱۴۱ھ میں پیدا ہوئے اور ۱۱۹۸ھ میں وفات پائی۔

(۴۶) قاری محمد سلیمان سورتی: قاری عبدالرحمٰن مکی سے الہ آباد جا کر علوم حاصل کیئے،

بارڈولی میں رہے تھے۔

(۴۷) پیرزادہ سید محمد زین الدین احمد آبادی: ۱۳۳۱ھ میں پیدا ہوئے، مدرسہ فرقانیہ لکھنؤ قاری عبدالرحمٰن مکی سے تجوید کی سند لی، نیز راندیر میں قاری عطاء اللہ سندھی سے استفادہ کیا۔

(۴۸) حافظ وقاری مولوی انوارالحق فاروقی: ۱۹۰۳ھ میں لکھنؤ میں ولادت ہوئی، قاری ضیاءالدین سے تجوید وقراءت سیکھی، پھر محمد صدیق میمن سے قراءت حفص وقراءت سبعہ کی سند حاصل کی، علامہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ کے دور میں ڈابھیل میں شیخ التجوید کے عہدہ پر فائز تھے۔

(۴۹) الحاج قاری ومولانا محمد شاکر صاحب: بڑودہ کے متوطن ہیں، ۱۳۰۷ھ میں ولادت ہوئی، دارالعلوم حیدرآباد اور ندوۃ العلماء سے علوم حاصل کئے، ندوہ میں ہی تجوید سیکھتے رہے، پھر قاری سید ابراہیم وقاری محمد حسین سے مزید استفادہ کیا۔

پھر جیسا کہ انگریزی دور کی ابتداء میں خطۂ گجرات میں علم قراءت وتجوید کی خدمات کچھ ماند پڑ گئی تھیں، لیکن خدمت دین کی غرض سے اور دفاع عن الدین کے لئے قائم کیے گئے دینی مدارس میں سے جامعہ ڈابھیل، جامعہ راندیر اور بعد آزادی جامعہ دارالعلوم فلاح دارین، ترکیسر وغیرہ نے اس فن کو معراج پر پہونچانے میں خصوصی کردار ادا کیا، ان کے علاوہ دیگر جامعات ومدارس بھی قابل قدر ہیں جنہوں نے اس فن کی خدمات کے لئے اپنے شب وروز قربان کردیئے اور اپنی اعلی صلاحیتوں کو اس عظیم فن کی نشاۃ ثانیہ کے لئے نچھاور کردیا، ان ہی بےلوث خادموں کی محنتوں کا ثمرہ ہے جو آج ہم ان مدارس وجامعات میں دیکھ رہے ہیں۔

رب کریم سے دعاء ہے کہ سلف صالحین کی قبروں کو بقعۂ نور بنائے اور ہماری محنتوں کو

دوام وبقاء بخش کراس سے نسلوں کو مستفید ہونے کے مواقع میسر فرمائے، اورابی ابن کعب رضی اللہ تعالیٰ عنہ جیسے عظیم قاریٔ قرآن اور نافع وحفص، بصری وکوفی، شامی وکسائی جیسے خدام قرآن کے زمرہ میں ہماراحشر فرمائے، آمین یارب العالمین!

تاریخ، سوانح اور جغرافیہ

علامہ قطب الدین نہروالی مکی حنفی نے الاعلام باعلام بلد اللہ الحرام تحریر فرمائی، اس کا مخطوطہ فہرست عربی مخطوطات کتب خانہ برلن (٦-٦٠٦٥) فہرست عربی مخطوطات نیشنل لائبریری پیرس (۴۲-۱۰۳۷) لوتھ (۹-۱۷۰۸) بانکی پور (۱۰۸۸) فہرست عربی مخطوطات برٹش میوزیم میں موجود ہے۔

بہاؤ الدین عبدالکریم بن محبّ الدین بن علاء الدین :۹۶۱ھ میں احمد آباد میں پیدا ہوئے، اپنے والد کے ساتھ مکہ معظّمہ گئے اور وہاں اپنے چچا قطب الدین محمد نہروالی اور ابن حجر ہیثمی سے تحصیل علم کیا، تعلیم سے فراغت کے بعد مدرسہ المرادیہ میں استاذ مقرر ہوئے، پھر مکہ مکرمہ کے مفتی مقرر ہوئے اور ۹۹۰ھ میں حرم شریف کے امام بنائے گئے، انہوں نے صحیح بخاری کی ایک شرح لکھی تھی، جو بانکی پور (۱۰۸۹) میں موجود ہے۔

انہوں نے اعلام العلماء الاعلام ببناء مسجد الحرام لکھی، یہ کتاب الاعلام بالاعلام بلد اللہ الحرام کا خلاصہ ہے، یہ کتاب بھی بانکی پور میں ہے۔

عبداللہ محمد بن سراج الدین عمر نہروالی آصفی الغ خانی معروف بہ حاجی دبیر کی ظفر الوالہ بمظفر وآلہ، ۳/جلدیں، مرتب ڈینی سن راس، اس کا مخطوطہ کلکتہ (۸٦) کتب خانہ عارف بے مدینہ منورہ میں ہے۔

مقدمہ ظفر الوالہ ۲/ ۱۹ ایران کی دوسری تصنیف فواتح الاقبال وفوائد الانتقال کا تذکرہ کیا گیا ہے۔

محی الدین عبدالقادر عیدروس احمد آبادی نے النور السافر فی اخبار القرن العاشر تحریر فرمائی، اس کا مخطوطہ برٹش میوزیم (۹۳۷) بانکی پور (۶۵۹) بوہار (۲۷۳) رامپور (۶۵۰) آصفیہ (۱/۳۴۴-۲/۱۸۰) میں درج ہے۔

جعفر صادق عیدروس نے الاصفیاء تعریب سفینة الاولیاء لدار شکوہ تحریر کی جو رامپور (۳۳۲) میں موجود ہے۔

اس کے علاوہ شیخ عبدالکریم بن عطاء اللہ شیرازی نے طبقات محمود شاہی لکھی، یہ کتاب محمود شاہ بیگڑہ سلطانِ گجرات کے زمانہ کی تصنیف ہے، اس کتاب میں آدم علیہ السلام کی پیدائش سے ۹۱۵ھ تک کے حالات وواقعات درج ہے۔

تاریخ گجرات بزبان عربی شیخ عبداللہ محمد بن عمر مشہور بہ حاجی دبیر کی ایک جامع کتاب ہے اور لنڈن سے چھپی تھی۔

منظور الانسان یہ کتاب فارسی زبان میں شیخ یوسف بن احمد بن محمد حسینی گجراتی نے مشہور عربی تاریخ ابن خلکان کا ترجمہ غالباً ۱۸۸۹ء میں گجرات کے سلطان محمود بن محمد بیگڑا کے حکم سے کیا ہے۔

روضة الاصفیاء انبیاء کرام کے حالات وواقعات میں شیخ محمد طاہر نے تصنیف فرمائی، تذکرہ الابرار سید محمد رضوی بخاری گجراتی کی تصنیف ہے، قاضی نورالدین حسین حسینی شیرازی نے شعراء دکن کا تذکرہ کرتے ہوئے ۱۲۶۸ھ میں مخزن الشعراء لکھی، اور شیخ صبغة اللہ بن روح اللہ کے حالات میں شیخ عبدالفتاح گجراتی نے ۱۰۳۵ھ میں ''کتاب المناقب'' تحریر فرمائی۔

سیرت

سید عبد القادر بن شیخ گجراتی حضرمی نے الحدائق الخضرۃ لکھی، جس میں نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے عشرۂ مبشرہ صحابہ کی سیرت تحریر فرمائی، اس کے علاوہ آپ نے اتحاف الحضرۃ العزیزۃ بعیون السیرۃ الوجیزۃ ،المنتخب المصطفی فی اخبار مولد المصطفی اور المنہاج الی معرفۃ المعراج لکھی۔

انساب میں سید علی اصغر حسینی گجراتی نے تذکرۃ السادۃ البخاریۃ لکھی۔

نحو وصرف

تعلیق الفرائد فن نحو میں محمد بن ابوبکر بن عمر الدمامینی نے لکھی اور علم نحو سے متعلق یہ پہلی تصنیف ہے، جو ہند میں عربی میں لکھی گئی ہے، یہ کتاب ابن مالک کی تصنیف تحصیل الفرائد و تکمیل المقاصد کی شرح ہے، جو مصر کے ایک ممتاز عالم اور کامل نحوی محمد بن ابوبکر الدمامینی نے لکھی، وہ عمر کے آخری حصہ میں مصر سے ہندوستان آگئے تھے اور یہاں ان کو شاہانہ سرپرستی حاصل ہوگئی تھی، مصنف نے یہ کتاب گجرات میں بمقام کھنبایت قلم بند کی تھی، جہاں وہ ۸۲۰ھ میں آئے تھے اور اس کو سلطان احمد شاہ والیٔ گجرات کے نام سے معنون کیا تھا۔

انہیں کی دوسری تصنیف المنہل الصافی ہے جو محمد بن عثمان بن عمر بلخی کی تصنیف وافی کی شرح ہے، ۸۲۵ھ میں مصنف جب حسن آباد (گلبرگہ) جارہے تھے، تو انہوں نے وہاں کے فرماں روا احمد شاہ بہمنی کے لئے یہ شرح لکھی تھی۔

تحفۃ الغریب فی شرح مغنی اللبیب یہ بھی مصنف مذکور ہی کی شاہ کار ہے، جو

ابن ہشام کی تصنیف مغنی اللبیب کی شرح ہے، یہ شرح ۸۲۴ھ میں لکھی گئی تھی، اس وقت مصنف نہروالہ میں مقیم تھے، یہ تینوں کتابیں جو ایک ہی شخص نے ہندی سرپرستی میں لکھی تھی بہت قیمتی تصانیف ہیں، اور بغیة الوعاة میں سیوطی نے ان کتابوں کے مصنف کی بہت تعریف کی ہے۔

ان کے علاوہ اور بھی علماء ہیں جنہوں نے نحو وصرف سے متعلق کتابیں اور شروحات تصنیف فرمائیں، ان میں سے شیخ وجیہ الدین علوی گجراتی، شیخ عبدالنبی بن عبداللہ شطاری گجراتی، شیخ نورالدین محمد صالح گجراتی اور شیخ جمال الدین بن رکن الدین گجراتی نے شرح جامی کا حاشیہ لکھا۔

اور شیخ وجیہ الدین علوی گجراتی نے ملک العلماء قاضی شہاب الدین دولت آبادی جونپوری کی الارشاد کی شرح لکھی۔

شیخ نورالدین محمد صالح گجراتی اور شیخ جمال الدین بن رکن الدین گجراتی نے المنهل الصافی پر حاشیہ لکھا، اور شیخ محمد محسن بن عبدالرحمٰن قرشی احمد آبادی نے خلاصة الکافیه لکھی۔

اور شیخ محمد بن یوسف سورتی نے المقرب فی النحو ، الزيادة العراقية على الكافية الشافية اور الانصاف فيما جرى فى منع ابى هريرة من الخلاف لکھی۔

شیخ جمال الدین گجراتی نے مشکوۃ المصابیح کے الفاظ غریبہ کی تشریح وتوضیح کی، مولانا حکیم سید عبدالحی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کو عربی لغات میں شمار کی ہے۔

بلاغت، معانی اور عروض

شیخ وجیہ الدین علوی نے حاشیہ مطول اور حاشیہ مختصر المعانی، شیخ نورالدین بن صالح

گجراتی نے المعول حاشیہ مطول ، شیخ فرید الدین احمد آبادی اور شیخ جمال الدین بن رکن الدین گجراتی نے حاشیہ مطول اور حاشیہ مختصر المعانی اور شیخ محمد بن فرید بن محمد شریف صدیقی گجراتی نے مطول کے حاشیۂ خطابی پر حاشیہ لکھا۔

ادب وانشاء

شیخ عبدالقادر عیدروس احمد آبادی نے فتح الجواد فی شرح قصیدة عبد الهادی (بوہار:۴۳۲) اور شرح القصیدة القونیة (بوہار:۴۳۳، برلن:۴۰۱۲) تحریر فرمائی۔

شیخ ابوعبداللہ بن یوسف سورتی گجراتی کی علوم ادبیہ پر بہت سی تصانیف ہیں، اوران کے عربی میں بڑے اچھے اشعار ہیں، سید ابوبکر بن محسن باعبود علوی سورتی نے ۱۱۲۸ھ میں مقامات ہندیہ تصنیف کی، قاضی عیسیٰ بن عبدالرحیم گجراتی نے شرح خطبہ قاموس اور شیخ محمد بن یوسف سورتی گجراتی نے دیوان حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ کی ایک جامع شرح لکھی، شیخ وجیہ الدین علوی نے المنهل اور جامی میں مذکور اشعار کی شرح لکھی۔

فلسفہ ومنطق

شیخ نورالدین بن شیخ محمد احمد آبادی نے شرح تہذیب المنطق لکھی، جو آصفیہ (۴/ ۶۲۲) میں مذکور ہے،اس کے علاوہ انہوں نے شرح المطالع ، حاشیہ شرح شمسیہ لکھی، شیخ وجیہ الدین علوی نے حاشیہ شرح شمسیہ اوراسی نام سے حاشیہ شیخ جمال الدین بن رکن الدین گجراتی نے لکھا، اور شیخ عبدالنبی بن عبداللہ گجراتی نے حاشیہ شرح تہذیب تصنیف فرمائی۔

نیز شیخ وجیہ الدین علوی نے حاشیہ شرح حکمة العین بھی لکھی۔

کلام، عقائد اور فرق

خطیب ابوالفضل گاذرونی گجراتی نے الحاشیة علی شرح المواقف **لکھی، جو اسلامیہ کالج پشاور (۸۵۶) میں ہے، شیخ وجیہ الدین علوی** نے الحاشیة علی شرح العقائد للتفتازانی اور الحاشیة القدیمة **تحریر فرمائی، شیخ ابوبکر محی الدین عبدالقادر عیدروس احمد آبادی** نے الاعتقادیة **(بوہار:۴۵۴)** کتاب المنهاج الی معرفة المعراج **(برلن: ۲۶۰۹)** صفوة الصفوة فی بیان احکام القهوة **(برلن:۵۴۷۹)** الدر الثمین فی بیان المهم من علوم الدین **(بوہار:۱/۴۵۳) قلم بند کی۔**

شیخ نورالدین احمد آبادی نے الحاشیة القدیمة علی الحاشیة القدیمة **لکھی، جس کا ذکر تذکرۂ علماء ہند میں کیا ہے، اس کے علاوہ** الحاشیة علی شرح المواقف **اور** حل المعاقد لحاشیة شرح المقاصد **بھی تحریر فرمائی۔**

ملک بن ملک پیر محمد فاروقی احمد آبادی نے عقد اللآلی الغاشیة فی حاشیة الشرح و شرح الحاشیة **(بنگال: اے، ای ۴۵) تصنیف کی اور شیخ یوسف احمد آبادی** نے عقائد **تالیف فرمائی، اور ابراہیم ابن اسماعیل جوناگڑھی** نے وسیلة النجاة فی احکام الممات **لکھی، جس پر حافظ نذیر احمد کا مختصر نوٹ بھی ہے، جو بنگال میں موجود ہے۔**

شیخ شہاب الدین گجراتی نے کنز الدلائل **لکھی، جو مہدوی مذہب پر ایک جامع کتاب ہے، اور شیخ برہان الدین بن اللہ بخش گجراتی** نے الولایة شواهد الولایة **۱۰۵۲ھ میں لکھی، اور شیخ قاسم بن یوسف گجراتی نے ۱۰۱۶ھ میں** مطلع الولایة **تالیف فرمائی۔ یہ دونوں مہدوی فرقہ سے متعلق کتابیں ہیں۔**

شیخ عبدالنبی بن عبداللہ شطاری گجراتی نے سواطع الالهام شرح تهذیب الکلام،

شیخ برہان الدین لار محمد حسینی پٹنی نے تنقیح الکلام شرح تہذیب الکلام ،شیخ نورالدین بن محمد صالح گجراتی نے حاشیہ علی القدیمہ لکھی۔

شیخ وجیہ الدین علوی نے حاشیة علی التجرید ،عضدیہ کی شرح دوانی پر حاشیہ، حاشیة شرح عقائد النسفی ، حاشیة شرح المقاصد ، حاشیة شرح المواقف تالیف فرمائیں۔

شیخ عبدالنبی بن عبداللہ شطاری گجراتی نے سید شریف کی شرح عضدیہ پر حاشیہ مسمی بہ فیض الخبیر اور جمال الدین بن رکن الدین گجراتی نے حاشیة شرح العقائد للنسفی ، حاشیہ برحاشیہ خیالی، حاشیہ شرح موافق اور شیخ فریدالدین گجراتی نے حاشیۂ خیالی اور احمد بن سلیمان حنفی گجراتی نے فیوض القدس تالیف فرمائی۔

تصوف اور اخلاقیات

’النورالسافر‘ کے مطابق قاضی عیسیٰ بن عبدالرحیم گجراتی نے کئی کتابیں لکھی تھیں،مگر ان کے نام درج نہیں کئے گئے،شیخ وجیہ الدین علوی نے الحقیقة المحمدیہ (انڈیا آفس، ۱۳۸۱) تصنیف فرمائی،اس کے علاوہ شرح لوائح ، اوراد الشیخ تالیف فرمائی۔

انہیں کے شاگرد وخلیفہ مجد الدین صبغۃ اللہ بن روح اللہ حسینی بھروچی گجراتی نے محمد خطیر الدین غوث گوالیاری کی جواہر خمسہ کی تعریب کی، یہ معرب کتاب بشکل مخطوط لوتھ(۲/ ۱۷۶) پیرس (۱۱۹۷) قاہرہ(۲/ ۷۸) برلن ،رامپور (۳۳۴) اور بنگال (۷) کی فہارس میں مندرج ہے،دوسری تصنیف کتاب الوحدة ، ارادة الدقائق فی شرح مرآة الحقائق، ما لایسع للمرید ترکہ کل یوم من سنن القوم تالیف فرمائی۔

شیخ نورالدین بن محمد صالح گجراتی نے الطریق الامم شرح فصوص الحکم ،شیخ

جمال الدین بن رکن الدین گجراتی نے شرح فصوص الحکم ، شرح العوارف ، شرح آداب المریدین ، فتح الجمال شرح مثنوی ، شرح بحرالاسرار ، شرح اشرار الخلوۃ ، شرح سوانح الجامی ، شرح التعریف ، شرح التقسیم ، مراصد الکمال، مشھد الجمال ، شرقات السلوك ، قرۃ العین ، نور الاولیاء ، رکن الطریقۃ لکھی۔

شیخ عبدالنبی بن عبداللہ شطاری گجراتی نے شوارق اللمعات شرح لمعات ، الروائح شرح لوائح تالیف فرمائی۔

شیخ حسن محمد چشتی گجراتی نے شرح نزھۃ الارواح ،اسی نام سے شیخ علی شیر احمد آبادی نے بھی کتاب تالیف فرمائی،علی شیر شطاری احمد آبادی نے اس کے علاوہ شرح سوانح بھی لکھی، شیخ محمد بن جلال حسینی گجراتی نے الجمعیات الشاھیۃ فی الاذکار والاشغال، شیخ نورالدین محمد بن علی شافعی عیدروسی گجراتی نے طریقۂ صوفیہ پر الرحیق المحمدی، شیخ خیر الدین بن محمد زاہد سورتی نے مجمع السلوکین اور شیخ جلال بن محمد حسنی گجراتی نے مرأۃ الرؤیا فی تاویل الاحلام ، مفتاح الحاجات فی الادعیۃ والاذکار تألیف فرمائی۔

اس کے علاوہ اور بھی مختلف کتب بزبان عربی علماء گجرات کی قلمی جولانیوں پر شاہد ہیں، جیسے علم الہیات میں حاشیہ شرح چغمنی ، شرح رسالۃ القوسجی، شاہ وجیہ الدین علوی نے لکھی، فن طب میں شیخ پیر محمد گجراتی کی صحۃ الامراض ، حکیم عبدالمجید بن محمد سورتی مالوی کی طب قدیم وجدید پر ۳/جلدوں میں حرج البحرین اور حکیم نورالدین خان سورتی کی میزان الطب الجدید ہے۔

نوٹ: یہ تمام تفصیلات مولانا حکیم سید عبدالحی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی تصنیف ''اسلامی علوم وفنون ہندوستان میں'' (دارالمصنفین، اعظم گڑھ، یوپی) اور ڈاکٹر زبید احمد صاحب کی کتاب ''عربی ادبیات میں پاک وہند کا حصہ'' (ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور) سے لی گئی ہے۔

قیام مدارس اوراس کی تاریخ ارتقاء

برصغیر ہی نہیں، عالم عرب اور عالم اسلام کی تاریخ علمائے دین، طالبان علوم نبوت اور مدارس اسلامیہ کی تابناک خدمات اور عظیم الشان عطیات سے منور ہے، فکر اسلامی کی توسیع، الحادی نظریات کے مقابلہ میں دین کا دفاع، تہذیب اسلامی کی تشکیل واستحکام، معاشرہ کی ترقی وتعمیر اور منحرف رجحانات ورسوم کی اصلاح کے مختلف میدانوں میں مدارس اور علمائے اسلام کے کارنامے اظہر من الشمس ہے۔

مدارس اسلامیہ تعلیمات کی نشرواشاعت کے مراکز ہیں، دین کے قلعے ہیں، یہ وہ ادارے ہیں جو طالبان علوم کی تعلیم وتربیت کے لئے قائم ہوتے ہیں، بلکہ ان پر معاشرہ کی اصلاح کا بھی بارگراں ہوتا ہے۔

ان مدارس کی ابتدائی وارتقائی تاریخ کیا ہے، اس کے لئے اتنا ہی کہہ دینا کافی ہوگا کہ اسلام ہندوستان میں پہلی صدی میں آیا، اس لحاظ سے مساجد ومدارس کی تاریخ بھی اس ملک میں اتنی ہی قدیم ہے، مسلم بستیاں ابتداء میں ساحلی علاقوں مالابار، مدراس اور سندھ میں وجود میں آئی اور شمالی ہند میں مختلف شہروں بھروچ، قنوج، مالوہ وغیرہ علاقوں میں قائم ہوئی، ہوسکتا ہے ان بستیوں ہی سے مدارس کی ابتداء بھی ہوچکی ہو۔

اس سے پہلے تفصیل گذرچکی ہے کہ گجرات میں مسلمانوں کی آمدورفت ۱۵ھ/ ۶۳۶ء

سے شروع ہوگئی اور سواحل گجرات پر مختلف مقامات میں ان کی بستیاں قائم ہوگئی تھیں، بعض بعض مقامات کی آبادی دس دس ہزار تھی، جس میں مستقل خاندان بھی تھے۔

راشت کوٹ راجاؤں کے عہد میں مسلمان زیادہ آباد ہوئے، پھر سولنکیوں نے ان کی جو قدرافزائی کی، اس سے ان کی ہمت اور بڑھ گئی اور وہ اور زیادہ آ کر آباد ہو گئے، اسی عہد سے مسلمانوں نے گجرات میں مدارس قائم کرنے شروع کردیئے، چنانچہ سدھ راج جے سنگھ کے عہد میں شیعہ بوہروں کے ابتدائی مدارس قائم ہوئے، لیکن مسلمان بچوں کے لئے مخصوص تھے، تغلق کے زمانہ تک ان کا حال یہی رہا، سلاطین گجرات کے زمانہ میں حکومت کے محکموں اور دفتروں میں ہندوؤں کی بھرتی شروع ہوئی تو انہوں نے ہر محکمہ کی طرح ان مدارس سے بھی فائدہ اٹھایا، تعلیم کے حصول میں ناگروں نے سب سے زیادہ سبقت کی اور اس سے انہوں نے مغل سلطنت کے آخر زمانہ تک فائدہ اٹھایا۔

مسلمانوں نے اپنے عہد میں مختلف قسم کے مدارس قائم کئے اور ہر فن کی تعلیم و تدریس کی طرف انہوں نے توجہ کی، ان میں چند مدارس کا حال ذیل میں لکھا جاتا ہے۔ ۶۵۵ھ/ ۱۲۵۷ء میں بمقام نہروالہ پٹن میں پتھر کی ایک عالی شان مسجد تعمیر ہوئی تھی، اس کی تاریخ میں بہت سے اشعار کہے گئے تھے۔

اس وقت پٹن میں ہندو راجاؤں کی حکومت تھی، یہاں ایک مدرسہ بھی قائم کیا گیا تھا، جس میں ہر قسم کی دینی تعلیم ہوتی تھی، اس کے منتظم مولانا ابو یوسف محمد یعقوب تھے۔

۹۷۵ھ/۱۲۹۲ء میں جب مظفر شاہ گجراتی اس ملک کا فرمان روا ہوا تو اس وقت مولانا محمد یعقوب کے پوتے مولانا مخدوم عالم تھے۔

سلطان احمد اول کے عہد میں بہت سے مدرسے قائم ہوئے، جیسا کہ حلوی شیرازی

نے اپنی کتاب احمد شاہی میں تحریر کیا ہے، ان میں سے ایک مدرسہ کے مدرس اعلی محمد بن ابوبکر مخزومی تھے، یہ دمینی کے نام سے مشہور تھے، یہ اسکندریہ میں پیدا ہوئے، قاہرہ اور مکہ مکرمہ میں تعلیم حاصل کی، نحو، ادب اور فقہ کے ماہر تھے، شاعر بھی تھے، پہلے اسکندریہ کے مدارس میں درس وتعلیم کی خدمت انجام دیتے رہے، پھر قاہرہ میں آئے اور کچھ دن درس دے کر سرکاری عہدہ پر فائز ہوگئے تھے، پھر حج کر کے یمن چلے گئے، یہ ۸۱۹ھ/ ۱۴۱۶ء کا واقعہ ہے، ۸۲۰ھ/ ۱۴۱۷ء میں گجرات پہنچے، یہاں ہاتھوں ہاتھ لئے گئے، شاہی محکمہ کی طرف سے اس مدرسہ کے مدرس اعلی مقرر ہوئے، کئی برس تعلیم دی، اس زمانہ میں کتاب دانی زیر درس تھی، طلبہ نے اس کی شرح کی خواہش کی، یہ اسی فکر میں تھے کہ بنبانی خاندان سے علمی مباحثہ ہوگیا، اس کی وجہ سے دونوں میں اس قدر رنجش بڑھی کہ دونوں ایک دوسرے کے درپۓ آزار ہوگئے، بنبانی خاندان گجرات میں بہت بااثر تھا، اس کے ارکان حکومت کے بڑے بڑے عہدوں پر فائز تھے، انہوں نے اپنے اثر ورسوخ سے ان کو جیل میں ڈلوادیا، جیل سے چھوٹے تو سلطان احمد بہمنی کے پاس دکن چلے گئے، اس نے ان کی بڑی قدر دانی کی، جب ان کو پورا اطمینان ہوگیا تو جزیرہ مہائم میں قیام کر کے دانی کی شرح لکھ ڈالی اور ۸۲۵ھ/ ۱۴۲۱ھ میں گلبرگہ میں اس کو صاف کیا اور اس کا نام ''المنہل'' رکھا جو آج تک مشہور ہے۔

ذیل میں ماضی کے کچھ مشہور مدارس کا تذکرہ کیا جاتا ہے، جن کا تعلق روشن دور یعنی ۸؍تا۱۰؍ویں صدی سے زیادہ ہے۔

قاضی صاحب کا مدرسہ

قاضی برہان الدین نہروالی ایک مشہور عالم تھے، ان کے علم وفضل کی شہرت کا یہ عالم تھا کہ دور دور سے طلبہ آکر فیض حاصل کرتے تھے، ان کا مدرسہ طلبہ سے ہر وقت بھرا رہتا تھا،

ظفر الوالہ کے مصنف کا بیان ہے کہ یہ پہلے بزرگ ہیں، جنہوں نے علم وفن کے فروغ و اشاعت میں بڑی کوشش کی اور گجرات میں ان کے تلامذہ نے علم کو بیحد ترقی دی، ان سے قبل ان کے والد شہاب الدین احمد بھی جو مخدوم بڑا کے لقب سے مشہور تھے، اشاعت علوم میں ساعی رہے، ان کے شاگرد بڑے بڑے عہدوں پر فائز ہوئے۔

مدرسہ محمد بن طاہر

نہروالہ پٹن میں ایک اور مدرسہ تھا، جس میں ہر قسم کے علوم پڑھائے جاتے تھے، مگر حدیث کی تعلیم کے لئے زیادہ مشہور تھا، علامہ محمد بن طاہر پٹنی متوفی ۹۸۶ھ/ ۱۵۷۸ء اس کے مدرس اعلی تھے، علامہ موصوف فن حدیث کے امام تھے، شہادت کے بعد ان کے لڑکے اور پوتے کے زیر اہتمام یہ مدرسہ عرصۂ دراز تک چلتا رہا، عہد عالم گیر میں جب نیا مدرسہ قائم ہوا، تو یہ اسی میں منضم ہو گیا۔

مدرسہ عالیہ علویہ

علامہ شاہ وجیہ الدین متوفی ۹۹۸ھ/ ۱۵۸۹ء کے عہد میں احمد آباد کے شاہی محل کے بالمقابل (جہاں آج پارسی کلب ہے) روضہ شاہ وجیہ الدین کے متصل یہ مدرسہ قائم کیا گیا تھا، یہ درحقیقت اس زمانہ کی یونیورسٹی تھی جس سے گجرات خاندیس، کاٹھیاواڑ اور دکن کے مدارس ملحق تھے، اس مدرسہ میں منطق، فلسفہ، تصوف اور علوم دینیہ کی تعلیم کا خاص اہتمام تھا، اسی کے ساتھ ایک دارالاقامہ بھی تھا، جس کے شکستہ حجرے اب تک موجود ہیں، جہاں گیر کے عہد میں طلبہ کے لئے وظائف بھی مقرر تھے، اس پر متعدد گاؤں وقف تھے، ۹۵۰ھ سے ۹۹۸ھ تک شاہ صاحب اس کو خود چلاتے رہے، پھر ان کے لڑکے اور پوتے چلاتے رہے، گیارہویں صدی کے آخر تک یہ پورے عروج پر تھا، مدرسہ ہدایت بخش قائم ہوا تو اس پر زوال آ گیا۔

مدرسہ اسحاق بھروچ

مولانا اسحاق علامہ شاہ وجیہ الدین کے شاگرد تھے، انہوں نے تکمیل تعلیم کے بعد بھروچ میں ایک مدرسہ عالیہ قائم کیا، جس کے ساتھ ایک دارالاقامہ بھی تھا، عہد جہاں گیر میں اس کے اخراجات کے لئے کچھ موضع بھی وقف تھے، مولانا اسحاق کے بعد عرصہ تک یہ مدرسہ قائم رہا، پھر تنزل کرتے کرتے ایک معمولی مکتب کی شکل میں آ گیا، ۱۹۲۱ء میں راقم (مولانا سید ابوظفر ندوی) اپنی تاریخی تحقیقات کے سلسلہ میں بھروچ تشریف لائے تھے، تو اس وقت یہ مدرسہ بند ہو چکا تھا، مکانات خالی پڑے تھے، یہ مدرسہ ۱۰۲۵ھ/۱۶۱۲ء کے آگے پیچھے غالباً قائم ہوا تھا، وہاں ابھی حال میں طلبہ کے لئے ایک بورڈنگ تعمیر ہوگئی ہے، مشہور ہے کہ اس مدرسہ سے پہلے ۴۳۰ھ میں ایک مدرسہ یہاں موجود تھا، ممکن ہے کہ بعد میں اس کے بند ہو جانے پر اسی کی تجدید کی گئی ہو۔

صدر جہاں کا مدرسہ

گجرات میں بنبانی ایک مشہور خاندان گزرا ہے، جس کے زیادہ تر افراد اہل علم اور مصنف ہوئے ہیں، اور ان کی تصانیف گجرات کے تمام مدارس میں زیر درس رہی ہیں، اس خاندان کے گل سر سبد قاضی صدر الدین کے لڑکے ملک القضاۃ صدر جہاں حسام الدین بنبانی تھے، جو بڑے جید عالم تھے، ان کا ایک مدرسہ تھا، جو سلطان محمود اعظم کے عہد تک قائم تھا، اس خاندان کے لوگوں کی کتابیں زیادہ تر فن تفسیر، حدیث، نحو، ادب اور تصوف میں ہیں، اس سے خیال ہوتا ہے کہ اس مدرسہ میں انہی علوم کی تعلیم ہوتی تھی، معقولات سے اس خاندان کو کم دلچسپی تھی، اس خاندان میں مولانا فیض اللہ، مولانا زین العابدین، مولانا حسام الدین، قاضی صدر الدین، مولانا منہاج الدین بن صدر الدین بڑے پایہ کے عالم اور مصنف گذرے

ہیں، اس مدرسہ میں بڑے اچھے اچھے لوگ تعلیم پاتے تھے اور بڑے بڑے علماء پیدا ہوئے، صدر جہاں قاضی صدر الدین کا اصل وطن چانپانیر تھا، لیکن بود و باش احمد آباد میں تھی اور مدرسہ بھی یہیں تھا، میاں مخدوم جو حضرت شاہ عالم کے متوسلین میں تھے، اسی مدرسہ سے فارغ التحصیل تھے، صدر جہاں کی موت احمد آباد میں ہوئی تھی اور نور گنج میں علم و فن کا یہ خزانہ دفن ہو گیا۔

مدرسہ عمادیہ

مولانا عماد الدین محمد بن محمود طارمی ایک مشہور اہل علم تھے، طارم شیراز کے پاس ایک گاؤں کا نام ہے، یہ یہیں کے رہنے والے تھے، تکمیل تعلیم کے بعد حضرت شاہ عالم کی ملاقات کے لئے گجرات آئے، جن کی دعا سے وہ پیدا ہوئے تھے، لیکن ان کے آنے سے قبل شاہ عالم وفات پا چکے تھے، گجراتیوں نے مولانا عماد الدین کی اتنی قدر دانی و قدر افزائی کی کہ وہ وہیں رہ پڑے، علوم نقلیہ و عقلیہ کے ماہر تھے، خصوصاً علوم عقلیہ میں ان کو بڑی دست گاہ حاصل تھی، علم سیمیا اور کیمیا سے بھی واقف تھے، تصوف کا بھی ذوق تھا، متعدد کتابوں کے مصنف ہیں، ان کے مدرسہ میں طلبہ کا بڑا مجمع رہتا تھا، بڑے بڑے لوگ اس سے فارغ ہو کر نکلے، حضرت شاہ وجیہ الدین علوی اور قاضی عیسیٰ انہیں کے شاگرد رشید ہیں، انہوں نے متعدد سلاطین گجرات کا عہد دیکھا، محمود اعظم، مظفر شاہ اور بہادر شاہ یکے بعد دیگرے ان کے سامنے تخت نشین ہوئے، حضرت ملک قطب الدین خلیفہ حضرت شاہ عالم کے مرید تھے، گجرات پر ہمایوں کے حملہ کرنے سے پہلے وہ پٹن نہر والہ میں تھے، دوسری جمادی الاولیٰ ۹۴۱ھ/۱۵۳۴ء میں وفات پائی اور وہیں مدفون ہوئے، اسی تاریخ میں ان کا عرس ہوتا ہے۔

مدرسہ کردیہ

یہ مدرسہ مولانا احمد بن سلیمان سے منسوب ہے،ان کا اصل وطن کردستان تھا،ان کے والد مولانا سلیمان پہلے دہلی آئے اور مولانا عبدالحق محدث دہلوی سے فیض یاب ہوئے، پھر گجرات وارد ہوئے ،مولانا احمد نے مولانا شریف ،مولانا ولی محمد، شیخ فرید دیانت خان شاہ قباد سے تعلیم حاصل کی اور فن حدیث کی تحصیل اپنے والد سے کی ،اپنے وقت کے بہترین عالم تھے،علوم نقلیہ میں خاص کمال حاصل تھا،ان کا مدرسہ بڑا بارونق تھا،ایک بڑی جماعت نے ان سے استفادہ کیا اور وقت کے بڑے بڑے علماء اور فضلاء ان کے مدرسہ سے پڑھ کر نکلے، جن پر گجرات بجاطور پر فخر کرتا ہے،مولانا نورالدین جیسے کامل الفن بزرگ ان کے ارشد تلامذہ میں تھے، یہ متعدد کتابوں کے مصنف بھی تھے،''فیوض القدسی'' ان کی مشہور کتاب ہے، جس کا مصنف مرأۃ احمدی بڑا مداح ہے، کہتے ہیں کہ اس کتاب کو الہامی کہنا چاہیئے ،ان کے پاس ایک بڑا کتب خانہ بھی تھا،جس کی بعض کتابیں درگاہ حضرت پیر محمد شاہ احمد آباد کے کتب خانہ میں اب تک موجود ہیں۔

مدرسہ عیدروس

سید محمد عیدروس کے مزار کے پاس حاجی زاہد بیگ نے بزمانہ تولیت شیخ جعفر صادق بمقام سورت ۱۰۴۱ھ/ ۱۶۳۱ء میں ایک مدرسہ تعمیر کرایا تھا،جس میں عرصہ دراز تک علوم وفنون کی تعلیم دی جاتی رہی۔

مدرسہ خیریہ

اس کے بانی خیرالدین محمد زاہد سورتی ہیں، یہ مولانا محمد بن عبدالرزاق سورتی کے شاگرد تھے، حج کو گئے تو مولانا شیخ حیات سندی سے حدیث کی سند حاصل کی ، ۱۱۵۶ھ/ ۱۷۴۳ء سے اس مدرسہ میں تعلیم دینے لگے ،اس مدرسہ میں فن حدیث کی تعلیم اعلی پیمانہ پر

ہوتی تھی، ۱۲۰۶ھ/ ۱۷۹۱ء میں ان کا انتقال ہوگیا، سید مرتضی بلگرامی ثم زبیدی المصری حج کو جاتے ہوئے اسی مدرسہ میں کچھ دنوں رہ کر مستفید ہوئے تھے۔

خلاصہ یہ ہے کہ ان حضرات نے عرب سے یہاں آکر مدارس کا جال بچھایا اور گجرات میں علم کی خوب اشاعت کی اور گجرات سے بھی جو حضرات عرب گئے انہوں نے بھی آنے کے بعد مدارس کی بنیادیں ڈالی، تاکہ لوگوں میں علوم دینیہ کی ترویج ہو۔

ان کا علمی شوق وذوق اس قدر تھا کہ کئی ایک حضرات کا مستقل کتب خانہ بھی تھا، جس میں عربی کتابوں کا ذخیرہ تھا اور لوگ بھی اس سے مستفیض ہوتے تھے۔

مولانا ابوظفر ندوی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

> ممکن ہے گجرات میں کتب خانہ اسلامی حکومت قائم ہونے سے قبل وہاں کے نوآبادکار مسلمانوں کے عہد میں بھی رہا ہو، جیسا کہ مولانا محمد یعقوب صاحب الموجود ۶۵۶ھ/ ۱۲۵۸ء کے جامع مسجد پٹن میں قیام سے خیال ہوتا ہے، لیکن تاریخ میں صراحۃً اس کا ذکر نہیں ہے۔

گجرات کا شاہی کتب خانہ

گجرات میں سلطان احمد متوفی ۸۴۶ھ/۱۴۴۲ء نے خودمختار حکومت قائم کی، تو اس کے دربار میں تمام علوم وفنون کے اہل کمال جمع ہوگئے، ان کے فیض صحبت سے اس نے رفاہ عام کے جن کاموں کو شروع کیا، ان میں ایک کتب خانہ بھی تھا، سلطان محمد شاہ بن احمد شاہ متوفی ۸۵۵ھ/ ۱۴۵۱ء نے مدرسہ شمع برہانی کے طلبہ کے لئے اسی شاہی کتب خانہ سے کتابیں نکال کر وقف کی تھیں، اکبر نے جب گجرات فتح کیا تو اس کی کچھ کتابیں آگرہ لے گیا اور کچھ

لوگوں میں تقسیم کردیں، چنانچہ اسی تقسیم میں کچھ شیخ عبدالحق محدث دہلوی اور کچھ ملا عبدالقادر بدایونی کے حصہ میں بھی آئیں اور کچھ اکبری دربار کے مشہور شاعر فیضی کو بھی ملیں، باقی شاہی کتب خانہ میں داخل کردی گئیں۔

مولانا ابوظفر صاحب نے تقریباً ۳۷ر کتب خانوں کا تذکرہ کیا ہے، میں ان میں سے چند کا بطور مثال ذکر کرنا مناسب سمجھتا ہوں۔

مولانا طارمی کا کتب خانہ

مولانا محمد بن محمود طارمی علوم عقلیہ کے بڑے ماہر تھے، شیراز سے گجرات تشریف لائے تو اپنا کتب خانہ بھی ساتھ لائے، یہاں انہوں نے درس وتدریس کا مشغلہ اختیار کیا، کتب خانہ بڑا لاجواب تھا، جس میں ایران کی بہت سی نئی کتابیں بھی تھیں، ہمایوں کے آنے سے پہلے ہی پٹن میں ان کا انتقال ہوگیا۔

احمد بن سلیمان کا کتب خانہ

مدارس کے سلسلہ میں احمد بن سلیمان کا ذکر آچکا ہے، ان کے پاس بہت بڑا کتب خانہ تھا، ان کے بعد ان کے ورثاء جس طرح ان کا مدرسہ چلاتے رہے، کتب خانہ کی بھی حفاظت کرتے رہے، لیکن ۱۱۳۵ھ/۱۷۲۲ء میں ان کے پوتے محمد رضا بن غلام محمد بن احمد بن سلیمان کے زمانہ میں جب ترکہ تقسیم ہوا تو کتب خانہ کے بھی حصے بخرے ہوگئے، ان کی ایک بہن فاطمہ تھیں، کچھ کتابیں ان کے حصہ میں بھی آئیں، ان میں سے بعض کتب خانہ درگاہ حضرت پیر محمد شاہ احمد آباد میں موجود ہیں۔

آمود کا کتب خانہ

آمود (ضلع بھروچ) کے ٹھاکر صاحب کا کتب خانہ اس عہد کا مشہور کتب خانہ تھا،

۱۲۰۲ھ/ ۱۷۸۷ء میں ایک انگریز نے اس کو دیکھا تھا، اس میں صرف فارسی کی تین ہزار خوش خط کتابیں تھیں، جن میں مراکو کے سرخ چمڑے کی حسین جلدیں تھیں، کل کتابوں کی قیمت بارہ لاکھ تھی، حفاظت کے خیال سے تمام کتابوں پر گلی کا کپڑا اچڑھا ہوا تھا، جس پر سنہرا کام بنا رہتا تھا، کتب خانہ کا خاص عملہ تھا، جن میں خطاط، خوش نویس، جلد ساز اور ناظم کتب خانہ سب شامل تھے، یہ کتب خانہ ٹھاکر صاحب کے وارثوں کے پاس موجود تھا، لیکن سنا ہے کہ کتابیں بہت تھوڑی رہ گئیں ہیں۔

علامہ محمد بن طاہر کا کتب خانہ

نہروالہ پٹن میں علامہ محمد بن طاہر پٹنی متوفی ۹۸۶ھ/ ۱۵۷۸ء جو ایک مشہور محدث گذرے ہیں، ان کے بیٹے اور پوتے حکومت میں بڑے بڑے منصب پر فائز تھے، ان کے پاس ایک بڑا کتب خانہ تھا، جس میں انہوں نے عرب وعجم سے کتابیں منگوا کر جمع کی تھیں، جب تک اس خاندان میں علم رہا؛ کتابیں محفوظ رہیں، پھر آہستہ آہستہ ضائع ہو گئیں، ان کا کچھ حصہ آج بھی ان کے وارثوں کے پاس موجود ہے۔

علوی کتب خانہ

علامہ شاہ وجیہ الدین گجراتی متوفی ۹۹۸ھ/ ۱۵۸۹ء کی احمد آباد میں ایک مقدس ہستی تھی، آپ نے ۹۳۴ھ/ ۱۵۲۷ء میں ایک مدرسہ کی بنیاد رکھی، جو آپ کی وفات کے بعد ۱۲۴۶ھ/ ۱۸۲۰ء تک قائم رہا، اسی کے ساتھ ایک کتب خانہ بھی تھا، جو اتنا بڑا تھا کہ شاید ہی کوئی فن ایسا ہو جس کی کوئی کتاب اس میں موجود نہ ہو، بزرگوں کا بیان ہے کہ دو بڑے کمروں میں بے ترتیبی سے کتابیں رکھی ہوئی تھیں، جب خاندان سے علم جاتا رہا تو کتابیں بھی ضائع

ہوگئیں، اس صدی کے ابتداء میں مولوی عبدالمنعم صاحب مرحوم خطیب جامع مسجد بمبئی اور جناب یوسف صاحب بی اے، کھٹکے مرحوم بمبئی سے بہت ساری کتابیں اٹھا لے گئے، میں (مولانا ابوظفر ندوی مرحوم) نے ۱۹۲۱ء میں جب اس کتب خانہ کو دیکھا تو محض چند صندوقوں میں کتابیں رکھی تھیں، اب وہاں کچھ بھی نہیں ہے، ان میں سے کچھ کتابیں احباب کے نذر ہوئیں اور کچھ دریائے سابرمتی کی لہروں نے اپنے آغوش میں لے لیں۔

کھنبایت کا کتب خانہ

کھنبایت ایک مسلمان نواب کی چھوٹی سی ریاست تھی، مومن خان اول کے وقت سے یہاں عربی، ایرانی اور ہندوستانی علماء کا مجمع رہا ہے، ایک زمانہ میں اس کی آبادی بارہ لاکھ تھی، یہاں متعدد کتب خانہ تھے، ریاست پر زوال آیا تو اس کا سارا علمی شیرازہ بکھر گیا، کتب خانے بھی برباد ہوگئے، کھنبایت کے بعض خاندانوں میں ان کتب خانوں کا بچا کھچا سرمایہ موجود ہے۔

شیخ حضرمی کا کتب خانہ

احمدآباد میں شیخ عبدالقادر حضرمی متوفی ۱۰۳۸ھ/ ۱۶۲۸ء ایک مشہور بزرگ گذرے ہیں، ان کی تصنیفات میں النور السافر فی اعیان القرن العاشر بڑی مشہور کتاب ہے، سول ہاسپٹل احمدآباد کے پورب میں ایک گلی گئی ہے، اسی کے اختتام پر ایک مقام جوہری باڑہ ہے، وہیں موصوف کا مزار ہے، ان کے پاس ایک بڑا کتب خانہ بھی تھا، چوں کہ یہ بڑے مؤرخ تھے، محدث اور صوفی تھے، اس لئے اس کتب خانہ میں تصوف، حدیث اور تاریخ کی کتابیں زیادہ رہی ہوگی۔

بھروچ کا محکمہ قضا کا کتب خانہ

بھروچ گجرات کا قدیم شہر ہے، یونان کی فوجیں جب ہندوستان میں داخل ہوئی تھیں تو اس وقت بھی یہ شہر موجود تھا، یہاں ہمیشہ قضا کا محکمہ رہا، آخری عہد میں یہ مولانا سید احمد شیرازی کے خاندان میں آ گیا، ایک بڑا کتب خانہ بھی تھا، جس کا بچا کھچا حصہ ان کے اخلاف میں اب تک موجود ہے، ۱۹۳۲ء میں جب راقم (مولانا ابوظفر ندوی مرحوم) نے اس کو دیکھا تو اس وقت بھی بعض نایاب کتابیں موجود تھیں، مکرمی قاضی نورالدین کا بیان ہے کہ میرے ہوش سنبھالنے تک اس کتب خانہ کا بڑا حصہ ضائع ہوگیا، مثنوی مولانائے روم مکتوبہ ۱۰۹۰ھ/ ۱۶۷۹ء جلد پنجم بطرز جدید، سرخسی کی محیط جلد ثانی مکتوبہ ۹۰۹ھ/۱۵۰۳ء حدیث کی کتاب المخازن المعروف جلد ثانی بطرز جدید، کتاب الخلاصة فی الفتاوی مولفہ طاہر بن احمد بن عبدالرشید، مجمع البحرین وغیرہ چند کتابیں اس کتب خانہ کی قابل ذکر ہیں، افسوس ہے کہ یہ بقیہ کتابیں بھی آہستہ آہستہ گجرات سے باہر جا رہی ہیں۔

حکیم سید روح اللہ بھروچی کا کتب خانہ

حکیم سید روح اللہ بھروچ کے باشندے تھے، ان کے والد کا نام سید صبغۃ اللہ شطاری ہے، حاذق حکیم اور نامور عالم تھے، اکبر، جہاں گیر اور شاہجہاں تینوں شہنشاہوں کا زمانہ دیکھا، اکبر کے حکم سے ۹۹۷ھ میں فوائد الانسان کے نام ایک طبی کتاب تصنیف کی ہے، اس میں ادویہ کے نام، ان کے خواص، مفردات و مرکبات وغیرہ فارسی میں منظوم ہیں، جہاں گیر اور نور جہاں کے معالج تھے، شاہجہاں نے بھی بڑی قدردانی کی، ان کا ایک کتب خانہ تھا، جو برباد ہوگیا، البتہ ان کے وارثوں کے پاس اس کی تھوڑی سی کتابیں تھیں۔

مولانا اسحاق کا کتب خانہ

مولانا اسحاق بن عبدالوہاب متوفی ۱۰۷۲ھ ایک کامل بزرگ تھے، مولانا عبدالغنی کے مشہور تلامذہ میں تھے، خود مولانا عبدالغنی احمد آباد کے قابل احترام بزرگ علامہ شاہ وجیہ الدین علوی کے شاگرد تھے، مولانا اسحاق نے ۱۰۴۷ھ میں حکم تحریم شرب الدخان (تنبا کونوشی کی حرمت میں) کے نام سے ایک رسالہ لکھا تھا، آپ کے مدرسہ کی تباہی کے ساتھ آپ کا کتب خانہ بھی برباد ہوگیا، دست برد زمانہ سے کچھ کتابیں اب تک رہ گئی ہیں۔

خاندان عیدروس کا کتب خانہ

سورت کے شرفاء میں ایک مشہور خاندان عیدروس صاحب کا ہے، سلطان محمود اعظم کے عہد میں یہ خاندان احمد آباد میں آیا، سب سے پہلے شیخ عیدروس آئے، اس کے بعد ان کا خاندان آیا اور اس نے یہاں مستقل سکونت اختیار کرلی، ان کے پوتے ۹۷۵ھ/ ۱۵۶۷ء میں سورت آئے، جو غالبًا بڑے فیاض اور دریادل تھے، یہ خاندان ہمیشہ سے اہل علم رہا اور تصنیف وتالیف کرنا اس کا مستقل پیشہ تھا، ایک بڑا کتب خانہ بھی تھا، جوارثًا بعد ارث اس خاندان میں چلا آرہا تھا، ۱۹۳۲ء میں راقم الحروف (مولانا ابوظفر ندوی رحمۃ اللہ علیہ) نے اس کتب خانہ کو دیکھا تھا، اس وقت بھی حدیث، تصوف، ادب اور تاریخ کی کتابوں کا بہت بڑا ذخیرہ تھا۔

نوٹ: مدارس اور کتب خانوں کی یہ پوری تفصیل مولانا سید ابوظفر ندوی مرحوم کی کتاب ''گجرات کی تمدنی تاریخ'' سے لی گئی ہے۔

کتب خانہ

انہی بزرگوں کی صحبت سے آپ کو کتابوں کے جمع کرنے کا شوق پیدا ہوا، چنانچہ بڑی

کوشش سے ایک کتب خانہ قائم کیا، شہر میں جس قدر کتابیں مل سکیں وہ سب جمع کرلیں، پھر کتابوں کے اکھٹا کرنے کے لئے ایک جہاز ٹھیک کرکے مصر روانہ کیا اور اس کے ناخدا خواجہ سلامت اللہ شاطر مغربی کو ایک فہرست دی کہ اس کے مطابق کتابیں خرید کر اور اس جہاز پر لاد کر لائیں۔

یہ جہاز کتابوں کو لے کر گھوگھ بندر (کاٹھیاواڑ) پہنچا، تو بدقسمتی سے طوفان کی زد میں آگیا اور جہاز نے کروٹ لے لی، جس کی وجہ سے کتابیں ضائع ہوگئیں، ان میں سے جو بچ سکیں وہ کتب خانہ میں داخل کردی گئیں، اکبر کے فتح احمد آباد کے بعد تاریخوں میں اس بیش قیمت کتب خانہ کا کوئی ذکر نہیں ملتا۔

یہ جو کچھ تفصیلات گذری ہے وہ اس قافلہ کا ذکر ہے جن کے نشان قدم تو مٹ چکے ہیں؛ لیکن ان کے آثار اور نقوشِ علمی ابھی بھی باقی ہیں، وہ آثار بھی اتنے کم نہیں کہ سمتوں اور منزلوں کا پتہ بھی نہ دے۔

اس قافلہ کے لوگوں کے مختصر حالات اور علمی ودینی خدمات اس لئے ذکر کی گئی تا کہ قدیم کتابوں اور مخطوطات کو بچانے کی امنگ اور آرزو پیدا ہو اور ہمارا ابھی ان اسلاف سے علمی، عملی اور دینی رشتہ قائم ہو اور صرف ''پدرم سلطان بود'' تک رابطہ قائم نہ رہے؛ بلکہ ان کی جو کتابیں ہیں وہ علم وحکمت کے موتی ہیں، ان موتیوں کو نسل در نسل منتقل کرنے کی کوششیں کی جائیں۔

ایک زمانہ تھا کہ گھر گھر کتب خانہ ہوا کرتا تھا، امراء کو چھوڑ دیجئے، غرباء تک جیسے بھی بن پڑتا تھا، کچھ نسخے ضرور کسی طاق میں رکھتے تھے اور جیسے جیسے وقت گذرتا ہے تو وہ قدموں کے نشان چھوڑ جاتا ہے، یہ مطبوع ومخطوط کتابیں بھی گذرے وقتوں کے نشانات وشہادات

ہیں، اب ضروری ہے کہ ہم بھی ان اسلاف سے اپنا علمی، عملی اور دینی رابطہ جوڑیں، ان کی علمی میراث کو سینے سے لگائیں، کیوں کہ حال کا ماضی سے رابطہ مضبوط ہوگا تو اس پر مستقبل کی تعمیر ہوگی۔

بحمد اللہ تم

مراجع ومصادر(عربی)

نمبر	اسماء الکتب	اسماء المصنفین
١	اضواء علی تاریخ الحرکة العلمیة والمعاهد..	الشیخ عبداللّٰہ الکافودروی
٢	العصر العباسی الاول ،الثانی	دکتور شوقی ضیف
٣	احسن التقاسیم فی معرفة الاقالیم	شمس الدین ابوعبدالله المقدسی
٤	دائرة المعارف القرن العشرین	محمد فرید وجدی
٥	البلدانیات	علامه شمس الدین سخاوی
٦	رواد علم الجغرافیة في الحضارة العربیة والاسلامیه	دکتورعلی بن عبدالله الدفاع
٧	مقدمة ابن خلدون	عبدالرحمن بن محمد بن خلدون
٨	البویهیون والخلافة العباسیة	دکتورابراهیم سلیمان الکروی
٩	حسن المحاضرة فی تاریخ مصر و القاهرة	جلال الدین سیوطی
١٠	العقد الثمین فی تاریخ الهند والسند	قاضی اطهر مبارك فوری
١١	نزهة الخواطروبهجة المسامع والنواظر	السید عبدالحیی بن فخر الدین الحسنی
١٢	معجم البلدان	شهاب الدین ابوعبدالله یاقوت الحموی
١٣	فتوح البلدان	علامه بلاذری
١٤	مروج الذهب ومعادن الجوهر	ابوالحسن علی بن حسین المسعودی
١٥	ایام العرب فی الاسلام	محمدابوالفضل ابراهیم /علی محمد
١٦	المنتظم فی تاریخ الملوك والأمم	ابوالفرج عبدالرحمن بن علی الجوزی
١٧	سبحة المرجان فی اٰثار هندوستان	سید غلام علی آزاد البلکرامی
١٨	کیف دخل العرب التاریخ	ابوالحسن علی الحسنی الندوی
١٩	المسالك والممالك	عبداللّٰه بن عبدالله المعروف بابن خرداذبه
٢٠	العلاقة السیاسیة والثقافیة بین الهند والخلافة العباسیة	دکتور یوسف نجرامی
٢١	معجم المؤلفین	عمررضا کحاله
٢٢	الضوء اللامع	علامه شمس الدین سخاوی

٢٣	شذرات الذهب	ابن العماد حنبلی
٢٤	الهند فی العهد الاسلامی	السيد عبدالحی الحسنی
٢٥	ظفرالواله بمظفر وآله	عبدالله محمد الغ خانی معروف به حاجی دبیر

(اردو)

۲۶	علماءِ گجرات کی خدماتِ حدیث	مولانا عمران عبداللہ گجراتی
۲۷	تاریخ گجرات	شاہ ابوتراب ولی
۲۸	تاریخ طبری (مترجم) ابراہیم ندوی	ابوجعفر ابن جریر طبری
۲۹	تاریخ فرشتہ	محمد قاسم فرشتہ
۳۰	تاریخ دعوت وعزیمت	حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ
۳۱	جرنل: ۳، ۵	حضرت پیر محمد شاہ لائبریری
۳۲	ہندوستان عربوں کی نظر میں (اول، دوم)	ضیاءالدین اصلاحی
۳۳	مسلمانان پاکستان و بھارت	سید ہاشمی فرید آبادی
۳۴	رودِ کوثر، آب کوثر	شیخ محمد اکرام
۳۵	گجرات کی تمدنی تاریخ	مولانا سید ابوظفر ندوی
۳۶	ہندوستان کے سلاطین علماء اور مشائخ کے...	سید صباح الدین عبدالرحمٰن ایم، اے،
۳۷	ہندوستان کے عہد وسطی کی ایک ایک جھلک	سید صباح الدین عبدالرحمٰن ایم، اے،
۳۸	سفر نامہ ابن بطوطہ (اردو)	(مترجم) رئیس احمد جعفری
۳۹	مکمل تاریخ ہند	مفتی شوکت علی فہمی
۴۰	ہندوستان کے عہد ماضی میں مسلمان.......	سید صباح الدین ندوی
۴۱	عرب وہند کے تعلقات	مولانا سید سلیمان ندوی
۴۲	تاریخ ہند مسلم عہد حکومت سے قیام جمہوریت تک	مفتی محمد پالن پوری
۴۳	عربوں کی جہازرانی	سید سلیمان ندوی
۴۴	افکار ابن خلدون	مولانا محمد حنیف ندوی
۴۵	اسلامی علوم وفنون ہندوستان میں	مولانا سید عبدالحی ندوی/مترجم ابوالعرفان ندوی

۴٦	یادایام	مولانا سید عبدالحی ندوی
۴۸	ہندوستان کے بزم رفتہ کی سچی کہانیاں	سید صباح الدین عبدالرحمٰن
۴۹	صوبائی خودمختاری کی ابتداء	بشیشور پرشاد
۵۰	آئینۂ گجرات	مولوی رضی الحق صاحب عباسی احمدآبادی
۵۱	مرآۃ سکندری	مترجم: پروفیسر مرحوم مرتاض حسین قریشی
۵۲	برصغیر میں اسلام کے اولین نقوش	محمد اسحاق بھٹی
۵۳	تاریخ اولیائے گجرات	مترجم: مولوی سید ابوظفر ندوی
۵۴	دکن کے بہمنی سلاطین	ہارون خان شیروانی
۵۵	ہندوستانی کتبوں کا مطالعہ	ڈی، سی، سرکار، مترجم: ملیحہ سمیع الزماں
۵٦	ہندوستان: تاریخ، تہذیب، تمدن	ولڈیورانٹ، مترجم طیب رشید
۵۷	تاریخ ہند پر نئی روشنی	خورشید احمد فاروق
۵۸	برصغیر ہند میں اشاعتِ اسلام کی تاریخ	مفتی محمد مشتاق تجاروی
۵۹	ہندوستانی عہد وسطی پر مسلم ثقافتی اثرات	ڈاکٹر رضی احمد کمال
٦۰	عہد مامون کی طبی وفلسفیانہ کتب کے........	عشرت اللہ خان
٦۱	تاریخ جہانگیر	بنی پرشاد، مترجم رحمت علی الہاشمی
٦۲	عربی ادبیات میں پاک وہند کا حصہ	ڈاکٹر زبید احمد-شاہد حسین رزاقی
٦۳	سخنوران گجرات	سید ظہیرالدین مدنی
٦۴	عرب وہند عہد رسالت میں	قاضی اطہر مبارک پوری
٦۵	تاریخ تمدن ہند	محمد مجیب
٦٦	مقالات سلیمانی	علامہ سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ
٦۷	اردو زبان وادب پر عربی کے اثرات	ڈاکٹر محمد عبدالوحید
٦۸	حقیقۃ السورت	رضي الدین احمد بخشش عرف بخشومیاں
۷۰	البیرونی کا ہندوستان	قیام الدین احمد
۷۱	تاریخ سندھ	مولانا سید ابوظفر ندوی

نمبر	کتاب	مصنف
۷۲	علامہ قطب الدین نہروالی: حالات وخدمات	حضرت مولانا عبداللہ صاحب کاپودروی
۷۳	مشائخ احمد آباد: اول ودوم	حضرت مولانا یوسف موتالا صاحب
۷۴	گجرات کے علمائے حدیث وتفسیر	محترم پروفیسر محبوب حسین عباسی صاحب
۷۵	النورالسافر	محی الدین عبدالقادر حضرمی
۷۶	تذکرہ شیخ محمد بن طاہر پٹنی	شیخ عبدالوہاب
۷۷	گجرات کے مشاہیر علماء	پروفیسر زبیر قریشی
۷۸	فقہائے گجرات اوران کی فقہی خدمات	مولانا عبدالقیوم راجکوٹی
۷۹	اذکار ابرار ترجمہ گلزار ابرار	محمد غوثی شطاری کاندھلوی
۸۰	توزک جہاں گیری	اقبال حسین صاحب
۸۱	مومن قوم اپنی تاریخ کے آئینہ میں (گجراتی)	مفتی محمد ڈینڈ رولوی
۸۲	قبائل عرب (گجراتی)	حاجی اسعد البقیلی صاحب
۸۳	اکابرین گجرات (گجراتی)	مولانا عبدالحی کفلیتوی
۸۴	محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ کا ہندوستان مع	قاضی اطہر مبارکپوری
۸۵	تذکرۂ مفسرین ہند	محمد عارف اعظمی عمری
۸۶	شیخ عبدالحق محدث دہلوی	پروفیسر خلیق احمد نظامی
۸۷	ہندوستانی مفسرین اوران کی عربی تفسیریں	-------
۸۸	ہندوستان کی قدیم اسلامی درس گاہیں	مولانا ابوالحسنات ندوی
۸۹	محمد بن قاسم ہندوستان میں	مولانا عبدالسبحان اعظمی
۹۰	جامع تاریخ ہند	محمد حبیب خلیق احمد نظامی
۹۱	اسلامی فکر اور تہذیب کا اثر ہندوستان پر	پروفیسر خلیق احمد نظامی
۹۲	عہد وسطی کا ہندوستان	پروفیسر ستیش چندر
۹۳	آریہ سماج کی تاریخ	لالہ لاجپت رائی/کشور سلطان

==================